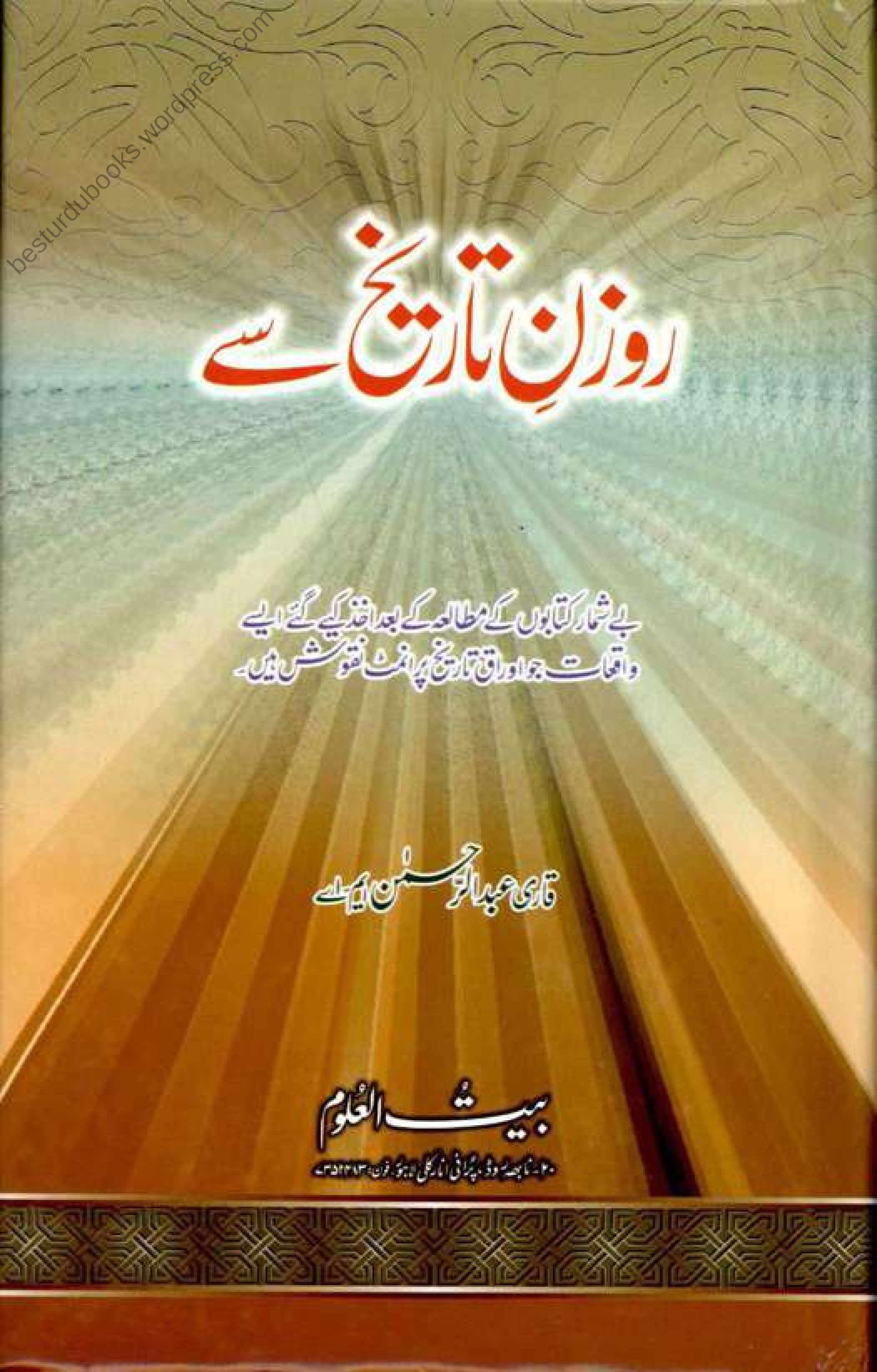

روزنِ تاریخ سے

بے شمار کتابوں کے مطالعہ کے بعد اخذ کیے گئے ایسے
واقعات جو اوراقِ تاریخ پر انمٹ نقوش ہیں۔

قاری عبدالرحمٰن ایم اے

بیت العلوم
۲۰۔ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۴۸۳

روزنِ تاریخ سے

روزنِ تاریخ سے

بے شمار کتابوں کے مطالعہ کے بعد اخذ کیے گئے ایسے
واقعات جو اوراق تاریخ پر انمٹ نقوش ہیں۔

قاری عبدالرحمٰن ایم اے

بیت العلوم
۲۰- نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون [illegible]

کتاب روزن تاریخ سے

مرتب قاری عبدالحسن ملک

باہتمام محمد ناظم اشرف

ناشر بیت العلوم ۔ ۲۰ نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور
فون: ۷۳۵۲۲۸۳

﴿ ملنے کے پتے ﴾

بیت العلوم = ۲۰ نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور
ادارہ اسلامیات = ۱۹۰ انارکلی، لاہور
ادارہ اسلامیات = موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
دارالاشاعت = اردو بازار کراچی نمبر ۱
بیت القرآن = اردو بازار کراچی نمبر ۱
بیت الکتب = گلشن اقبال، کراچی
ادارۃ المعارف ـ ڈاکخانہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دارالعلوم = جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ القرآن = بنوری ٹاؤن، کراچی
مکتبہ سید احمد شہید = الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

روزنِ تاریخ سے

تقدیم 11
پیش گفتار 15
بہ درگاہ جناب رسالتمآب علیہ افضل الصلوٰت والتحیات 18
نیت کا پھل 19
تحفۂ دار پر 21
بلند مقام 24
حفاظت 27
عدلیہ کی آزادی 30
جانثاری 37
رائے کی قربانی 39
میں عمر کے رب کیلئے لڑتا ہوں 41
ذاتی شرافت 43
ملک الموت کی آواز 45
توبہ کا دروازہ 46
تنخواہ 48
قصاص 51
بلند امتیاز 54
شہید زندہ ہیں 55
تھپڑ کی سزا 60
سمندر میں قبر 61
بدنصیب بوڑھا 63
زبان کٹ گئی 65
لاش کو زمین نگل گئی 67
انسانیت کا منشور آزادی 70
خوف آخرت 76
امر بالمعروف 83
عدل میں کوتاہی کا افسوس 87
قبر کی یاد 91
مقبول دعائیں 95
صحبت کے اثرات 97
عدالت کا محاسبہ 99
ابو اسحاق شیرازی اور نظام الملک 101
دو سبق 104
دنیا کی حقیقت 105

- اللہ کا بندہ 106
- عدالت کی سزا 109
- دیناروں کے دس لیتے 111
- عجیب دعوت 112
- عدل و انصاف 113
- سو دینار 115
- درویش بادشاہ 116
- تواضع کی انتہاء 118
- احساسِ فرض 119
- بے مثال جرأت 121
- درویش بادشاہ 124
- شوقِ شہادت 126
- بتوں کی بے بسی 128
- شہادت کی تمنا 132
- حاضر دماغی 137
- راہِ خدا میں انوکھی ہجرت 139
- جنت میں داخلہ کی خواہش 142
- سیدنا عمرؓ کی کفر میں زمردی 144
- اللہ کی رضا کے لیے اسلام 146
- جنت کی خوشبو 148
- مشرکین مکہ سے آخری جنگ 150
- عقیدت 154
- حیرہ کی فتح 156
- زاہدانہ زندگی 157
- جہاں بانی کا ایک بہترین اصول 164
- کردار 168
- ایک مستجاب الدعوات بزرگ 170
- ایک عجیب واقعہ 172
- توتق خان کا قبول اسلام 174
- غازی انور پاشا کا خط اپنی اہلیہ کے نام 179
- وسعتِ ظرف اور تحمل و برداشت 185
- سیدنا خنساء اور جنگ قادسیہ 190
- نعمت کی ناشکری کرنا 193
- گورنر ایک مزدور کی حیثیت سے 196
- اسلام میں عدل کی اہمیت 198
- اخلاص اور للہیت 205
- شریعت کا احترام 211
- سوز فکرِ آخرت 217
- تین کلمات 221
- کھجوروں کی چھالیں پہننے والے لوگ 223
- دو قسم کی آوازیں 225
- غیرت کی جو بے تماشا نہیں ہے 230

- انصاف کی فتح 235
- نرم بستر اور اس کی سزا 238
- اور یورش شروع ہوگئی 241
- حقوق کی ادائیگی 246
- حجیت حدیث پر بہترین دلیل 250
- ایک لطیف شکایت 253
- ایک بزرگ کا عجیب واقعہ 255
- مسلمان اپنا مقصد ہار گئے لیکن اسلام اپنا مقصد جیت گیا 259
- خالد میسرہ کے دونوں لشکروں میں سے پہلے ایک سے جنگ کرو 262
- ترقی کا راز 264
- عزت کپڑوں میں نہیں ہے 266
- سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی وصیت 269
- ربیعۃ الرائے کی تعلیم و تربیت 273
- قول و عہد کی پابندی 277
- بار خلافت نے زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا 281
- عربوں کی جود وسخا 284
- نقل مطابق اصل 289
- مسلمان کتنے زیادہ اور بازنطینی کتنے کم 291
- بادشاہ سر سے پاؤں تک ہل گیا 295
- عہد کو پورا کرنے کی ایک عجیب وغریب مثال 297
- اللہ سے معاملہ درست کرنے کا نتیجہ 301
- اب خوران کے گھر میں خوشی ناچنے لگی 304
- اسے کچھ نہ کہو، جانے دو 307
- تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے 309
- دس درہم کی برکات 311
- یہ بت فروش ہے 314
- حرام چیزوں سے علاج 316
- بیماریوں سے شفا کا علاج 318
- مردان کار کی ضرورت 322
- اس پل پر یا کس پل پر؟ 324
- مال کی حرص سمندر کا پانی 326
- عجیب حفاظت 330
- قرآن حکیم کے اثرات 333
- ایک بادشاہ درویشوں کے دروازہ پر 342
- دریا کا پاٹ بھی انہیں نہ بچا سکا 347

- تین قسم کے قاضی 354
- بیل کا آواز دینا 356
- سربراہِ مملکت کی ذمہ داریاں 358
- دو ہزار گھر کی قیمت، دو ہزار اچھے پڑوسی کی 360
- یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں 361
- سحری کی چند رکعتیں نفع بخش ہیں 364
- مردِ مومن کسی سے نہیں ڈرتا 366
- چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد 369
- ایک آرزو اب بھی دل میں باقی ہے 371
- تعلیم قابلِ فروخت نہیں 373
- انہیں کے ارتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی 376
- امام محمد بن سیرینؒ کا تقویٰ 379
- بشر حافیؒ کی ہمشیرہ کا تقویٰ 382
- حضرت مولانا مظفر حسین کاندہلویؒ کا تقویٰ 386
- حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کا تقویٰ 387
- حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کا تقویٰ 388
- حضرت مولانا محمد منیر نانوتویؒ کا تقویٰ 390
- حضرۃ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا تقویٰ 391
- غیرتِ دینی 397
- میں امیرالمومنین کی ضرورت جان گیا ہوں 399
- اے اللہ! میری فراست کو لوگوں کے بارہ میں زائل نہ فرمانا 401
- بے مثال اطاعت 403
- پانچ چیزوں کو پانچ جگہ پایا 405
- فاضلین دیوبند پر سو سال میں اوسط اخراجات 406
- جاہلیتِ جدیدہ 408
- قرآن حکیم کی دس سورتیں دس چیزوں سے بچاتی ہیں 411
- ایک عجیب رات 412
- گنجِ شائگاں 413
- سرورِ کائنات ﷺ کے حضور ہندو شعراء کا نذرانۂ عقیدت 419
- مرحبا سید مکی مدنی العربی //
- محمد ﷺ عربی کے احسانات 421
- محبوب اپنا کرلیا پروردگار نے //
- دنیا کو تم نے آکر پُرنور کردیا ہے //
- روشن دلم زجلوۂ روئے محمد ﷺ است 422

تقدیم

لفظ تاریخ سے عام طور پر قوموں کے وقائع کا بیان سمجھا جاتا ہے۔ (۱)

ملا علی قاری علیہ الباری فرماتے ہیں:

التاريخ: وهو الإعلام بالوقت الذى يضبط به الوفيات، والمواليد و ويعلم به مايُلحق لذلك من الحوادث والوقائع التى من افرادها الولايات، كالخلافة والتملك ونحوهُ، كالاستيلاء على البلاد واستخلاصها، والطواعين، والغلاء، والمعاملات، والأمور العصيبة والأحوال الغربية. (٢)

علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (۷۳۲-۸۰۸ھ) اپنے مقدمہ میں تاریخ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> علم تاریخ ایک معزز بلند پایہ، بہت فائدوں والا اور شریف غرض و غایت والا فن ہے۔ کیونکہ یہ ہمیں گذشتہ اقوام کے اخلاق و احوال بتاتا ہے۔ انبیاء کی سیرتوں پر آگاہ کرتا ہے اور حکومتوں اور سیاست میں سلاطین کے حالات کی خبر دیتا ہے تاکہ اگر کوئی کسی دینی یا دنیوی سلسلے میں ان میں سے کسی کے نقش قدم پر چلنا چاہے تو اسے

۱- اُردو دائرہ معارف اسلامیہ: ٦/٣٦_لفظ تاریخ

۲_ شرح شرح نخبة الفکر فی مصلحات أهل الأثر: ص ١٥٤، مطبوعہ بیروت

پورا پورا فائدہ حاصل ہو۔(۱)

تاریخ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> ''جب تمام دنیا کے حالات بدل جاتے ہیں تو گویا دنیا کی تمام مخلوق ہی بدل جاتی ہے اور تمام کائنات نئے رنگ و روپ میں آجاتی ہے اس لیے جیسے یہ ایک نئی مخلوق ہے اور اس نے نئی زندگی کا جوڑا بدلا ہے اور نئے عالم میں ہے اس لیے اس زمانہ کے لیے ایسے مؤرخوں کی ضرورت پڑتی ہے جو دنیا کے، دنیا کے گوشوں کے، دنیا کے قوموں کے اور مختلف مذاہب کے حالات قلم بند کرے جو نئی شکلوں میں رونما ہو گئے ہیں۔(۲)

مندرجہ بالا عبارات کے بعد علم تاریخ کی فضیلت اور حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ ہی وہ علم ہے جس کے ذریعے سے امم ماضیہ اور اقوام عالم کے حالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اور جو قومیں اپنے ماضی سے سبق حاصل کرتی ہیں اپنے آباؤ اجداد کے حالات کے مدنظر رکھتی ہیں نہ یہ کہ وہ اپنے مستقبل کو محفوظ کر لیتی ہیں بلکہ اپنی آنے والی نسل کو بھی خوبصورت مستقبل دے کر جاتی ہیں، اور جن قوموں کی نظر صرف اپنے حال پر ہوتی ہے، ماضی اور مستقبل کے فکر سے عاری ہوتی ہیں تو یقیناً ان کا مستقبل تاریک ہوتا ہے وہ تھوڑے ہی زمانے میں اپنے نام ونشان اور اقدار کو کھو بیٹھی ہیں اور ان کی داستان بھی نہیں ہوتی داستانوں میں۔

اس لیے تاریخ کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس فن کے ذریعے ہی سے ہم اپنے اسلاف کے حالات سے باخبر ہوتے ہیں اور اسی لیے بہت سے لوگوں نے اس فن میں نمایاں خدمات انجام دیں اور آنے والی نسلوں کے لیے بہت سے راہگزر چھوڑ کر گئے۔

بعض لوگوں نے تو مفصلاً تاریخ پر قلم اٹھایا پیدائش دنیا سے لے کر آج تک تمام

۱- مقدمہ ابن خلدون: ۱/۱٦٧ ۲- ایضاً: ۱/۲۰۳

زمانوں کا احاطہ کیا اور امم سابقہ کے عروج و زوال کی داستانوں کو حرف بہ حرف قلمبند کیا۔ اور یہ کام تقریباً تمام ہی زبانوں اور زمانوں میں کیا گیا۔

اور بعض لوگوں نے ان طویل اور ضخیم کتابوں سے سبق آموز واقعات کو قلم بند کیا یا انہوں نے ایسے واقعات لکھے جنہوں نے ان کو متاثر کیا اور ان کی زندگی اور ان کے علم و عمل پہ گہرے نقوش چھوڑے۔

ہمارے اس زمانے میں تاریخ کی اس صنف کو بہت پزیرائی حاصل ہوئی اور چند ہی سالوں میں کئی قلم کاروں نے اس پر قلم اٹھایا اور قرآن و حدیث، سیرت، سوانح، تاریخ اور دوسرے فنون کی بیسیوں کتابوں کے مطالعہ اور ہزاروں ورق گردانی کے بعد بہت سے واقعات کو قلمبند کیا جس سے مستقل کتب معارض وجود میں آ گئیں جن میں سے بعض کتب کو اہل علم و دانش کے طبقہ میں بہت پزیرائی حاصل ہوئی جن میں سے درج ذیل کتب کو بطور خاص ذکر کیا جا سکتا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ	(حکیم محمود احمد ظفر)
تراشے	(مولانا محمد تقی عثمانی)
جواہر پارے	(مولانا نعیم الدین)
کتابوں کی درسگاہ میں	(ابن الحسن عباسی)

زیر نظر کتاب ”روزن تاریخ سے“ بھی اسی قبیل سے ہے جسے جناب قاری عبدالرحمٰن صاحب نے ترتیب دیا ہے، قاری عبدالرحمٰن صاحب تصنیف و تالیف کے میدان میں اگرچہ نو وارد ہیں مگر اس سے قبل وہ انتہائی علمی کتاب ”فقہاء سبع مدینہ“ لکھ کر اہل علم سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں اور جس تھوڑے سے عرصہ میں اس کتاب نے اپنا مقام بنایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور جو یقیناً حضرت قاری صاحب کے علمی تعمق و وسعت مطالعہ اور خلوص و محبت پر دلالت ہے۔ اسی طرح قاری صاحب نے بیسیوں کتب کے مطالعہ اور ہزاروں ورق گردانی کے بعد اس کتاب کو ترتیب دیا ہے جس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ تو اہل نظر ہی کریں گے، بندہ کی دانست میں یہ تالیف خوبصورت

اخلاقی پھولوں سے تیار کیا ہوا گلدستہ یا اصلاحی موتیوں سے گوندھا ہوا قیمتی ہار ہے۔ جس کی دینی ذوق رکھنے والوں کی مجلس میں ان شاء اللہ قدر دانی کی جائے گی۔

اور یہ کتاب بہت سی خصوصیات کی حامل ہے جن میں سے ایک خصوصیت اس کے ہر واقعہ اور ہر لفظ کا مدلل ہونا ہے کہ قاری صاحب نے کوئی واقعہ بھی بلا حوالہ نقل نہیں کیا۔

اور دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس میں اکثر و بیشتر واقعات ان جبال علم و عمل ہستیوں کے ہیں جو ہمارے تمام علوم کی سند ہیں اور جو ہستیاں ہمارے خیالات و نظریات کا محور ہیں، جو ہمارا مسلک و مشرب ہیں اور جو اپنے وقت کے رازی، تفتازانی اور غزالی تھے فرق صرف تقدم و تأخر زمانی کا ہے میری مراد علماء دیوبند ہیں۔ قاری صاحب نے اکثر واقعات علماء دیوبند ہی کے نقل کیے ہیں جن کی ضرورت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی تا کہ آنے والی نسل اپنے اسلاف کی زندگی سے واقف ہو سکے۔ اور اپنے آپ کو اس نہج پہ تیار کر سکے اور ایک بار پھر امت کی ہدایت اور سیادت کا فریضہ سنبھال سکے۔ جس پر قاری صاحب ہماری طرف سے شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بندہ دعا گو ہے کہ پرودگار عالم اپنے فضل و کرم سے مؤلف محترم کی اس محنت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا کرے اور عام مسلمانوں کے درمیان قبول عام کی دولت سے نوازے اور قاری صاحب کے فیض کو عام اور تام فرمائے۔ آمین

می توانی کہ دھی اشک مرا حسنِ قبول
اے کہ در ساختہ ای قطرہٗ بارانی را

حافظ زاھد علی
خادمِ تدریس جامعہ اشرفیہ، لاہور
لیکچرار، شعبہ عربی، گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

……※……

پیش گفتار

اس زمانہ میں انسان کا اپنے رب سے تعلق رسمی سا رہ گیا ہے۔ دنیوی ترقی حاصل کرنا، اپنے بچوں کی خواہشات پوری کرنا، دولت کے انبار اکٹھے کرنا اور دنیا میں اپنے کو عزت اور سربلندی کے مقام پر دیکھنا، انسان کو اس قدر مرغوب اور محبوب ہو گیا ہے کہ اس کا سارا وقت اور توجہ انہی چیزوں پر صرف ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اپنے رب کے لیے اس کے پاس جو چیز بچتی ہے وہ صرف رسمیات ہیں۔ وہ اگر عبادت بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی عبادت کو بے روح کر کے اس کو ایک رسمی ضمیمہ کے طور پر اپنی زندگی میں داخل کر لیتا ہے، اور ان رسوم کی وقتی طور پر تعمیل کر کے اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر دیا۔

یہی حال بعثت نبویؐ سے قبل دوسری قوموں کا تھا۔ قرآن حکیم جس زمانہ میں نازل ہوا اس زمانہ میں ساری دنیا میں کوئی نہ کوئی مذہب رائج تھا اور کوئی قوم ایسی نہ تھی جو مذہب کی قائل نہ ہو، لیکن ہر ایک نے خود ساختہ طور پر کچھ چیزوں کو مذہب اور خدا پرستی کا درجہ دے رکھا تھا۔ مذہب کو انہوں نے ایسی شکل دے دی تھی جو ان کی دنیا پرستانہ مصروفیات کے ساتھ جمع ہو سکے جیسا کہ ہم نے آج کل اپنی زندگی کو بنا رکھا ہے کہ جتنا اسلام ہماری خواہشات کا ساتھ دے سکتا ہے اتنا اسلام اپنا کر باقی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔

قرآن حکیم نے ان دنیا پرستانہ مذہبی رسومات کے بارہ میں اعلان کر دیا کہ ان میں کوئی چیز بھی وہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے مطلوب ہو۔ اللہ تعالیٰ کو اصلاً جو شی مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بندے اپنے خالق کو ''اکبر'' مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو ''اصغر'' بنا لیں، اور یہ درحقیقت ایک قلبی کیفیت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے

اپنے بندوں کے دل کو دیکھتا ہے۔ دل کا جھکاؤ، دل کا خوف اور دل کی فروتنی ہی وہ چیز ہے جو کوئی بندہ اپنے رب کو پیش کرتا ہے۔ دل کی یہ کیفیات ذہن کو ژولیدہ نہیں ہونے دیتیں، دماغ کو زنگ نہیں لگنے دیتیں، فکر کو پست، طبیعت کو کاہل، نگاہ کو کوتاہ، روح کو مردہ اور دل کو تاریک نہیں ہونے دیتیں

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

لیکن انسان کے دل میں جو کیفیت ہو گی۔ وہ ضرور اس کے جسم اور اس کی خارجی سرگرمیوں میں نمایاں اور ظاہر ہو گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو ”اصغر“ بنانا اگرچہ ایک قلبی کیفیت ہے لیکن اگر یہ قلبی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کے اعضاء و جوارح اور اس کی حرکات و اعمال سے بھی لازماً اس کا اظہار ہو گا۔

حقیقی خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو پورے معنوں میں خالق، مالک، رب اور محاسب تسلیم کرے۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور اپنے دل و دماغ اور ذہن و فکر میں اس کی بڑائی کے احساس کو جگہ دے۔ اس کی طاقت و قوت کے خوف سے کانپتا رہے اور پھر اس کا ہاتھ، اس کا پاؤں، اس کی آنکھ، اس کی زبان اور اس کے تمام اعضاء و جوارح اسی دائرہ کے اندر اپنے وظائف ادا کریں، لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہو گا جب انسان اپنے دل میں عجز اور اپنے رب کی کبریائی کا جذبہ پیدا کرے۔

یہ کتاب کسی ایک موضوع پر مستقل کتاب نہیں بلکہ اپنی علمی زندگی کے آغاز سے لے کر اب تک مختلف کتابوں کے مطالعہ کے دوران جو واقعات دل کو اچھے لگے اور جو باتیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتریں، ان کو کتاب کی شکل میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض واقعات کو میں نے اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اور کچھ واقعات ایسے ہیں جو مؤلف کے الفاظ ہی میں نقل کر دیئے گئے ہیں کیونکہ وہ الفاظ کتر و بیونت کے متحمل نہیں تھے، لہٰذا بغیر کسی حک و اضافہ کے انہی الفاظ میں ان کو نقل کر دیا گیا ہے۔

ابتداء میں جب ان واقعات کو سینۂ قرطاس پر نقل کرنے کا میں نے ارادہ کیا تو اس کتاب کا حوالہ درج کرنے سے ذہول ہو گیا جس سے میں نے وہ واقعہ نقل کیا، لہٰذا

ان تمام احباب سے معذرت خواہ ہوں جن کی کتابوں سے میں نے وہ واقعات وحوادث نقل کیے لیکن ان کتابوں کا حوالہ نہ دے سکا۔ بعد میں احساس ہوا کہ کتاب کا حوالہ بھی نقل کرنا چاہیے تھے تھا، چنانچہ اس احساس کو عملی جامہ اس طرح پہنایا گیا کہ واقعہ کے آخر میں کتاب کا حوالہ بھی دے دیا گیا۔

مجھے علمی بے بضاعتی کا پورا پورا احساس ہے اور میں اس بات کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں قلم وقرطاس کا ماہر نہیں ہوں اور نہ ہی کہنہ مشق ہوں اور شگفتہ قلم۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے مختلف واقعات کو پڑھ کر قاری کے دل میں سوز وگداز کی وہ کیفیت جو اس کے رب کو مطلوب ہے ضرور پیدا ہوگی اور آخرت کی طرف دلی جھکاؤ اور رغبت بھی پیدا ہوگی۔

عبدالرحمٰن قاری ایم۔ اے
مورخہ ۳۰ اپریل ۲۰۰۵ء

……

بہ درگاہ جناب رسالتمآب علیہ افضل الصلوٰت والتحیات

حکیم محمود احمد ظفر۔ سیالکوٹ (پاکستان)

وہ پیش لفظ کتاب وجودِ امکاں ہے
فسانۂ دوسرا میں وہ زیب عنوان ہے
اسی کے نطق کو حاصل ہے رتبۂ الہام
اسی کی ذات پر دارو مدار ایماں ہے
وہ اس کا نام، کہ ہے ضامن سکونِ نظر
وہ اس کا ذکر، کہ سرمایۂ دل و جاں ہے
یہ کم ہے عظمت بشری کہ دیدۂ افلاک
اسی کے حسنِ تبسم کی سمت نگراں ہے
محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم، آبروئے کون و مکاں
اسی کے نور سے روشن جہانِ نگراں ہے
حیاتِ دائمی و سرمدی پیام اس کا
سعادت ابدی اس کے زیرِ فرماں ہے
وہ بوریائے فقیری پہ بیٹھنے والا
بایں شکوہ کہ روح الامین درباں ہے
جلال اس کا محیط ازل ہے تا بہ ابد
جمال اس کا ورائے حدودِ عرفاں ہے
سکھائی جنبش لب کو ادائے حق گوئی
یہ اس کا خاص کرم ہے، یہ اس کا احساں ہے
مکاشفاتِ خرد اس کے راستے کا غبار
فروغ نور تجلی اسی کا فیضاں ہے
کلید فتح و نوید ظفر دعا اس کی
غموں کی دھوپ میں وہ سایۂ گلستاں ہے
جو سوچیے تو وہ لوح وقلم کا مالک ہے
جو دیکھیے تو بظاہر وہ ایک انساں ہے
قلم کو تاب کہاں اس کی منقبت لکھے
زبانِ شعر ہے درماندہ عقل حیراں ہے

ظفرؔ بہ فیض ثنا خوانئ شہِ بطحا
دل ودماغ کا ہر گوشہ برق ساماں ہے

……

نیت کا پھل

ویسے تو دینی لحاظ سے ہر عمل کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ”انما الاعمال بالنیات.“ لیکن اس دنیا میں سربراہانِ مملکت کی نیتوں پر ان کی مملکتوں کی خوش حالی اور بدحالی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں عربی اور فارسی کی کتابوں میں بہت سے واقعات منقول ہیں، لیکن مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر نے اپنی تزک جہانگیری ص ۲۵۳ میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے جو قارئین کی ضیافت طبع کے لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ”ایک سلطان گرمی کے موسم میں ایک باغ کے دروازہ پر پہنچا۔ وہاں ایک بوڑھا باغبان کھڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر سلطان نے پوچھا: ”کیا اس باغ میں انار ہیں۔“ باغبان نے کہا: ”ضرور ہیں۔“ سلطان نے کہا: ”ایک پیالہ انار کا رس لاؤ۔“ باغبان کی ایک لڑکی صورت کے جمال اور سیرت کے حسن سے آراستہ تھی۔ باغبان نے اس سے انار کا رس لانے کو کہا۔ وہ گئی اور ایک پیالہ بھر کر انار کا رس لے آئی۔ پیالہ پر انار کی کچھ پتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سلطان نے اس کے ہاتھ سے پیالہ لیا اور پورا پی گیا۔ پی کر اس نے لڑکی سے پوچھا: ”پیالہ میں رس کے اوپر تم نے پتیاں کس لیے رکھ دیں تھیں؟“ لڑکی زبان کی فصیح اور اپنی اداؤں میں بڑی ملیح تھی۔ اس نے عرض کی: ”اس گرمی میں آپ پسینہ میں غرق تھے۔ اس کا ایک سانس میں پی جانا آپ کے لیے مناسب نہ تھا۔ میں نے احتیاطاً اس پر پتیاں ڈال دی تھیں کہ آپ آہستہ آہستہ اس کو نوش جان فرمائیں۔ سلطان کو یہ حسن ادا بہت پسند آئی اور اس کے جی میں آیا کہ اس لڑکی کو اپنے محل میں داخل کرلیں۔ اس

کے بعد سلطان نے اس باغبان سے پوچھا کہ تم کو ہر سال اس باغ سے کیا حاصل ہوتا ہے؟" اس نے جواب دیا: "تین سو دینار۔" (جو کہ اس زمانہ میں ایک بہت بڑی رقم تھی) سلطان نے پوچھا: "دیوان کو کیا دیتے ہو؟" باغبان نے کہا: "میرا بادشاہ درخت سے کچھ وصول نہیں کرتا ہے بلکہ کھیتی سے عشر لیتا ہے۔"

اب سلطان کے دل میں یہ خیال گذرا کہ میری سلطنت میں بہت سے باغ اور درخت ہیں۔ اگر باغ سے بھی عشر لیا جائے تو کافی رقم اکٹھی ہو سکتی ہے اور رعایا کو بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا، اس لیے میں وزیر مالیات کو حکم دوں گا کہ باغات کے محصولات سے بھی خراج لیا جائے۔ دل میں یہ سوچ کر اس نے انار کا رس پھر پینے کے لیے مانگا۔ لڑکی رس لانے کے لیے گئی تو بہت دیر میں آئی۔ جب وہ پیالہ لائی تو سلطان نے کہا کہ پچھلی بار تم گئیں تو بہت جلد آئیں اور انار کا رس بھی بہت لائیں۔ لڑکی نے کہا کہ پچھلی بار ایک انار سے پیالہ بھر گیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے پانچ چھ انار توڑے پھر بھی رس پورا نہیں ہوا۔ یہ سن کر سلطان کو حیرت ہوئی۔ باغبان نے عرض کیا۔ محصول کی برکت بادشاہ کی نیک نیت پر منحصر ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ بادشاہ ہیں۔ آپ نے جس وقت باغ کی آمدنی مجھ سے پوچھی، اسی وقت آپ کی نیت میں تبدیلی پیدا ہوئی اور پھل سے برکت چلی گئی۔ یہ سن کر سلطان متاثر ہوا اور پھر اپنے دل سے باغ کی آمدنی کا خیال دور کر دیا۔ اس کے بعد پھر انار کا رس مانگا۔ لڑکی گئی اور جلد ہی پیالہ بھر کر انار کا رس لے آئی اور خوش خوش ہنستے ہوئے سلطان کے ہاتھ میں دے دیا۔ سلطان نے باغبان کی فراست کی داد دی اور پھر اپنے دل کی بات بتائی اور اس کی لڑکی کا خواستگار ہوا۔" (ہندوستان میں بزم رفتہ کی سچی کہانیاں جلد ۲ ص ۱۴۹)

تختۂ دار پر

موسم گرما کا سورج آگ برساتا ہوا مکہ کی پہاڑیوں کے پیچھے شام سیاہ قبا کو لالہ کے پھول مار رہا تھا جس سے مشرقی افق پر سیاہی نمودار ہو رہی تھی۔ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے گلے صحرا کی ہریالی سے اپنا پیٹ بھر کر واپس لوٹ رہے تھے۔ دن بھر کی تھکی ماندی مخلوق رات کی پُرسکون آغوش میں پناہ لینے لگی تھی کہ اچانک مکہ کے گلی کوچوں میں منادی کی آواز بلند ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا:

> ”لوگو! کل صبح تنعیم کے وسیع و عریض میدان میں صحابی خبیبؓ کو سولی دی جائے گی۔“

منادی کے اعلان کو سن کر مکہ کے ہر گھر میں خبیبؓ کا تذکرہ ہونے لگا۔ خبیبؓ عدی کے بیٹے، مدینہ کے قبیلہ اوس کے چشم و چراغ، ایمان و خلوص اور صبر و عزیمت کے پیکر بلکہ کوہِ گراں، رسول اللہ ﷺ کے سرفروش صحابی، بنولحیان کی درخواست پر سرکار دو عالم ﷺ نے انہیں دین کی دعوت کے لیے دوسرے صحابہ کرامؓ کے ساتھ بھیجا، لیکن ایک سازش کے تحت مقام رجیع پر انہیں دھوکہ سے گرفتار کر لیا گیا اور مکہ میں حارث بن عامر بن نوفل کے لڑکوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ حارث بدر کی جنگ میں خبیبؓ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اب اس کے بیٹے انہیں خرید کر اور سولی دے کر اپنی آتش انتقام کو بجھانا چاہتے تھے۔

بدر کی جنگ کا نقصان مکہ والوں کے لیے ناقابل تلافی تھا۔ ان کے بڑے بڑے جرنیل اور اساطین ابوجہل، عتبہ اور ولید وغیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ اس نقصان کی یاد انہیں بے چین کر دیتی۔ ہر آنکھ اشکبار اور زبان نالہ و شیون پر آمادہ ہو جاتی، لہٰذا منادی کی یہ آواز سن کر ہر شخص خبیبؓ کو سولی پر تڑپتا دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گیا اور ارادہ کر لیا کہ صبح وہ اس منظر کو ضرور دیکھے گا۔

صبح سورج نے افقِ مشرق سے ابھی سر نکالا ہی تھا کہ مکہ کے لوگ تنعیم کے میدان میں اکٹھا ہونے شروع ہو گئے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان کوئی بھی پیچھے نہ رہنا چاہتا تھا۔ میدان میں نوجوانوں کی ٹولیاں رقصِ مسرت کرتی پھرتی تھیں اور عورتیں خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔

عین وقت پر خبیبؓ کو مقتل میں لایا گیا تو مجمع پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ خبیبؓ کی شان اس وقت قابلِ دید تھی۔ پیروں میں بیڑیاں، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے، چہرے پر بجائے پریشانی کے ایک قسم کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایک عجیب دل میں کھب جانے والی نورانی اور ایمانی چمک۔ وہ سر اٹھائے بڑی شان اور باوقار چال سے مقتل میں تشریف لائے۔

سولی کا پھندا ایک درخت کے ساتھ لٹکایا گیا تھا۔ خبیبؓ کی نورانی آنکھوں نے پہلے تو اس پھندے کو چوما اور پھر وہ ہجوم پر مرکوز ہو گئیں۔ سولی دینے والے سولی دینے کے لیے آگے بڑھے تو ان کا چہرہ اور چمک اٹھا۔ پھر فرمایا:

> ”ذرا ٹھہرو، مجھے دو رکعت نماز پڑھ لینے دو۔ میں جان جاں آفرین کے سپرد کرنے سے پہلے اس کے حضور میں آخری بار سجدہ ریز ہونا چاہتا ہوں۔“

اجازت دے دی گئی۔ ہاتھ کھول دیئے گئے۔ خبیبؓ نے قبلہ رو ہو کر دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر سلام پھیر کر کہا:

> ”جی تو چاہتا تھا کہ ان رکعتوں کو لمبا کروں۔ پھر خیال آیا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ موت سے ڈر گیا ہوں۔“

پھر کھڑے ہوئے۔ سولی دینے والوں نے پہلے کی طرح ان کی مشکیں کس دیں۔ یہ مردانہ وار سولی کی طرف بڑھے۔ ان کی زبان پر یہ شعر جاری تھے ؎

وذالک في ذات الالٰه وأن يشاء
یبارک علیٰ اوصال شلو ممزع
ولست ابالي حين اقتل مسلماً
علیٰ ای جنب کان للہ مصرعی

یعنی یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہو رہا ہے۔ وہ اگر چاہے تو جسم
کے پارہ پارہ میں برکت ڈال دے۔ جب میں ایک مسلمان کی
موت مر رہا ہوں تو مجھے اس بات کی کیا فکر ہے کہ میں کس پہلو پر قتل
کیا جاتا ہوں۔

سولی کا پھندا جب خبیبؓ کی گردن میں ڈال دیا گیا اور تختۂ دار پر جھولنے لگے تو دشمنوں کی آتشِ انتقام اس سے بھی نہ بجھی اور انہوں نے نیزے مار مار کر اس کا جسم چھلنی کر دیا۔

مقتل میں سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

خبیبؓ کسی گھبراہٹ اور اضطراب کے بغیر اپنے رب سے جا ملے۔ ان کا چہرہ قبلہ کی طرف تھا۔ ان کے چہرے کو قبلہ سے پھیرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ سب سے کٹ کر ایک اللہ کا ہو رہا تھا۔ ان کا رخ دوسری طرف کون پھیر سکتا تھا؟

خبیبؓ پہلے شہید تھے جنہوں نے سولی پر جان دی۔ ان کی موت ایک باوقار موت تھی۔ شہید کی موت، جو مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔ ان کی وجہ سے سولی پر چڑھنے سے پہلے دو رکعت پڑھنے کی سنت زندۂ جاوید ہو گئی۔

* * *

بلند مقام

"مجھے کون اپنی بیٹی دے گا۔"

یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی سیدنا سعدؓ کے تھے جو سیاہ رنگ، کوتاہ قامت اور کم رو تھے۔ جتنے وہ کالے اور بدصورت تھے اتنا ہی ان کا دل نور ایمان سے منور اور خوبصورت اور کردار حسن و جمال سے مزین تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں اور جو موجود نہیں ہیں، میں نے سب کو شادی کا پیغام دیا لیکن مجھے کوئی رشتہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ سرکار دو عالم ﷺ ان کی حالت پر رحم آیا۔ فرمایا:

> "عمرو بن وہبؓ کے پاس جاؤ۔ ان کے دروازے پر دستک دو اور سلام کے بعد ان سے کہو کہ اللہ کے نبی نے تمہاری بیٹی میرے ساتھ بیاہ دی ہے۔"

عمروؓ بن وہب بنو ثقیف کے فرزند تھے۔ طبیعت میں ذرا درشتی تھی۔ ان کی لڑکی نہایت حسین و جمیل اور ذہین و فطین تھی۔ سعدؓ ان کے گھر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر والوں نے دروازہ کھولا تو انہوں نے انہیں رسول اللہ ﷺ کا پیغام سنایا۔ عمروؓ اور ان کے گھر والے نہایت پریشان ہو گئے۔ بھلا ایسے بدصورت اور کالے کلوٹے سے ہم اپنی حسین و جمیل اور چندے آفتاب اور چندے ماہتاب بیٹی کیسے بیاہ دیں۔ چنانچہ انہوں نے سعدؓ کو واپس لوٹا دیا۔

لڑکی نے بھی سعدؓ کی آواز سن لی تھی۔ فوراً باہر نکل آئی اور سعدؓ کو آواز دی:

> "بندہ خدا! واپس لوٹ آؤ، اگر سرور کائنات ﷺ نے تمہارے ساتھ میری شادی کر دی ہے تو حضور ﷺ کا فرمان سر آنکھوں پر۔ میں اس چیز پر راضی ہوں جس سے خدا اور اس کا رسول راضی ہیں۔"

پھر وہ سعادت مند لڑکی اپنے باپ سے کہتی ہے کہ ''قبل اس کے کہ وحی الٰہی دنیا و آخرت میں آپ کو رسوا و ذلیل کر دے اپنی نجات کی فکر کیجیے۔''

عمرو بن وہبؓ ہانپتے کانپتے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

''تم ہی نے میرے فرستادے کو لوٹایا تھا؟''

یہ الفاظ سن کر عمروؓ بحر ندامت میں غرق ہو گئے۔ اسی ندامت بھرے لہجے میں عرض کیا:

''جی ہاں، یہ غلطی مجھ ہی سے سرزد ہوئی تھی۔ ہمیں اس شخص کی بات کا اعتبار نہ تھا۔ ہمیں معذور فرمایئے اور اللہ تعالیٰ سے ہماری مغفرت کی دعا فرمایئے۔ ہم نے لڑکی بیاہ دی۔''

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اب آپ ﷺ نے سعدؓ سے فرمایا:

''اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔''

سعدؓ اٹھے اور اپنی بیوی کے لیے تحفے تحائف خریدنے بازار کی طرف چل دیے۔ بازا پہنچے ہی تھے کہ منادی کی آواز کان میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا

﴿یاخیل اللہ ارکبی وبالجنۃ البشری﴾

''اے اللہ کے شہسوارو! جہاد کے لیے سوار ہو جاؤ اور جنت کی بشارت لو۔''

اس اعلان کا سننا تھا کہ سعدؓ کے سارے ولولے اور جذبات سرد پڑ گئے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کا جذبہ سب جذبوں پر غالب آ گیا۔ جس رقم سے نوبیاہتا بیوی کے لیے تحفے تحائف خریدنے تھے اب اس سے سامانِ حرب خریدے اور فوراً مجاہدین کی جماعت میں پہنچ گئے۔ سر پر عمامہ باندھا ہوا تھا لہٰذا کوئی انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی نہ پہچانا۔

جنگ شروع ہوئی تو میدان کارزار میں سعدؓ نے ایسے جوہر دکھائے کہ دیکھنے

والے حیران و ششدر رہ گئے۔ یہ کیسا مجاہد ہے؟ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ یہ سارے سوالات کئی لوگوں کے ذہنوں میں ابھرے۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ سعدؓ کا گھوڑا اڑ گیا۔ فوراً گھوڑے سے اترے اور آستین چڑھا کر پیدل ہی لڑنے لگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہاتھوں کی سیاہی دیکھ کر پہچان لیا، آواز دی: ''سعد!'' مگر سعدؓ وارفتگی کے عالم میں تھے۔ انہوں نے آواز نہ سنی۔ کافروں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ آخر لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔''

جنگ ختم ہوئی تو حضور ختمی مرتبت ﷺ کو پتہ چلا کہ سعدؓ نے جام شہادت نوش فرمایا ہے۔ آپ ﷺ اس کی لاش پر تشریف لے گئے اور محبت و شفقت سے ان کا سر گود میں رکھ لیا۔ سعدؓ کتنا خوش قسمت تھا جس کا سر حضور علیہ السلام کی گود میں تھا وہ تو کہہ رہا ہوگا ؎

بچہ ناز رفتہ باشد زیں جہاں نیاز مندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

سرکار دو عالم ﷺ نے اس کا گھوڑا اور اسلحہ اس کی نوبیاہتا بیوہ کے پاس بھجوا دیا اور اس کے سسرال والوں کو کہلا بھیجا:

''اللہ تعالیٰ نے سعدؓ کی شادی تمہاری لڑکی سے بہتر لڑکی سے کر دی ہے۔''

……

حفاظت

مرثدؓ بن ابی مرثد رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی تھے۔ نہایت نیکوکار اور پاکیزہ صفت، نبی اکرم ﷺ نے انہیں اس کام پر مامور فرمایا تھا کہ مکہ مکرمہ میں جو بعض مسلمان کفار کے پنجۂ ظلم و ستم میں گرفتار ہیں، ان کو کسی طریقہ سے مدینۃ الرسول میں لایا جائے۔ اس فرض کی بجا آوری کے لیے مرثدؓ رات کے اندھیرے میں چھپ کر مکہ میں داخل ہوئے۔ اس زمانہ میں مکہ آج کی طرح کا مکہ نہیں تھا۔ بلکہ بہت چھوٹا سا شہر تھا۔ مکان اور گلیاں کچی تھیں۔ مرثدؓ جونہی مکہ میں داخل ہوئے۔ شب دیجور سایہ فگن تھی، گلیاں سنسان، ہر طرف سناٹا اور یک ہو کا عالم طاری تھا۔ اکا دکا مکانات سے روشنی کی مدہم سی لو اٹھ رہی تھی۔ اکثر گھروں میں تاریکی سایہ فگن تھی۔ یہ سمٹتے گئے۔ سایہ قریب سے قریب تر آتا گیا، اور پھر ایک نسوانی آواز آئی:

”مرثد تم ہو؟ میں نے تمہیں پہچان لیا، کہو کیسے آنا ہوا؟“

”عناق؟“ مرثدؓ نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں“ عناق نے فی الفور جواب دیا۔

عناق بھی مرثدؓ کی نشاط روح تھی۔ کبھی دونوں ایک دوسرے کو اتنا چاہتے تھے کہ کسی کا بھی پل بھر کے لیے دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ عناق کے دل و دماغ پر ان سہانے دنوں اور نشاط انگیز راتوں کی یادوں کی فلم چلنے لگی۔ مرثدؓ اسلام کی قیمتی دولت سے بہرہ ور ہو کر مدینہ طیبہ چلے گئے تھے اور عناق اسی کفر کی حالت میں غلطاں و پیچاں مکہ میں زندگی کے دن گزار رہی تھی لیکن مرثدؓ کی یاد اس کے قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں اب بھی اسی طرح انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ اسی انتظار میں تھی کہ ایک روز مرثدؓ کو اس کی یاد ضرور واپس لائے گی۔ اور آج وہ مرثدؓ کو اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔

”مرثدؓ! آج تم میرے ہاں شب باشی کرو گے ناں؟“

پھر اسی وقت اس نے مرثدؓ کا ہاتھ اپنے گھر لے جانے کے لیے پکڑ لیا، مرثدؓ وہ مرثد نہیں تھا۔ وہ اب بادۂ توحید سے مست تھا، اس کا سینہ ایمان کے نور سے منور تھا۔ جاہلیت کی ساری باتوں سے اسے اب نفرت ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس نے اچھل کر اس کا ہاتھ یوں جھٹکا جیسے کوئی ناگ لپٹ گیا ہو۔

مرثدؓ نے جونہی ہاتھ جھٹکا، عناق حیران رہ گئی کیونکہ اس سے قبل کئی کئی راتیں ان کی ہم آغوشی میں گزر جاتی تھیں۔

''خیر تو ہے، تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' عناق نے حیرت زدہ لہجے میں کہا: ''تم جانتے ہو کہ یہ بازو اور ہاتھ تمہیں کتنے پسند تھے؟''

''وہ اور وقت تھا۔ عہد رفتہ کی باتیں چھوڑو، ماضی کی باتیں قصۂ پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ زمانۂ جاہلیت کی باتیں ہیں جب مجھے حلال و حرام، نیکی اور بدی، حق اور باطل اور نجاست و پاکیزگی میں تمیز نہ تھی۔ مرثدؓ نے عناق کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ''اب اللہ نے مجھ پر اپنا خاص فضل کیا ہے، مجھے نیکی کی ہدایت دی ہے، صراط مستقیم دکھائی ہے اور ایمان کے نور سے میرے دل کو منور کیا ہے۔ اب میں اللہ کے فضل و کرم سے مسلمان ہوں۔ اسلام میں زنا حرام ہے اس لیے مجھے معاف رکھو۔''

عناق مرثدؓ کے اس جواب سے سیخ پا ہو گئی۔ غصے سے اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور وہ تلملاتے ہوئے بولی: ''بڑے آئے پاک دامن اور زنا کو حرام کہنے والے۔ تم میرے ساتھ چلتے ہو یا لوگوں کو آواز دوں؟''

مرثدؓ نے کہا: ''نیک بخت! اپنا راستہ ناپو۔ میں اب پاکیزہ زندگی کو چھوڑ کر نجاست کے دھندے میں کبھی نہیں گروں گا۔ جاہلیت کی تمام باتیں میں نے اب ہمیشہ کے لیے ترک کر دی ہیں۔''

عناق ناگن کی طرح پھنکاری اور زور زور سے چیخنے لگی:

''لوگو! مرثدؓ آیا ہے تمہارے قیدیوں کو بھگانے کے لیے۔''

''اونگھتا ہوا لشکر ایک دم اس آواز سے جاگ اٹھا۔ لوگ آواز کی طرف دوڑے۔ مرثدؓ بھاگنا چاہتے تھے کہ عناق نے ان کا دامن پکڑ لیا، لیکن وہ زور سے جھٹکا

دے کر اس کی گرفت سے نکل گئے۔“

”کہاں گیا؟ کہاں گیا؟“ تاریکی میں آوازیں آنے لگیں، اور پھر مرشدؒ کی تلاش میں لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

رات کی تاریکی کی چادر نے مرشدؒ کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ مرشدؒ ایک غار میں جا چھپے۔ لوگ ہر طرف انہیں ڈھونڈتے رہے۔ آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس غار تک بھی پہنچ گئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نیک بندے کی اسی طرح حفاظت فرمائی جس طرح اپنے نبیؐ اور ابوبکرؓ کی غار ثور میں حفاظت فرمائی تھی۔ جونہی مکہ والے غار کے منہ تک پہنچے کسی پکارنے والے نے اچانک دور سے پکارا:

”وہ ادھر نہیں گیا ہے۔“

پھر مرشدؒ نے ان کے دوڑنے کی آواز سنی جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی، اور اس طرح حق تعالیٰ شانہ نے اپنے اس نیک بندے کو ظالموں کے پنجے سے بچا لیا۔

◆

عدلیہ کی آزادی

کوفہ جس کی بنیاد سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت میں رکھی تھی اور تقریباً پندرہ سو صحابہ کرامؓ کو اس میں آباد کیا تھا، ایک نہایت شاندار شہر تھا۔ یہ شہر علم و عمل کا گہوارہ بھی رہا اور عدل و انصاف کا مرکز بھی کیونکہ اس میں سیدنا علیؓ اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ جیسے فقیہ النفس حضرات لوگوں کو عدل و انصاف مہیا کرتے تھے۔

اسی کوفہ میں عدالت کا اجلاس ہو رہا تھا اور قاضی شریک بن عبداللہ مقدمات کی سماعت فرما رہے تھے۔ عدالت کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا جن کے مقدمات کی شنوائی اس عدالت میں ہونی تھی۔ عدالت کا دربان انہیں باری باری اندر بھیجتا اور وہ قاضی کے حضور اپنے مقدمات پیش کرتے۔ قاضی صاحب ان کی بات سنتے اور عدل و انصاف کے تقاضے کے مطابق ان کی شکایت کا ازالہ فرماتے۔

اسی ہجوم میں ایک بڑھیا بھی کھڑی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے فکر و تردد بھی جھلک رہا تھا اور ضعف و مشقت کے آثار بھی نمایاں تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی پریشان حال تھی۔ دوسرے طویل انتظار کی وجہ سے بھی وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ جب وہ تھک کر چور ہو گئی تو اس نے کھڑے کھڑے دربان کو بلند آواز سے اپنی طرف متوجہ کیا اور عدالت میں جلد پیش ہونے کی اس سے التجا کی۔

دربان کو اس کی حالت پر رحم آیا۔ دوسرے وہ عورت ذات بھی تھی۔ اس نے اس کو اندر بھیج دیا۔ قاضی صاحب نے اسے دیکھا اور پوچھا

"بی بی! تمہارا کیا معاملہ ہے؟"

"میں آپ کے پاس فریاد لے کر آئی ہوں کیونکہ آپ ہمارے قاضی ہیں۔" عورت نے جواب دیا

"تم پر کس نے ظلم کیا؟" قاضی صاحب نے پوچھا

"امیر موسیٰ بن عیسیٰ نے۔" عورت بولی

”کیا کہہ رہی ہو، امیر المومنین کے چچا نے تم پر ظلم کیا ہے؟“ قاضی صاحب نے پوچھا۔

”جی حضور۔“

قاضی صاحب نے کہا ”مجھے تفصیل سے بتاؤ کیا معاملہ ہے؟“

اس عورت نے معاملہ کی تفصیل کچھ یوں بیان کی:

”دریائے فرات کے کنارے میرا کھجور کا ایک باغ تھا جو مجھے ورثہ میں ملا تھا۔ میرے باپ کے انتقال کے بعد جب میرے بھائیوں نے اسے تقسیم کیا تو میں نے اپنے حصے کو دیوار بنا کر ان سے علیحدہ کرلیا، اور باغ کی حفاظت اور نگرانی کے لیے ایک ملازم رکھ لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد گورنر موسیٰ نے میرے بھائیوں کے حصہ کا باغ خرید لیا اور میرے حصہ پر اپنی حریصانہ نظریں گاڑ دیں۔ چنانچہ اس نے مجھے برملا کہہ بھی دیا کہ تم اپنا باغ میرے ہاتھوں فروخت کر دو۔ میں نے فروخت کرنے سے انکار کردیا جو اسے اچھا نہ لگا۔“

اس عورت نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:

”ایک روز گورنر چند نوجوانوں کو ساتھ لے کر باغ میں آیا اور اس دیوار کو گرا دینے کا حکم دیا جو میں نے تعمیر کی تھی۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ میں باغ فروخت کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ دیوار کے گرنے سے باغ کی حدود گڈمڈ ہو گئیں۔

یہ سارا واقعہ بیان کرکے اس پریشان حال عورت نے کہا:

”اے قاضی! میں اب تیرے پاس اپنا حق لینے آئی ہوں اور آپ کے سامنے بھی یہ اعلان کرتی ہوں کہ میں اپنا باغ گورنر کے ہاتھ ہرگز فروخت نہیں کروں گی۔“

قاضی شریک یہ سارا قصہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ جب وہ عورت بات ختم کر چکی تو قاضی نے لمحہ بھر کے لیے سر جھکایا، پھر آواز دی: غلام!

"جناب میں حاضر ہوں۔"

"مٹی کا ایک ڈھیلا لاؤ۔" قاضی نے غلام سے کہا

غلام نے ڈھیلا پیش کر دیا۔ قاضی نے اس پر اپنی مہر لگائی اور غلام کو دے کر کہا:

"گورنر موسیٰ کے ہاں جاؤ۔ انہیں یہ ڈھیلا دو اور اپنے ساتھ لے کر آؤ۔"

غلام وہ ڈھیلا لے کر گورنر کے مکان پر پہنچا اور قاضی شریک کا جاری کردہ سمن اس کے حوالے کر کے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

گورنر غصہ سے لال پیلا ہو گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں۔ غیظ و غضب سے جو ایسا پاگل ہوئے کہ کبھی مسند پر بیٹھتا اور کبھی ٹہلنے لگتا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے باڈی گارڈ افسر کو طلب کیا اور حکم دیا کہ

"فوراً قاضی شریک کے پاس جاؤ اور انہیں میری طرف سے کہو کہ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ایک عورت کا بالکل جھوٹا دعویٰ تم نے تسلیم کر لیا اور اب مجھے اس کے دوش بدوش کھڑا کرنے کے لیے عدالت میں بلا رہے ہو۔ تمہیں میرے منصب کا کچھ تو لحاظ ہونا چاہیے تھا۔"

وہ افسر قاضی شریک کے مزاج سے بخوبی واقف تھا، لہٰذا اس نے گورنر موسیٰ سے دست بستہ ہو کر التجا کی کہ

"گورنر صاحب! میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ میری جگہ کسی اور شخص کو قاضی صاحب کے پاس بھیج دیں تو بہتر ہوگا۔"

گورنر پہلے ہی غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس افسر کا جواب سن کر وہ چیخا اور کہا:

"کیا تمہیں قاضی سے ڈر لگتا ہے۔ تم فوراً اس کے پاس جاؤ اور میرا یہ پیغام دو۔"

باڈی گارڈ افسر کے لیے اب کوئی چارہ کار نہ تھا۔ مجبوراً وہ قاضی شریک کی عدالت میں حاضر ہوا اور انہیں گورنر کا پیغام پہنچایا۔

قاضی صاحب نے اسی وقت غلام کو بلا کر حکم دیا کہ اس شخص کو پکڑ کر جیل میں ڈال دو۔

''کیا آپ مجھے قید کرنے لگے ہیں؟'' اور افسر نے خوف اور حیرت کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، میں نے تمہیں قید کرنے کا حکم دیا ہے۔'' قاضی نے جواب دیا ''کیونکہ تم ایک ناجائز کام کروانے میرے پاس آئے ہو۔ تم شریعت کا حکم معطل کرنا چاہتے ہو۔''

گورنر کو جب پتہ چلا کہ قاضی نے گارڈ افسر کو جیل بھیج دیا ہے تو وہ اور زیادہ سیخ پا ہو گیا۔ اب اس نے اپنا حاجب قاضی شریک کی عدالت میں بھیجا۔ اس نے عدالت میں حاضر ہو کر قاضی صاحب سے گذارش کی کہ

''وہ گارڈ افسر تو صرف پیغام لے کر آیا تھا، لیکن آپ نے اُسے جیل بھیج دیا۔ اس بیچارے کا قصور کیا تھا؟''

قاضی شریک نے جب یہ سنا تو فوراً غلام کو آواز دے کر بلایا۔ وہ حاضر ہوا تو اسے حکم دیا کہ اس حاجب کو بھی اس کے دوست کے ساتھ قید کر دو۔''

گورنر موسیٰ نہایت بے صبری اور بے چینی سے حاجب کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سورج افق مغرب سے چھپنے کے قریب آیا تو اسے کہیں سے پتہ چلا کہ قاضی شریک نے گورنر کے حاجب کو بھی جیل بھیج دیا ہے۔ اب تو گورنر کی حالت دیدنی تھی۔ وہ زخمی سانپ کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن اسے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ آخر اس نے معززین کو جن میں قاضی شریک کے کئی دوست احباب بھی تھے، طلب کیے اور انہیں صورت حال کے بارہ میں بتایا، اور انہیں کہا کہ

''آپ حضرات قاضی صاحب کے پاس جائیں۔ انہیں میرا سلام کہیں اور انہیں بتائیں کہ آپ نے میری توہین کی ہے۔ میرے منصب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ میں عام شہری نہیں ہوں کہ عدالتوں میں حاضری دیتا پھروں۔ پھر آپ نے میرے پیغامبروں کو بھی قید کر لیا ہے۔''

قاضی صاحب کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے ان حضرات سے مخاطب ہو کر فرمایا:

پھر خدام کو آواز دی۔ چند نوجوان دوڑتے ہوئے آئے۔ قاضی صاحب نے

حکم دیا کہ ''ان سب لوگوں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دو۔''

اس حکم پر یہ لوگ حیران رہ گئے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ قاضی صاحب ہمارے ساتھ یہ سلوک کریں گے۔ یہ حضرت کہنے لگے:

''تم لوگ فتنہ ہو۔ حق کی راہ میں مزاحم اور قوانین شریعت کے نفاذ میں رکاوٹ بن رہے ہو۔ تمہاری سزا قید ہی ہو سکتی ہے۔''

''لیکن کیا تم واقعی ہمیں جیل بھیج دو گے؟'' انہوں نے پوچھا

''ہاں، تا کہ آئندہ تم کسی ظالم کا پیغام نہ لاؤ۔'' قاضی نے جواب دیا۔

گورنر موسیٰ کو جب قاضی صاحب کی اس بات کا پتہ چلا تو وہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ فوراً اپنا گھڑ سوار دستہ لے کر جیل خانے پہنچا۔ داروغہ جیل سے دروازہ کھلوایا اور ان سب قیدیوں کو رہا کر دیا جن کو قاضی شریک نے قید کیا تھا۔

یہ دن یونہی گزر گیا۔ اگلے روز صبح سویرے قاضی شریک عدالت لگائے بیٹھے تھے کہ داروغہ جیل حاضر ہوا اور گزشتہ رات کی ساری روداد قاضی صاحب کے گوش گزار کر دی اور بتایا کہ گورنر موسیٰ بن عیسیٰ نے ان سب قیدیوں کو رہا کر دیا ہے جن کو کل آپ نے جیل بھجوایا تھا۔

قاضی شریک نے جونہی یہ سنا تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ عدالت برخاست کر دی اور گھر پہنچے۔ غلام سے کہا کہ ''میرا سامان گھر پہنچا دو۔''

''کیا جناب منصب عدالت چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟'' غلام نے پوچھا

قاضی صاحب نے فرمایا:

''بخدا! ہم نے یہ منصب امیر المومنین سے مانگا نہیں تھا بلکہ انہوں نے خود زبردستی یہ کام ہمارے سپرد اس شرط پر کیا تھا کہ وہ یا ان کا کوئی اہل کار عدالت کے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ آج یہ مداخلت ہوئی ہے لہٰذا ہم یہ منصب انہیں واپس لوٹانے جا رہے ہیں۔''

گورنر موسیٰ کو یہ خبر ملی کہ قاضی صاحب نے استعفا دے دیا ہے اور وہ بغداد امیر المومنین کے پاس جا رہے ہیں۔ اب گورنر بجائے غصہ میں آنے کے سخت گھبرایا اور دل

میں کہا کہ اگر انہوں نے اس مظلوم خاتون کی داستان امیر المومنین کو سنادی تو کیا ہوگا؟"

فوراً باڈی گارڈ دستہ ساتھ لیا اور قاضی صاحب کو راستہ میں جالیا اور لگا منت سماجت کرنے۔

"ابوعبداللہ! دیکھئے نا، آپ نے میرے آدمی قید میں ڈال دیے تھے۔"

"ہاں میں نے انہیں قید و بند میں ڈال دیا تھا۔ تو نے ایک عورت پر ظلم کیا ہے، وہ تیرا پیغام لے کر آئے تھے۔" قاضی صاحب نے جواب دیا۔

"آپ واپس تشریف لے چلیں اور اپنے فرائض ادا فرمائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ آپ چاہیں گے وہی کروں گا اور وہی کچھ ہوگا۔" گورنر نے کہا

"نہیں، جب تک وہ سب لوگ جیل نہیں چلے جاتے میں یہاں سے ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔" قاضی صاحب نے کہا

"قید خانے واپس چلے جائیں؟"

"ہاں، ورنہ میں امیر المومنین مہدی کے دربار میں جاؤں گا اور جو بوجھ انہوں نے میرے کندھوں پر لاد رکھا ہے وہ ان کے سامنے اتار کر ان کی خدمت میں رکھ دوں گا۔"

اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ گورنر موسیٰ کے لیے سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اب گورنر نے ان سب لوگوں کو جیل بھجوا دیا جنہیں قاضی صاحب نے قید کیا تھا۔

اب قاضی صاحب نے اپنے خدام سے کہا کہ "گورنر کی سواری کی لگام پکڑو اور انہیں میری عدالت میں حاضر کرو۔"

حکم کی تعمیل کی گئی۔ گورنر موسیٰ عدالت میں حاضر کیے گئے۔ قاضی شریک نے مظلوم عورت کو گورنر کے ساتھ کھڑا کیا اور کہا۔

"بی بی! فریق ثانی حاضر، جو کچھ کہنا ہے بے خوف ہو کر کہو۔"

"لیکن آپ سب سے پہلے ان لوگوں کو تو رہا کریں جن کو آپ نے جیل میں بند کر رکھا ہے کیونکہ میں حاضر ہو چکا ہوں۔" گورنر موسیٰ نے کہا

"ہاں، اب انہیں رہا کر دیا جائے گا۔" قاضی نے جواب دیا

پھر قاضی نے گورنر سے پوچھا:

"اس خاتون نے جو دعویٰ دائر کیا ہے اس کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"یہ بالکل سچ کہتی ہے۔" گورنر نے جواب دیا۔

"جو مال آپ نے لیا ہے اُسے واپس کر دیجئے اور جو دیوار گرائی تھی ویسی ہی نئی دیوار فوراً بنوا دیجئے۔"

"حکم کی تعمیل ہوگی۔"

اب قاضی نے عورت سے پوچھا

"اب کوئی شکایت تو نہیں رہی؟"

"نہیں، قاضی صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی برکات سے نوازے اور آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔"

عورت تو یہ کہہ کر چلی گئی اور قاضی شریک نے اسلامی عدل وانصاف کی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کر دیا۔

……

جانثاری

بدر کا کارزار گرم تھا۔ مسلمانوں کی مٹھی بھر فوج اپنے سے تین گنا زیادہ کافروں کی فوج کا مقابلہ کر رہی تھی۔ مسلمان اسلحے سے عاری اور کافروں کے پاس جدید قسم کا اسلحہ۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ ایک دشمن کی طرف بڑھتے ہی تھے کہ دو انصاری نوجوان آ پہنچے۔ ایک سیدنا عمرو بن الجموع کے صاحبزادے معاذؓ اور دوسرے عفراء کے بیٹے معوذؓ۔

"چچا! ابوجہل کہاں ہے؟" معوذؓ نے عبدالرحمٰنؓ سے پوچھا۔

"بھتیجے! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرو گے؟" سیدنا عبدالرحمٰنؓ نے جواب دیا۔

"چچا! میں نے اپنے رب سے عہد کیا ہے کہ اس دشمن دین کو جہاں بھی دیکھوں گا یا اسے قتل کر دوں گا یا خود قتل ہو جاؤں گا۔" معاذؓ نے جواب دیا

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ ابھی معاذؓ کو جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ معوذؓ نے بھی یہی سوال ان سے پوچھ لیا

ابوجہل اس وقت لشکر کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف نوجوانوں نے نیزوں کی باڑ بنا رکھی تھی۔ سیدنا عبدالرحمٰنؓ نے اشارے سے انہیں بتایا کہ "ابوجہل وہ کھڑا ہے۔" دونوں نوجوان اس کی طرف چل دیے اور موقع کی تلاش میں رہے۔ آخر موقع مل گیا۔ وہ باز کی طرح جھپٹے۔ معوذؓ نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا۔ تلوار ابوجہل کی نصف پنڈلی کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ زخمی چیتے کی طرح چیخا۔

اس کے بیٹے عکرمہ نے جب باپ کی چیخ سنی تو فوراً اس کی مدد کے لیے پہنچا اور آتے ہی پیچھے سے معوذؓ کے دائیں شانے پر تلوار ماری۔ بازو کٹ گیا لیکن تسمہ باقی لگا رہا۔ معوذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔

معاذؓ کٹے ہوئے بازو کے ساتھ ہی لڑتے رہے لیکن ہاتھ لٹکنے کی وجہ سے لڑنے میں رکاوٹ ہو رہی تھی اور تکلیف بھی۔ ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا۔ تسمہ ٹوٹ گیا اور بازو گر پڑا۔ اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اب انہوں نے اپنی بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔

معاذؓ ایک ہاتھ کے ساتھ سیدنا عثمانؓ کی خلافت تک زندہ رہے۔ اس عرصہ میں کئی جنگوں میں حصہ لیا اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

……

رائے کی قربانی

”سب سے بڑی قربانی رائے کی قربانی ہے۔“ یہ قول جس شخص کا بھی ہے نہایت بامعنی ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ رائے کی قربانی ہی وہ واحد شئی ہے جس پر کوئی مضبوط اجتماعیت کھڑی ہوتی ہے۔ کوئی عمارت صرف اس وقت بنتی ہے جب کہ کچھ اینٹیں اپنے آپ کو زمین میں دبانے کے لیے تیار ہوں۔ اسی طرح کوئی حقیقی اجتماعیت صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ اس کے لیے تیار ہوں کہ وہ اپنی آراء کو اپنے سینہ میں چھپا لیں گے اور اختلاف رائے کے باوجود اتحاد وعمل کا ثبوت دیں گے۔ اس قربانی کے بغیر کسی انسانی اجتماعیت کا وجود میں آنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اینٹوں کی بنیاد میں دفن ہوئے بغیر عمارت کا وجود میں آنا۔

جنگ بدر کی شکست کے بعد قریش مکہ اس شکست کا انتقام لینے کے لیے نہایت بے تاب تھے۔ چنانچہ انہوں نے متفقہ طور پر دارالندوہ میں بیٹھ کر طے کیا کہ تجارتی قافلہ کے شرکاء صرف اپنا اصل سرمایہ لے لیں اور منافع کی پوری رقم جو کہ ۵۰ ہزار دینار تھی، محمد (ﷺ) کے خلاف جنگ کی تیاری میں لگا دی جائے۔ چنانچہ قریش زبردست تیاری کے بعد شوال ۳ھ کو مکہ سے نکل کر مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ ہوئے۔

اب کی دفعہ پھر پورا کفر پوری تیاری کے بعد پورے اسلام کے مقابلہ میں آیا۔

سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ سرکار دو عالم ﷺ اگرچہ مشورہ کے پابند نہیں تھے کیونکہ نبی وحی کی روشنی میں چلتا ہے، لیکن پھر بھی امت کی تعلیم کے لیے آپ ﷺ ہر معاملہ میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیتے تھے۔ اکثریت کی رائے یہ تھی کہ مدینہ طیبہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے جب کہ نوجوان طبقہ اس کا پرجوش مخالف تھا کیونکہ مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا ان کے نزدیک بزدلی اور کمزوری کی علامت تھی۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی رائے بھی وہی تھی جو اکابر صحابہ یا اکثریت

کی تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے نوجوان طبقہ کی رائے کا لحاظ کیا اور ایک ہزار آدمیوں کی معیت میں مدینہ سے نکل کر احد کی طرف روانہ ہوئے۔ عبداللہ بن ابی کو بہت دکھ ہوا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی۔ وہ مدینہ سے نکل پڑا تھا لیکن اس کے دل میں غصہ اور دکھ بدستور باقی تھا۔ چنانچہ اسلامی لشکر ابھی مدینہ اور احد کے درمیان تھا کہ یہ منافق اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینہ کی طرف واپس لوٹ گیا۔ واپس لوٹتے وقت اس نے کہا:

> ''رسول اللہ ﷺ نے ان نوجوانوں کی بات مان لی اور میری بات نہیں مانی۔ اے لوگو! ہم کو نہیں معلوم کہ ہم اپنی جانوں کو یہاں کیوں ہلاک کریں۔''

احد کی جنگ کی شکست نے یہ ثابت کیا کہ انہی لوگوں کی رائے درست تھی جو مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کے لیے کہتے تھے تاہم اکابر صحابہ اپنے اختلاف رائے کو بھول کر سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ رہے اور جنگ میں شدید نقصان اور تکلیف کے باوجود پوری بے جگری سے مقابلہ کیا۔ عبداللہ کی رائے درست تھی لیکن صحت رائے کے باوجود اطاعت سے نکلنا اس کے لیے گمراہی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بن گیا۔ اسلام میں مشورہ کی بے حد اہمیت ہے اور ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنا مشورہ پیش کرے، لیکن ہر مشورہ دینے والا اگر یہ بھی چاہے کہ اس کے مشورہ پر ضرور عمل ہو تو کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مختلف آراء میں سے ایک ہی رائے کو عملاً اختیار کیا جا سکتا ہے نہ کہ ہر ایک رائے کو۔ سچا اور صحیح مسلمان وہ ہے جو مشورہ پیش کرنے کے بعد اپنا مشورہ بھول جائے اور ذمہ داروں کی طرف سے جو فیصلہ ہوا ہو اس کو اسی طرح مان لے جیسے وہی اس کی اپنی رائے تھی۔ یہی اسلام کا فیصلہ ہے اور اسی میں ہر ایک کی بہتری ہے۔

……◆……

﴿میں عمرؓ کے رب کے لیے لڑتا ہوں﴾

خالد بن ولیدؓ دنیائے اسلام کے بہترین جرنیل، بے حد بہادر، نڈر اور موقع شناس تھے۔ آپ کی انہی خوبیوں کی وجہ سے بارگاہِ نبوت سے انہیں "سیف من سیوف اللہ" (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کا خطاب ملا۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کے عہدِ ہمایوں سے لے کر سیدنا صدیق اکبرؓ کے عہدِ خلافت تک وہ مسلسل اسلامی فوج کے جرنیل اور سپہ سالار رہے، اور اپنی غیر معمولی فوجی قابلیت کے جوہر دکھاتے رہے۔ تاہم سیدنا عمرؓ کو ان کی بعض عادات پسند نہ تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے سیدنا ابوبکرؓ سے کہہ بھی دیا کہ خالدؓ کو جرنیل کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے لیکن سیدنا ابوبکرؓ نے سیدنا عمرؓ کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور سیدنا خالدؓ کو جرنیلی کے عہدہ پر برابر قائم رکھا اور خالدؓ بھی دن رات بازنطینی سلطنت کے خلاف اپنی فوجی کارروائیوں کے ذریعے اسلامی سلطنت کی پہنائیوں اور وسعتوں میں برابر اضافہ کرتے رہے لیکن سیدنا فاروق اعظمؓ کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے سیدنا خالدؓ کو جرنیلی سے معزول کر کے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت دے دی۔

سیدنا خالدؓ شام کے علاقہ میں فتوحات کے کارنامے دکھا رہے تھے۔ اسلامی فوجیں صبح و شام بازنطینی فوجوں سے برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ سرحد کے دونوں طرف فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی ہیں اور کسی کو نہیں پتہ کہ کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ عین اس وقت سیدنا عمر فاروقؓ نے سیدنا محمد بن مسلمہؓ کے ہاتھ محاذ پر ان کی معزولی کا آرڈر بھیجا اور انہیں معزول کر کے سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ کو ان کے اوپر جرنیل بنا دیا لیکن سیدنا خالدؓ نہایت صبر اور خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھا کیے۔

سیدنا خالدؓ کو معزول بھی کچھ عجیب طریقے سے کیا۔ تمام سپاہیوں کو اکٹھا کیا گیا۔ ان کے سامنے امیر المومنین کا آرڈر پڑھا گیا اور ان سب سپاہیوں کے سامنے خود

کی سرداری کی ٹوپی اتار کر سیدنا ابوعبیدہؓ کے سر پر رکھ دی گئی۔ خالد خاموشی سے اپنے خیمہ میں آ گئے۔ اس کے بعد فوجیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد خالدؓ کے خیمہ میں جمع ہوئی اور ان کو اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ خلیفہ کا حکم نہ مانیے لیکن سیدنا خالدؓ نے سب کو رخصت کر دیا اور فرمایا کہ

﴿انی لا اقاتل فی سبیل عمرو لکن اقاتل فی سبیل
رب عمرو﴾

''میں عمر کے لیے نہیں لڑتا بلکہ عمر کے رب کے لیے لڑتا ہوں۔''

''وہ پہلے لشکر کے کماندار کی حیثیت سے لڑتے اب ایک سپاہی کی
حیثیت سے لڑنے لگے۔''

* * *

ذاتی شرافت

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب ''محمد رسول اللہ'' میں ابوسفیانؓ کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ کے نہایت شریف لوگوں میں سے تھے۔ کافر ہونا الگ بات ہے اور شریف ہونا دوسری بات۔ بعض لوگ حالت کفر میں بھی نہایت شریف النفس تھے جیسے عثمان بن طلحہؓ وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ

> ''مکہ میں نیک دل اشراف کی بھی کمی نہ تھی۔ جب کبھی آوارہ لڑکے (بڑوں کے ایما پر) مکہ کی گلیوں میں رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کرتے اور ان پر پتھر وغیرہ پھینکتے، اس وقت اگر رسول خدا ﷺ ابوسفیان کے گھر کے قریب ہوتے تو حضور ﷺ اس گھر میں پناہ حاصل کر سکتے تھے۔ ابوسفیان خود آوارہ چھوکروں کو ڈانٹ کر بھگا دیتے۔ جب یہ آوارہ منش لڑکے بھاگ جاتے تو سرکار دو عالم ﷺ اپنی راہ لیتے۔ ایک روز بزدل اور کمینے ابوجہل نے رسول خدا ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو جو چھوٹی سی تھیں، دیکھا۔ اس نے سیدہ فاطمہؓ سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ وہ اس ملعون کو کوسے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس پر ابوجہل نے سیدہ فاطمہؓ کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ رونے لگیں۔ ابوسفیانؓ ادھر سے گزر رہے تھے، انہوں نے سیدہؓ سے رونے کا سبب پوچھا۔ جب سیدہ فاطمہؓ نے انہیں تمام ماجرا سنایا تو ابوسفیان نے سیدہؓ کو بازو سے پکڑ لیا۔ وہ سیدھے ابوجہل کے پاس گئے اور اس کے دونوں ہاتھ قابو کر لیے۔ پھر انہوں نے سیدہ فاطمہؓ سے کہا کہ وہ ابوجہل کے منہ پر تھپڑ ماردیں اور اپنا بدلہ چکائیں۔ سیدہ نے

> ابوجہل کو تھپڑ مارا اور مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ فطری بات ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ ابوسفیان کے لیے اظہار تشکر کے بغیر نہ رہ سکے۔''

اس واقعہ سے سیدنا ابوسفیان کی ذاتی شرافت ضوفشاں ہے۔ آپ کی وہ زندگی جو کفر میں گذری اس کے کسی واقعہ سے یہ اُجاگر نہیں ہوتا کہ انہوں نے کسی مسلمان پر یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی سختی کی ہو۔ خود ان کے دو بیٹے سیدنا یزیدؓ اور سیدنا معاویہؓ عمرۃ القضاء میں حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے ہیں لیکن آپ نے ان پر بھی کوئی سختی نہیں کی۔ ان کے حلیف قبائل دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے لیکن آپ نے ان کے بارہ میں بھی کوئی بُرا لفظ منہ سے نہیں نکالا۔

◆

﴿ملک الموت کی آواز﴾

> ”میں تمہارے گھروں میں بار بار آتا رہوں گا یہاں تک کہ تم میں
> سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑوں گا۔“

یہ الفاظ اس کے ہیں جو ہر گھر، ہر عالیشان محفل اور ہر اس جگہ آتا ہے جہاں کوئی متنفس رہتا ہے دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کے پاس ملک الموت نے نہیں آنا۔ ہر ایک کے پاس آتا ہے، شاہ و گدا کے پاس بھی، امیر و غریب کے پاس بھی، صحت مند اور بیمار کے پاس بھی، نبی اور ولی کے پاس بھی۔ کوئی حاجب و دربان، کوئی چوکیدار اور پہرے دار اور کوئی تالہ اور دروازہ اسے اندر جانے سے نہیں روک سکتا۔

حافظ ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے کہ سیدنا حسن ؒ بصری فرماتے ہیں کہ ملک الموت ہر گھر میں تین مرتبہ روزانہ چکر لگا کر دیکھتے ہیں کہ کس کا رزق پورا ہو گیا، کس کی مدت عمر پوری ہو گئی۔ جس کا رزق پورا ہو جاتا ہے۔ اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور جب اس کے گھر والے اس کی موت پر روتے ہیں تو ملک الموت دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں۔ ”میرا کوئی گناہ نہیں۔ مجھے تو اسی کا حکم دیا گیا تھا۔ واللہ! میں نے نہ تو اس کا رزق کھایا اور نہ اس کی عمر گھٹائی، نہ اس کی مدت عمر سے کچھ حصہ کم کیا۔ میں تمہارے گھروں میں بار بار آتا رہوں گا یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی باقی نہیں چھوڑوں گا۔“

سیدنا حسن ؒ فرماتے ہیں: اگر میت کے گھر والے ملک الموت کا کھڑا ہونا دیکھ لیں اور ان کا کلام سن لیں تو اپنی میت کو بالکل بھول جائیں اور اپنے اوپر رونا شروع کر دیں۔

……◆……

توبہ کا دروازہ

سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل میں ایک نہایت گنہگار شخص تھا جس نے ستانوے انسانوں کو ناحق قتل کیا تھا۔ جب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے ایک راہب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

> ”اے راہب! میں نے کوئی برائی نہیں چھوڑی کہ جس کو نہ کیا ہو یہاں تک کہ میں نے ستانوے انسانوں کو ناحق قتل کیا ہے، کیا میرے لیے توبہ کی کوئی راہ نکل سکتی ہے اور میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟“

راہب نے کہا؟ اب تیرے لیے معافی کی کوئی صورت نہیں ہے کیونکہ تو نے اتنے انسانوں کو قتل کیا ہے۔“

یہ سن کر وہ شخص بڑا مایوس اور ناامید ہوا اور اسی مایوسی کے عالم میں اس راہب کو بھی قتل کر کے چلا گیا۔ جاتے جاتے ایک دوسرے راہب کے پاس پہنچا اور اپنی سابقہ تمام برائیوں کا ذکر کر کے توبہ کی صورت دریافت کی۔ دوسرے راہب نے بھی اس کو وہی جواب دیا جو پہلے نے دیا تھا اور اُسے اسی طرح مایوس کیا۔ چنانچہ مایوسی کے عالم میں اس نے دوسرے راہب کو بھی قتل کر دیا اور پھر ایک اور راہب کے پاس چلا گیا اور اس سے بھی اسی طرح اپنے گناہوں کا ذکر کیا اور توبہ کی راہ دریافت کی۔ تیسرے راہب کے جواب نے بھی اس کو مایوس کیا اور کہا کہ اب توبہ کی کوئی صورت نہیں۔ یہ جواب سن کر اس نے تیسرے راہب کو بھی قتل کر دیا۔ اب اس قاتل کے مقتولین کی تعداد پوری ایک سو ہوگئی۔ اس کے بعد وہ ایک چوتھے راہب کے پاس آیا اور اس سے اپنے جرائم کا ذکر کر کے توبہ کی صورت دریافت کی۔ وہ راہب دین کے اسرار و رموز سے واقف تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں یہ جواب دوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ جھوٹ نہ ہوگا۔ اس لیے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تو اب توبہ کر کیونکہ یہ

سو قتل اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقابلے میں کچھ نہیں ہیں، لیکن توبہ کر کے اپنے اعمال کو درست کرنے کے لیے فلاں مقام کے دیر میں جا کر وہاں کے عابدوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہو جا۔ راہب کی یہ بات سن کر اس کی امید بندھی اور اس نے خلوص نیت سے توبہ کر کے اس دیر کی راہ لی۔ جب وہ راستہ کے درمیان میں پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کو حکم دیا اور اس کی روح وہیں راستہ میں قبض کر لی گئی۔

سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ عذاب و رحمت کے فرشتے اس کی روح کو لینے کے لیے جھگڑنے لگے۔ اچانک ایک تیسرا فرشتہ آیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ یہ شخص جہاں سے چلا تھا اور جس گاؤں کی طرف جا رہا تھا ان دونوں گاؤں کا فاصلہ ناپو۔ اگر یہ منزل مقصود کے گاؤں سے زیادہ قریب ہو تو اس کو نیکیوں میں شمار کرو ورنہ گناہ گاروں میں۔ چنانچہ جب اس فرشتہ کی تجویز کے مطابق اس فاصلہ کی پیمائش کی گئی تو توابین کے گاؤں کا فاصلہ صرف ایک بالشت کم ہوا تو وہ اس توابین کے گاؤں سے ایک بالشت زیادہ قریب تھا۔ اس لیے رحمت خداوندی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کے تمام گناہوں کی مغفرت فرما کر اسے دامن بخشش سے ڈھانپ لیا، اور رحمت کے فرشتے نے اس کی روح کو لے لیا۔

حق تعالیٰ شانہ کی رحمت ہر وقت ہر شخص کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ وہ شخص اخلاص کے ساتھ توبہ کرے اور حق تعالیٰ کے دامن عفو میں آنے کی جدوجہد کرے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ

رحمت حق بہانہ می جوید   رحمت حق بہائی جوید

اسی وجہ سے کہا گیا ہے ؎

ایں درگاہے، مادرگہے نا اُمیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا اُمید ہونا بذات خود ایک بہت بڑا گناہ ہے لہٰذا رحمت خداوندی سے کسی حالت میں بھی نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے لیکن جب موت کے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں تو توبہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور بندہ بھی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

تنخواہ

مولوی محمد اسماعیل علیگڑھ کے رئیس تھے۔ ان کو حدیث پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ حضرۃ مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی خدمت میں لکھا کہ کسی عالم کو جو حضرۃ کے نزدیک قابل اعتماد اور ماہر حدیث ہیں علیگڑھ بھیج دیں تا کہ میں ان سے باقاعدہ حدیث پڑھوں۔

جواب میں مولانا نانوتویؒ نے تحریر فرمایا کہ کسی اور عالم کو فرصت کہاں جو آپ کے پاس جانے پر راضی ہو سکے البتہ ایک بیکار خود یہ فقیر ہے حکم ہو تو بندہ ہی حاضر ہو کر آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرے۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب نے جو یہ جانفزا نوید سنی کہ خود حضرۃ نانوتویؒ پڑھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں، تو بہت خوش ہوئے۔ کہتے ہیں کہ صرف ان کو پڑھانے کے لیے حضرۃ مولانا علیگڑھ تشریف لے گئے۔ تنخواہ کا مسئلہ جب پیش ہوا تو مولوی اسماعیل صاحب نے دست بستہ عرض کی کہ حضرۃ والا جو فرمائیں گے وہی رقم خدمت میں پیش کی جائے گی میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ حضرۃ خود مجھے پڑھانے کے لیے تشریف لے آئے۔ جواب میں حضرۃ مولانا نانوتویؒ نے فرمایا کہ جب تک میں تمہارے یہاں ہوں پندرہ روپیہ ماہوار مجھے دے دینا تا کہ گھر بھیج دوں۔ اس قلیل رقم کو سن کر مولوی اسماعیل شرمندہ ہو گئے لیکن چونکہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ مسئلہ بجائے تمہارے فیصلے کے میری رائے کے تابع رہے گا اس وجہ سے خاموش ہو گئے۔

مولوی اسماعیل صاحب کئی ماہ تک حسب فیصلہ پندرہ روپے کی رقم حضرۃ والا کو پیش کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں مولوی اسماعیل صاحب ایک روز جب پڑھنے کے لیے حضرۃ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرۃ نانوتویؒ نے فرمایا ”میاں اسماعیل! جو رقم اب تک تم دیتے تھے اس پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آ گئی۔“ مولوی اسماعیل بہت خوش ہوئے کہ شاید کچھ اضافہ کی منظوری عطا فرمائی جائے گی لیکن جب حضرۃ نے یہ فرمایا کہ

بھائی پندرہ روپے جو تم مجھے دیتے تھے ان میں دس تو میں اپنے گھر کے لوگوں کو دیا کرتا تھا اور پانچ روپے والدہ ماجدہ کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ کل خط آیا ہے کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا ہے اس لیے ان پانچ روپوں کی ضرورت اب باقی نہیں رہی، اس لیے آئندہ بجائے پندرہ کے دس روپے دیا کرنا۔ مولوی اسماعیل حضرۃ والاؒ کے منہ سے یہ سن کر حیرت واستعجاب میں پڑ گئے۔ کہتے تھے حضرۃ مجھ پر کوئی بار نہیں لیکن حضرۃ کی طرف سے اصرار تھا کہ غیر ضروری روپے کا بار اپنے سر کیوں لوں۔ آخر بات دس روپے ہی کی مانی گئی۔

اب کہاں ہیں حضرۃ مولانا نانوتویؒ جیسے لوگ دنیا میں۔ "اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر"۔ جن کو مال سے بالکل محبت نہ تھی آج تو کہیں سے ۱۰ روپے کسی مولوی صاحب کو زیادہ مل جائیں تو ۲۰ سالہ پرانے مدرسہ یا مسجد کو چھوڑ کر نئے مدرسہ یا مسجد میں چلے جاتے ہیں اور نہ پرانے تعلقات کی کوئی پروا رہتی ہے اور نہ خدمت دین کی۔ بس اب تو مقصود زندگی ہی پیسہ ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں بعض حضرات نے تو اب دین کو بھی پیشہ بنا لیا ہے۔ انہی مولانا نانوتویؒ کا واقعہ ارواح ثلاثہ میں نقل کیا گیا ہے کہ مولوی امیر الدین نے فرمایا کہ ایک مرتبہ بھوپال سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی طلبی آئی اور پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ میں نے کہا: ارے قاسم! تو چلا کیوں نہیں جاتا (کیونکہ اس زمانے میں پانچ سو روپے آجکل کے پانچ لاکھ کے برابر تھے) حضرۃ نے فرمایا کہ وہ مجھے صاحب کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور اسی بنا پر وہ پانچ سو روپے ماہوار دیتے ہیں، مگر میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا۔ پھر کس بنا پر جاؤں۔ میں نے بہت اصرار کیا مگر نہیں مانا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرۃ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں نے علم دین پڑھا ہے خدمت دین کے لیے اور میرے خیال میں دین کی خدمت میں یہاں زیادہ کر رہا ہوں اس لیے جانے سے معذوری فرمائی۔

مفتی محمد شفیعؒ صاحب نے لکھا ہے کہ حضرۃ مولانا نانوتویؒ کے علمی و عملی کمالات سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو۔ ان کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ معاشی ضرورت کا احساس ہوا تو مطبع احمدی میرٹھ میں کتابوں کی تصحیح کے لیے ملازمت اختیار کر لی۔ کل دس

روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ ایک مرتبہ اس سے بھی جی گھبرایا تو اپنے شیخ حضرۃ حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے مشورہ طلب کیا کہ میں یہ ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں آپ کی اس بارہ میں کیا رائے ہے؟ حضرۃ حاجی صاحبؒ نے جواب میں فرمایا

> ”مشورہ دلیل ہے تردد کی اور تردد دلیل ہے خامی کی اور خامی کے لیے اسباب کا ترک کرنا جائز نہیں۔“

یہ اخلاص اور توکل تھا حضرۃ نانوتویؒ کا۔ حضرۃ تو بڑے لوگوں میں سے تھے حضرۃ کے خدام اتنے متوکل تھے کہ آج ان کی مثال ملنا بھی مشکل ہے۔ حضرۃ مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی آخری تنخواہ مظاہر العلوم میں چالیس روپے تھی اور حضرۃ شیخ الہندؒ کی آخری تنخواہ کے اضافے کی تجویز ہوئی تو دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ یہ کہہ کر اضافہ تنخواہ سے انکار کردیا کرتے تھے کہ ہماری حیثیت سے یہ بھی زائد ہے۔

علمائے دیو بند کی تاریخ گواہ ہے کہ ان حضرات نے ہمیشہ اخلاص اور توکل سے دین کا کام کیا۔ تنخواہ اور مال کمانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس سے اعراض برتا۔ یہ حضرات اس زمانہ میں سلف کی یادگار تھے۔

* * *

قصاص

سرکار دو عالم ﷺ میدان بدر میں تمام رات بیدار اور مصروف دعا رہے کیونکہ یہ اسلام کا کفر کے ساتھ پہلا مقابلہ تھا۔ کفار کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی۔ پھر ہر قسم کا اسلحہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ قریش کے بڑے بڑے سورما ان میں موجود تھے جو اس جنگ کے ذریعہ اسلام اور اہل اسلام کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے خصوصی طور پر ابوجہل جس نے ہر موقع پر اپنی سیاہ بختی کا اظہار کیا تھا، اس لشکر کا روح رواں تھا۔

تاریخ میں ہے کہ جب قریش کا قافلہ مسلمانوں سے بچ کر صحیح سلامت مکہ پہنچ گیا تو ابوسفیان نے قیس بن امرئ القیس کے ہاتھ قریش کو کہلا بھیجا کہ میں نے قافلہ کو بچا لیا ہے لہٰذا تم واپس چلے آؤ۔ یہ قاصد جحفہ میں قریش کو ملا اور انہیں ابوسفیان کا پیغام پہنچایا۔ قریش نے واپس ہونے کا ارادہ کیا کیونکہ وہ گھر سے نکلے ہی اس قافلہ کو بچانے کے لیے تھے، لیکن ابوجہل نے کہا کہ ہم بدر سے ورے واپس نہ ہوں گے۔ وہاں تین دن ٹھہریں گے، اونٹ ذبح کریں گے اور کھائیں کھلائیں گے، شراب پئیں گے اور راگ اور گانا سنیں گے اور داد عیش دیں گے۔ اس طرح قبائل عرب کے اطراف میں ہماری عظمت و شوکت کا آوازہ پھیل جائے گا اور وہ ہمیشہ ہم سے ڈرتے رہیں گے۔ دوسرے لوگوں نے ابوجہل کی اس بات سے اختلاف کیا اور واپس جانے کے لیے بہت زور دیا لیکن ابوجہل کی رائے سب پر غالب رہی لیکن پھر بھی بنو عدی اور بنو زہرہ واپس چلے گئے۔

ابوجہل اور دوسرے سرداران قریش کی بری نیتوں کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علم ہوا تو آپ ؐ اور آپ ؐ کے صحابہ کرامؓ بھی بدر میں پہنچ گئے۔ سرکار دو عالم ﷺ کے لیے اونچی جگہ پر ایک عریش (کھجور کی شاخوں کا سائبان) بنایا گیا۔ آپ ﷺ بذات خود معرکہ کی جگہ پر تشریف لائے اور دست مبارک کے اشارے سے فرمایا کہ یہ فلاں کافر

کے مارے جانے کی جگہ ہے اور یہ فلاں کافر کے قتل ہونے کی جگہ ہے۔

اسی عریش میں آپ نے ساری رات جاگتے گذاری۔ سیدنا صدیق اکبرؓ عریش کے اندر آپ کی حفاظت کے لیے شمشیر برہنہ علم کیے ہوئے تھے اور دروازے پر سیدنا سعد بن معاذؓ تلوار پر تلہ میں لٹکائے پہرہ دے رہے تھے۔ صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لیے آواز دی۔ نماز سے فارغ ہو کر جہاد پر وعظ فرمایا اور پھر اپنے مجاہدین جن سے بہتر مجاہد چشم آفتاب نے آج تک نہیں دیکھے، ان کی صف آرائی میں آپ مشغول و مصروف ہوئے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ کے دست مبارک میں ایک تیر کی لکڑی تھی جس سے کسی کو آپ اشارہ فرماتے کہ آگے ہو جاؤ اور کسی کو فرماتے کہ پیچھے ہو جاؤ کیونکہ صف بندی جہاد کی ہو یا نماز کی اس کا سیدھا ہونا اسلام کے نزدیک بہت ضروری ہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: مسلمانو! نماز میں اپنی صفوں کو سیدھا رکھا کرو کیونکہ جب تک تمہاری صفیں سیدھی رہیں گی تمہارے دل بھی سیدھے رہیں گے اور جب تمہاری صفوں میں ٹیڑھ آ گئی تو تمہارے دل بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔ تیر کی اس لکڑی سے صفوں کو سیدھا کرتے ہوئے آپ سیدنا سواد بن غزیہ انصاریؓ کے پاس پہنچے جو صف سے آگے نکلے ہوئے تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اس لکڑی سے ان کے پیٹ کو ٹھوکا دیا اور فرمایا "استو یا سواد" (اے سواد! صف میں برابر ہو جاؤ) بات کوئی ایسی نہیں تھی۔ میدان جنگ میں فوج کے سپہ سالار اور کمانڈر سپاہیوں کی غلطیوں کو اس سے زیادہ سختی کے ساتھ درست کرتے ہیں لیکن یہاں تو اس صحابی کا واسطہ ایک ایسے کمانڈر سے تھا جو نہ صرف کمانڈر تھا بلکہ عدل و انصاف کا مجسمہ اور پیغمبروں کا خاتم اور سید الاولین و الآخرین تھا۔ جس نے اپنے صحابہ کو ہر قسم کی آزادی دی ہوئی تھی جو یہ کہا کرتا تھا کہ اس دنیا کی غلطیوں کا اس دنیا ہی میں مکا فو کر لو ورنہ قیامت میں تمہیں ان کی پاداش میں اپنی نیکیاں ہی دینا پڑیں گی۔

آج تو کوئی مرید اپنے پیر کے سامنے نہیں بول سکتا لیکن جونہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت سوادؓ کے پیٹ کو ٹھوکا دیا، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے مجھے ضرب شدید لگائی ہے حالانکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حق و انصاف کے ساتھ بھیجا ہے، لہٰذا اس

ضرب کا آپ مجھے قصاص دیں۔ یہ جملہ کوئی معمولی جملہ نہ تھا۔ ایسے جملے سے تو عرشِ الٰہی کانپ جاتا ہے، لیکن سیدنا سوادؓ کے یہ الفاظ کہنے سے کسی صحابی کو بھی جنبش نہ ہوئی۔ کسی نے ان پر کوئی جملہ نہیں کسا کہ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم اللہ کے رسول سے قصاص طلب کر رہے ہو؟ سب صحابۂ کرامؓ انگشت بدنداں ساکت وصامت کھڑے ہیں۔ سیدنا سوادؓ کے منہ سے یہ جملہ سن کر سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنا شکم مبارک ننگا کر دیا اور فرمایا: اپنا قصاص لے لو۔ اس پر سیدنا سوادؓ سرکارِ دو عالم ﷺ کے گلے لپٹ گئے اور آپ کے شکم مبارک کو بوسہ دیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا: سواد! تو نے ایسا کیوں کیا؟ عرض کی یا رسول اللہ! موت حاضر ہے، میں نے چاہا کہ آخر عمر میں میرا بدن آپ کے جسمِ اطہر سے مس کر جائے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا خیر فرمائی۔

* * *

بلا امتیاز

سرکار دو عالم ﷺ نے کبھی اپنے آپ ﷺ کو دوسروں سے ممتاز نہیں فرمایا۔ اگرچہ آپ ”بعد از خدا بزرگ توئی“ کا مصداق تھے لیکن اپنے افعال سے آپ نے کبھی اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کے درمیان میں چلتے تا کہ دیکھنے میں کوئی امتیاز نظر نہ آئے۔ ایک سفر میں آپ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ کھانے کے لیے ایک بکری پکالو۔ ایک نے کہا اس کا ذبح کرنا میرے ذمہ ہے۔ دوسرے نے کہا کھال اتارنا میرے ذمہ ہے۔ ایک اور صحابی بولا پکانا میرے ذمے ہے۔ صحابہ کرامؓ کی یہ باتیں سن کر آپ ﷺ نے فرمایا لکڑیاں چن کر لانا میرے ذمے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کی اے اللہ کے رسولؐ یہ کام ہم خود کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں جانتا ہوں کہ تم کر سکتے ہو لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنے تئیں تم سے ممتاز کروں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو پسند نہیں فرماتے جو اپنے ساتھیوں سے ممتاز بنتا ہے۔ چنانچہ آپ لکڑیاں جمع کر کے لائے۔

……

شہید زندہ ہیں

قرآن نے کہا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انہیں مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں اور انہیں رزق بھی دیا جاتا ہے۔ شہید کی زندگی کی کیا کیفیت ہے؟ ہم اپنے حواس سے اسے نہیں سمجھ سکتے اسی لیے فرمایا "ولٰکن لا تشعرون" (کہ تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے) آیت میں زندہ اجسام انہی کو کہا گیا جن پر فعل قتل وارد ہوا تھا۔ گویا بتایا یہ کہ ان اجسام پر بے شک وعدۂ موت پورا ہوا لیکن اب وہ زندہ ہیں اور زندگی کے تمام لوازم انہیں اس جہان میں حاصل ہیں۔ "بل احیاءٌ" نے "هُمْ اَمْوات" کا کلی طور پر ابطال کر دیا۔

قرطبہ (اندلس) کے بہت بڑے مفسر امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ قرآن حکیم نے شہداء کو جو زندہ کہا تو اس کی دلیل میں "یرزقون" بھی فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ یہ ابدان کی زندگی ہے صرف روح کی نہیں۔

زندگی کے آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شہداء کے جسم قبروں میں گلتے سڑتے نہیں بلکہ ہزار ہا سال کے بعد بھی وہ اسی طرح رہتے ہیں جس طرح دفن کے وقت تھے بلکہ بعض دفعہ تو ان کا دوران خون بھی قائم رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سائنس دانوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے لیکن مشاہدات نے اس کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔

سیدنا معاویہؓ کے عہد خلافت میں مدینہ طیبہ کے قریب نہر کظامہ کھودی گئی۔ دوران کھدائی سید الشہداء سیدنا حمزہؓ کا جسد اطہر ملا۔ دیکھا گیا کہ وہ اسی طرح تھا جس طرح وہ دفن کیا گیا تھا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ کدال ان کی انگلی پر لگی تو خون بہنے لگا۔

(اصابت الناس اصیعہ فدمیت) (سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۴۳، فتح الباری جلد ۲ ص ۱۴۲)

سیدنا فاروق اعظمؓ کے زمانہ خلافت میں نجران کے ایک آدمی نے ایک جگہ جہاں کچھ قبریں تھیں، زمین کھودی تو سیدنا عبداللہ بن تامرؓ کا جسد اطہر ملا۔ ہاتھ سر پر رکھا

ہوا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب ان کا ہاتھ زخم سے اٹھاتا تو اس زخم سے خون پھوٹ پڑتا اور جب میں آپ کے ہاتھ کو چھوڑ دیتا تو وہ وہیں جا لگتا اور خون کو روک دیتا۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۵، تفسیر خازن جلد ۱ ص ۲۲۸)

علامہ سمہودیؒ نے لکھا ہے کہ سیدنا معاویہؓ کے عہد خلافت میں جب نہر کظامہ کھودی گئی اور درمیان میں شہداء کی قبریں کھلیں تو دیکھا گیا کہ ان کے جسم تر و تازہ ہیں اور بال بڑھے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک شہید کے پاؤں پر کدال لگی تو خون جاری ہو گیا۔ جب وہ جگہ کھودی گئی تو ہر طرف مشک کی خوشبو پھیل گئی۔

یہ واقعات تو پہلی صدی کے ہیں اس بارہ میں ایک نہایت حیرت افزا واقعہ چودھویں صدی کا ہے جو اخبارات کے سینوں میں محفوظ ہے اور ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان میں کی کافی تعداد ابھی تک زندہ ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۳۳ء کا ہے یعنی آج سے ۶۴ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

قصبہ سلمان پاک جو بغداد سے ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے، زمانہ قدیم میں جس کا نام مدائن تھا جہاں اکثر صحابہ کرامؓ گورنری کے عہدہ پر فائز رہے۔ یہاں ایک شاندار مقبرے میں مشہور صحابی رسولؐ سیدنا سلمان فارسیؓ مدفون ہیں اور آپ کے مزار کے گنبد سے متصل سرکار دو عالم ﷺ کے دو جلیل القدر صحابی سیدنا حذیفہ الیمانیؓ اور سیدنا جابر بن عبداللہؓ کے مزارات ہیں۔ ان دونوں صحابہ کرامؓ کے مزارات پہلے سلمان پاک سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک غیر آباد جگہ پر تھے۔

ہوا یہ کہ سیدنا حذیفہؓ نے خواب میں ملک فیصل اول شاہ عراق سے فرمایا کہ ہم دونوں کو موجودہ قبروں سے منتقل کر کے دریائے دجلہ سے تھوڑا سے فاصلہ پر دفن کر دیا جائے۔ اس لیے کہ میرے مزار میں پانی اور جابرؓ کی قبر میں نمی شروع ہو گئی ہے۔

شاہ فیصل والی عراق یہ خواب مسلسل دو راتیں دیکھتا رہا اور شاید بے پرواہی یا امور سلطنت میں منہمک ہونے کی وجہ سے بھول گیا۔ تیسری رات حضرۃ حذیفہؓ نے عراق کے مفتی اعظم کو خواب میں یہی ہدایت فرما کر کہا: ''ہم دو راتوں سے مسلسل بادشاہ کو کہہ

رہے ہیں لیکن اس نے اب تک کوئی انتظام نہیں کیا۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس کو متوجہ کر کے اس کا فوری بندوبست کراؤ۔ چنانچہ اگلے روز صبح ہی صبح مفتی اعظم، نوری السعید پاشا وزیراعظم کو ساتھ لے کر بادشاہ سے ملے اور اس سے اپنا خواب بیان کیا۔ شاہ فیصل نے اعتراف کیا کہ میں بھی دو راتوں سے مسلسل خواب میں یہی دیکھ رہا ہوں۔

آخر کافی غور وخوض اور مشورے کے بعد شاہ نے مفتی اعظم سے کہا کہ آپ مزارات کھولنے کا مشورہ دیں میں اس کی تعمیل کے لیے تیار ہوں۔ جب مفتی اعظم نے مزارات کے کھولنے اور ان دونوں صحابہؓ کی لاشوں کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا فتویٰ دے دیا تو یہ فتویٰ اور شاہی فرمان دونوں اس اعلان کے ساتھ اخبارات میں شائع کر دیے گئے کہ بروز عید قربان بعد نماز ظہر دونوں اصحاب رسولؐ کے مزارات کھولے جائیں گے۔

اخبارات میں یہ خبر شائع ہونا تھی کہ تمام دنیائے اسلام میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ حسن اتفاق سے ان دنوں موسم حج ہونے کے باعث تمام دنیا سے مسلمان حج بیت اللہ کے لیے حرمین شریفین میں جمع ہو رہے تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا تو انہوں نے شاہ عراق سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مزارات حج سے چند روز بعد کھولے جائیں تا کہ وہ بھی شرکت کر سکیں۔ اسی طرح حجاز، مصر، شام، لبنان، فلسطین، ترکی، ایران، بلغاریہ، افریقہ، روس اور ہندوستان وغیرہ ملکوں سے شاہ عراق کے نام بے شمار ٹیلیگرام پہنچے کہ ہم بھی جنازوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں، لہٰذا مہربانی فرما کر مقررہ تاریخ چند روز بڑھا دی جائے۔

مسلمانان عالم کی خواہش پر دوسرا فرمان یہ جاری کیا گیا کہ اب یہ رسم حج کے دس روز بعد ادا کی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی خواب میں اہل مزارات کی عجلت کی تاکید کے پیش نظر احتیاطی تدابیر بھی کی گئیں تا کہ پانی مزارات تک نہ پہنچنے پائے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کی آرزو میں لوگ جوق در جوق سلمان پارک میں جمع ہو گئے۔ دوشنبہ کے دن بارہ بجے کے بعد لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں ان دونوں

صحابہ کرامؓ کے مزارات کھولے گئے تو معلوم ہوا کہ سیدنا حذیفہ الیمانیؓ کے مزار میں کچھ پانی آ چکا تھا اور سیدنا جابر بن عبداللہؓ کے مزار میں نمی پیدا ہو چکی تھی، حالانکہ دونوں دریائے دجلہ وہاں سے قریباً دو فرلانگ دور تھا۔

شاہ فیصل، مفتی اعظم عراق، وزیر مختار جمہوریہ ترکی اور پرنس فاروق ولی عہد مصر نے کندھا دیا اور بڑے احترام سے ایک شیشہ کے تابوت میں رکھا۔ پھر اسی طرح سیدنا جابرؓ کی نعش مبارک کو باہر نکالا گیا۔ نعش مبارک کا کفن حتیٰ کہ ریش ہائے مبارک کے بال تک بالکل صحیح سلامت تھے۔ نعشوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ یہ تیرہ سو سال قبل کی نعشیں ہیں، بلکہ گمان یہ ہوتا تھا کہ شاید انہیں رحلت فرمائے دو تین گھنٹے سے زائد وقت نہیں گذرا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ دونوں حضرات کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں اتنی پر اسرار چمک تھی کہ بہتوں نے چاہا کہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں لیکن ان کی نظریں اس چمک کے سامنے ٹھہرتی ہی نہ تھیں۔

بڑے بڑے ڈاکٹر یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایک جرمن ماہر چشم جو بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا، اس تمام کاروائی میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس سے کچھ اتنا بے اختیار ہوا کہ ابھی نعش ہائے مبارک تابوتوں میں رکھی گئی تھیں کہ آگے بڑھ کر مفتی اعظم عراق کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

> "آپ کے مذہب اسلام کی حقانیت اور ان صحابہ کرامؓ کی بزرگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ لائیے مفتی صاحب، ہاتھ بڑھائیے میں مسلمان ہوتا ہوں۔ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ۔"

اس موقع پر ایک جرمن فلم ساز کمپنی نے کمال کیا۔ کمال کیا کیا بلکہ دور دراز سے آئے ہوئے مشتاقان دید پر احسان عظیم کیا کہ اس نے شاہ عراق کی منظوری سے اپنے خرچ پر تینوں مزارات کے اوپر دو سو فٹ بلند فولاد کے چار کھمبوں پر کوئی تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ

چوڑا ٹیلی ویژن کا سکرین لگا دیا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کھمبوں کے چاروں طرف بھی چھت سے ملحق چار سکرین لگا دیے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ہر کوئی اپنی جگہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر مزارات کے کھلنے کے وقت سے لے کر آخر وقت تک تمام کاروائی دیکھتا رہا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد بغداد میں کھلبلی مچ گئی اور بے شمار یہودی اور عیسائی خاندان بلا کسی جبر کے اپنے جہل اور گمراہی پر افسردہ، اپنے گناہوں پر نادم، ترساں و لرزاں جوق در جوق مسجدوں میں قبول اسلام کے لیے آئے اور دولت اسلام سے مشرف ہوئے۔

یہ چشم دید واقعہ کسی کتاب میں لکھا ہوا اگلے زمانہ کا تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ہی زمانے کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔ اس کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا۔ ۱۹۳۳ء میں اس معجزہ کا ظہور ہوا۔ اس کو ہر مذہب اور ملت اور کئی ممالک کے اشخاص نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور دنیا کے اخبارات میں اس کی تشہیر ہوئی ہے۔

(منقول از ماہنامہ تعلیم القرآن، راولپنڈی، اگست ۱۹۶۳ء)

……

﴿تھپڑ کی سزا﴾

حدیث میں ہے کہ جو شخص میرے ولی کو اذیت دیتا ہے میں اس کو جنگ کا الٹی میٹم دے دیتا ہوں کیونکہ اللہ کا ولی وہی ہوتا ہے جس نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں گم کر دیا ہو۔

امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا، دیکھا کہ ایک شخص بیت اللہ میں یہ کہتا پھر رہا ہے۔

﴿اللّٰھم اغفرلی وما اظن ان تغفرلی﴾

"اے اللہ! مجھے بخش دے لیکن میرا گمان نہیں کہ تو مجھے بخش دے گا۔"

میں نے کہا کہ جو تو کہتا ہے ایسا میں نے اس سے پہلے کسی کو بھی کہتے نہیں سنا۔

اس نے جواب دیا کہ میں نے حق تعالیٰ شانہ سے عہد کیا تھا کہ اگر میں عثمانؓ کے منہ پر طمانچہ مار سکا تو ضرور ماروں گا۔ چنانچہ جب وہ شہید ہوئے تو ان کا جنازہ ان کے گھر میں چارپائی پر رکھا ہوا تھا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا اور موقع پا کر ان کے چہرہ سے کپڑا ہٹایا اور زور سے ایک تھپڑ مارا جس پر میرا دایاں ہاتھ سوکھ گیا۔

امام ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا دایاں ہاتھ دیکھا اور وہ اس طرح سوکھا ہوا تھا گویا کہ وہ ایک لکڑی ہے۔ اس واقعہ کو امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور علامہ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے۔

قاتلین عثمانؓ کا انجام بھی نہایت برا ہوا اور وہ بڑی ذلت کی موت مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی بے عزتی برداشت نہیں کرتا اس وجہ سے ان لوگوں کو دنیا میں اور آخرت میں سخت اذیت ناک تکلیف سے دوچار کرتا ہے۔

……

سمندر میں قبر

عاصم بن ثابت انصاریؓ نے جس روز اسلام قبول کیا تھا اسی دن خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ میں نہ تو کسی کافر کے بدن کو ہاتھ لگاؤں گا اور نہ کسی کافر کو یہ موقع دوں گا کہ وہ میرے بدن کو چھو سکے۔ زندگی بھر اس عہد کو پورا کیا۔ انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عہد کو پورا کیا اور کسی کافر کو ان کے بدن کو ہاتھ نہ لگانے دیا۔

اسد الغابہ میں ابن اثیر نے لکھا ہے کہ سیدنا عاصم بن ثابت بن الافلح انصاری قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اصحاب بدر میں سے تھے اور جنگ بدر میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ یہ سیدنا عمرؓ کے سسر اور آپ کے فرزند عاصم بن عمرؓ کے نانا تھے۔ سن ۳ھ میں غزوہ الرجیع میں کفار سے دست بدست لڑائی میں جام شہادت نوش فرمایا۔

جنگ بدر میں چونکہ کافی قریشی سرداروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اس وجہ سے قریش مکہ کو جب ان کی شہادت کی خبر ملی تو انہوں نے رجیع میں چند آدمیوں کو بھیجا کہ ان کے سر کو کاٹ کر لائیں تاکہ شناخت ہو جائے کہ واقعی عاصم بن ثابتؓ ہی شہید ہوئے ہیں۔ جب یہ کافر رجیع پہنچے اور ان کی لاش کو تلاش کیا تو دیکھا کہ شہد کی مکھیوں کے ایک بہت بڑے جھنڈ نے اُن کی لاش کے اردگرد اس طرح گھیرا ڈال رکھا ہے کہ ان کی لاش تک پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ وہ کافر نامراد واپس چلے گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ مکہ کی ایک کافرہ عورت سلافہ بنت سعد کے دو بیٹوں کو سیدنا عاصمؓ نے جنگ بدر میں قتل کیا تھا۔ اس عورت نے جوش انتقام میں یہ قسم کھا رکھی تھی کہ اگر مجھے عاصمؓ کا سر مل گیا تو میں ان کی کھوپڑی میں شراب پیوں گی۔ چنانچہ اسے جب پتہ چلا کہ عاصمؓ رجیع میں شہید ہو گئے ہیں تو اس نے چند لوگوں کو ان کا سر کاٹ کر لانے کے لیے بھیجا اور انہیں لالچ دیا کہ میں اس کام کی تمہیں بڑی قیمت دوں گی۔ اس لالچ میں جب وہ لوگ مقام رجیع پہنچے اور انہوں نے ان کے جسم کے اردگرد اللہ کے اس لشکر یعنی شہد کی مکھیوں کا گھیرا دیکھا تو

حواس باختہ ہو گئے۔ مگر چند لالچی لوگ اس انتظار میں وہاں ٹھہر گئے کہ جب کبھی بھی یہ شہد کی مکھیاں اڑ جائیں گی تو ہم ان کا سر کاٹ کر لے جائیں اور منہ مانگا انعام حاصل کریں گے۔

اللہ کی شان کہ نہایت ہی زوردار بارش ہوئی اور پہاڑوں سے برساتی نالہ بہتا ہوا اس میدان میں پہنچا اور پانی کا اس زور کا ریلا آیا کہ کافر جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ کی مقدس لاش بہاؤ کے ساتھ سمندر میں پہنچ گئی۔

اس طرح وہ ناپاک کافر ان کے اس پاکیزہ بدن کو ان کی موت کے بعد بھی ہاتھ نہ لگا سکے۔

* * *

﴿بدنصیب بوڑھا﴾

"اے اللہ! اگر یہ شخص جھوٹا ہے تو اس کی عمر لمبی کر دے اور اس کی محتاجی کو دراز کر دے اور اس کو فتنوں میں مبتلا کر دے۔"

دعا کے یہ الفاظ ایک ایسے شخص کے منہ سے نکلے جو نہ صرف صحابی رسولؐ تھے بلکہ عشرہ مبشرہ میں تھے۔ جنگ احد میں سرکار دو عالم ﷺ نے ان کے بارہ میں فرمایا" اے سعد بن ابی وقاص! یہ تیر لے اور دشمنوں پر چلا۔ میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں۔" ساری دنیا اپنے ماں باپ حضور علیہ السلام پر قربان کرتی ہے اور حضور ﷺ ان کے بارہ میں یہ الفاظ فرما رہے ہیں۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا اور سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا تھا:

﴿اللّٰھم سدّد سھمه واجب دعوته﴾

"اے اللہ! ان کے تیر کے نشانہ کو درست فرما اور ان کی دعا کو قبول فرما۔"

اس وجہ سے نہایت مستجاب الدعوات تھے۔

آپ کوفہ کے گورنر تھے، لیکن کوفہ کے لوگ اپنی سرشت کے لحاظ سے کوئی اچھے لوگ نہیں تھے۔ ایک مرتبہ کوفہ کے کچھ لوگ اپنے گورنر سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کے خلاف شکایات لے کر دربار فاروقی میں حاضر ہوئے۔ شکایات یہ تھیں

(۱) یہ مال غنیمت برابری کے ساتھ تقسیم نہیں کرتے۔

(۲) خود لشکروں کے ساتھ جہاد میں نہیں جاتے۔

(۳) مقدمات کے فیصلوں میں عدل وانصاف سے کام نہیں لیتے۔

امیر المومنینؓ نے تحقیقات کے لیے محمد بن مسلمہؓ کو کوفہ بھیجا اور فرمایا کہ کوفہ کی ہر مسجد کے نمازیوں سے نماز کے بعد ان شکایات کے بارہ میں پوچھا جائے۔ تحقیقی آفیسر

جس مسجد میں بھی گئے وہاں کے نمازیوں نے سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کے بارہ میں کلمۂ خیر ہی کہا، مگر ایک مسجد میں صرف ایک شخص نے جس کا نام "ابوسعدہ" تھا، اس نے سیدنا سعدؓ کے خلاف ان الزامات کی تصدیق کی۔

اتنے جلیل القدر صحابیؓ اور ان کے خلاف یہ اس قدر گھناؤنے الزامات۔ سیدنا سعدؓ جلال میں آ گئے اور یہ دعا مانگی

عبدالمالک بن عمیر تابعی فرماتے ہیں کہ اس دعا کا اثر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ابوسعدہ اس قدر بوڑھا ہو چکا تھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی دونوں بھنویں اس کی دونوں آنکھوں پر لٹک گئی تھیں اور در بدر بھیک مانگ کر انتہائی مفلسی اور محتاجی کی زندگی بسر کرتا تھا اور اس بڑھاپے میں بھی وہ راہ چلتی جوان لڑکیوں کو چھیڑتا تھا اور وہ اس کی پٹائی کرتی تھیں۔ جب کوئی اس سے اس کا حال پوچھتا تو وہ کہا کرتا تھا:

"مجھے سعد بن ابی وقاصؓ کی بددعا لگ گئی ہے۔"

◆

﴿زبان کٹ گئی﴾

جنگ قادسیہ ایرانیوں اور مسلمانوں کے مابین آخری سب سے بڑی جنگ تھی۔ اس جنگ نے کسریٰ ایران کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ قادسیہ کے میدان میں لڑی گئی تھی اس وجہ سے تاریخ میں اسے قادسیہ کی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس میں ایرانی لشکر کی کمان رستم کر رہا تھا جبکہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ رستم کسریٰ کا وزیر جنگ تھا۔ کسریٰ نے یہ جنگ جیتنے کے لیے اپنی ساری قوت جنگ میں جھونک دی تھی۔ قریباً تین سو ہاتھی بعض مورخین کی روایت کے مطابق ہندوستان سے منگوائے گئے تھے کیونکہ ایران میں ہاتھی نہیں ہوتے۔

فردوسی رافضی نے جو شاہنامہ میں رستم کی داستان لکھی ہے وہ کوئی رستم نہیں تھا۔ یہی رستم تھا جو کسریٰ کا وزیر جنگ اور مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ فردوسی نے اسلام کے خلاف اپنے باطنی خبث کا اظہار شاہنامہ لکھ کر اور رستم کی تعریف کر کے کیا ہے۔

سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کو عرق النساء کا سخت درد تھا۔ اس درد کی وجہ سے وہ بذات خود اس جنگ میں شریک نہ ہو سکے لیکن انہوں نے ایک بالا خانہ تیار کروایا جس میں بیٹھ کر وہ پوری جنگ کا نقشہ دیکھ رہے تھے اور وقتاً فوقتاً اپنے نائب کو میں جنگ کی پالیسیوں کے بارے ہدایت بھجواتے رہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔

دشمن ذلیل ہوا۔ رستم مارا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسلامی لشکر کو فتح عطا فرمائی۔

نقاتل حتى ينزلَ اللّٰه نصره
وسعدٌ بباب قادسية مُعصَم
فابنا وقد اٰمت نساءٌ كثيرة
ونسوةُ سعدٍ ليس فيهن ايّم

”ہم لوگ جنگ کرتے ہیں یہاں تک کہ حق تعالیٰ شانہ ہماری مدد

قرار دیتا ہے اور سعدؓ کا یہ حال ہے کہ وہ قادسیہ کے دروازے پر محفوظ ہو کر بیٹھے رہتے ہیں۔ جب ہم جنت سے واپس ہونے تو بہت سی عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں لیکن سعدؓ کی بیوی بیوہ نہیں ہوئی۔“

یہ دراصل ایک ہجو تھی سیدنا سعدؓ کی۔ اور سیدنا سعدؓ ایک جانباز اور بہادر جرنیل تھے۔ وہ اپنی خوشی سے اس جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے بلکہ ان کی بیماری نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔ پھر بھی پوری جنگ کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔ فوج کو بڑی جانبازی سے لڑایا اور ساڑھے تین لاکھ کے لشکر جرار کو شکست فاش دے کر کسریٰ کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ جب یہ ہجویہ اشعار ان کے کان میں پڑے تو فرمایا: ”اے اللہ! اس شخص کی زبان کو میری ہجو کرنے سے روک دے۔“ ان کلمات کا آپ کی زبان سے نکلنا تھا کہ اچانک کہیں سے ایک تیر آیا اور اس کی زبان کٹ کر گر پڑی اور وہ شخص آگے ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

……◆……

﴿لاش کو زمین نگل گئی﴾

سیدنا خبیبؓ سرکار دو عالم ﷺ کے ایک جلیل القدر انصاری صحابی تھے۔ نہایت بہادر اور جانباز تھے۔ بدر واحد کے غازی، لیکن ۴ھ میں مقام رجیع میں کفار کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے چونکہ انہوں نے جنگ بدر میں کفار مکہ کے ایک مشہور سردار حارث بن عامر کو قتل کر دیا تھا، اس لیے اس کے بیٹوں نے انہیں خرید لیا اور مکہ مکرمہ سے باہر تنعیم میں لے جا کر ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے انہیں سولی پر چڑھا کر شہید کر دیا۔ کفار نے جب انہیں سولی پر چڑھایا تو انہوں نے چند وجد آفریں اشعار پڑھے جو کتابوں میں موجود ہیں۔

روایت میں ہے کہ سولی چڑھائے جانے کے وقت نے قاتلوں کے مجمع کی طرف دیکھا کر یہ دعا مانگی

﴿اللّٰھم احصھم عددا، واقتلھم بددا ولا تبق منھم احدا﴾

”اے اللہ! تو میرے ان تمام قاتلوں کو گن کر شمار کر لے اور ان سب کو ہلاک فرما دے اور ان میں سے کسی کو بھی باقی نہ رکھ۔“

چنانچہ ایک سال کے اندر اندر آپ کے قتل میں شریک اور راضی لوگ ہلاک و برباد ہو گئے۔ سیدنا خبیبؓ کو پھانسی دے دی گئی اور آپ کی لاش سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔ ادھر مدینہ طیبہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو مسلمان خبیب کی لاش کو سولی سے اتار کر لائے گا اس کے لیے جنت کا وعدہ کرتا ہوں۔ صحابہ کرامؓ جنت کے حصول کے لیے تو سب کچھ کر گزرنے والے تھے اور جنت کا وعدہ بھی پھر سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے۔ چشم آفتاب نے صحابہؓ سے زیادہ جہنم سے ڈرنے والا اور جنت کا حریص اور کوئی نہیں دیکھا۔ ہمارے اسلام میں تو صرف جنت ہی جنت ہے جہنم کے لیے ہمارے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ بس ایک تقریر کر لی تو سیدھے جنت میں۔ ایک وظیفہ

پڑھ لیا تو سیدھے جنت کے اعلیٰ درجے میں۔ کچھ لوگوں نے ایسے زندہ یا مردہ بزرگ پا لیے ہیں جن کا دامن تھام لینے کے بعد اب ان کے لیے جہنم کا کوئی خطرہ نہیں۔ کچھ لوگ اپنے کو اتنے خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر صبح و شام ان کے لیے جنت کے محلات ریزرو (Reserve) ہو رہے ہیں۔ پھر جہنم سے ڈرنے کی انہیں کیا ضرورت؟ کچھ لوگوں کو اسلام نے عالیشان سیاسی منصوبے دیے ہیں اور وہ قائدانہ اعزازات یعنی کسی سیاسی جماعت جس پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو، خواہ وہ امریکہ یا حکومت وقت کے ہاتھ میں بکاؤ مال ہو، کے زیر سایہ صرف ''آ گیا آ گیا'' یا ''زندہ باد'' کے نعرے لگا کر جنت کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اور بھی زیادہ آسان راستہ طے کر لیا۔ جگمگاتے ہوئے پنڈالوں میں تقریر کر کے کرتب دکھاؤ اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ۔ صحابہ کرامؓ کے ہاں ایسے شارٹ کٹ جنت کے راستے نہیں تھے۔ وہ تو جانوں کی قربانی دے کر جنت خریدتے تھے۔ لیکن یاد رکھیے اس قسم کے اسلام کی آخرت میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آخرت میں کام آنے والا اسلام وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہو۔

اسلام جب زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہوتا ہے تو پھر زندگی خدا و آخرت کی یاد میں ڈھل جاتی ہے اور بندہ اپنے رب سے روحانی سطح پر ملاقات کرتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا سے مشورہ کرتا ہے۔ ہر عمل اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے اور اس کی دنیا کی زندگی بھی آخرت کی زندگی میں ڈھل جاتی ہے۔ مگر جب اسلام کے ماننے والوں کو زوال ہوتا ہے تو اسلام کی روح غائب ہو جاتی ہے اور صرف اس کے دنیوی پہلو باقی رہ جاتے ہیں۔ اسلام اپنی سطح سے اتر کر ماننے والوں کی سطح پر آ جاتا ہے۔ نظر نہ آنے والے خدا سے خوف و محبت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے البتہ نظر آنے والے خداؤں کی تقدیس و تحمید زوروں پر شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لیے تنہائیوں میں رونا اور خاموشیوں میں اس سے گڑگڑانا باقی نہیں رہتا۔ البتہ لاؤڈ اسپیکر کے اوپر قرآن و اسلام کے ہنگامے خوب ترقی کرتے ہیں۔ نماز لوگوں کے دلوں کو روشن نہیں کرتی البتہ افطار و سحری کی دھوم خوب بڑھ جاتی ہے۔ عید میں شکر اور سجدہ کی روح نہیں ہوتی البتہ کپڑے اور میلے کے تماشے خوب رونق

پکڑتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خدا کے دین کو اپنی دنیادارانہ زندگی میں ڈھال لیا جاتا ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ کا جنت کا وعدہ فرمانا تھا کہ سیدنا زبیر بن العوامؓ اور مقداد بن الاسودؓ دو شہسوار صحابہ آگے بڑھے اور سیدنا خبیبؓ کی لاش لانے کی پیش کش کی۔ دونوں تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر راتوں کو سفر کرتے اور دن میں چھپتے ہوئے تنعیم پہنچے۔ دیکھا کہ تمیں کافر سولی کے پہرہ دار بن کر سو رہے ہیں۔

ان دونوں حضرات نے لاش کو سولی سے اتارا۔ دیکھا کہ چالیس دن گزر جانے کے باوجود لاش بالکل تر و تازہ تھی اور زخموں سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ ان دونوں نے گھوڑے پر لاش رکھ کر مدینہ طیبہ کا رخ کیا۔ یہ سب کچھ اگرچہ ان دونوں نے بڑا خفیہ کیا لیکن پھر بھی کافروں کو پتہ چل گیا۔ ستر کافروں نے ان دونوں کا پیچھا کیا۔ جب ان حضرات نے دیکھا کہ اب ہم گرفتار ہو جائیں گے تو ان دونوں نے اس جانثار صحابی سیدنا خبیبؓ کی لاش کو زمین پر رکھ دیا۔ لاش کو زمین پر رکھنا تھا کہ ایک دم زمین پھٹ گئی اور لاش کو نگل گئی۔ اور پھر زمین اس طرح برابر ہو گئی کہ پھٹنے کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ اسی وجہ سے سیدنا خبیبؓ کو "بلیع الارض" (جس کو زمین نگل گئی) کہا جاتا ہے۔ پھر ان دونوں حضرات نے ان کافروں سے فرمایا کہ اے کفار مکہ! ہم فلاں فلاں ہیں۔ اگر تم لوگوں سے ہو سکے تو ہمارا راستہ روک کر دیکھ لو ورنہ اپنا راستہ ناپو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ جلد ۲ میں اس واقعہ کو لکھ کر فرماتے ہیں کہ جب کفار مکہ نے دیکھا کہ خبیبؓ کی لاش ان کے پاس نہیں ہے تو وہ واپس مکہ لوٹ گئے۔

……◆……

انسانیت کا منشور آزادی

حج اسلام کے ان ارکان میں سے ایک رکن ہے جن کا کرنا فرض قرار دیا گیا۔ یہ رکن ۹ھ میں فرض ہوا اور آپ نے عام روایات کے مطابق زندگی میں ایک ہی حج کیا گویا یہ اعلان تھا اس بات کا کہ حج پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے۔ ۸/ذی الحجہ ۱۰ھ کو ترویہ کا دن تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے منیٰ میں ظہر، عصر، مغرب، عشا اور فجر پانچ نمازیں پڑھیں۔ پھر سورج جب قدرے بلند ہوا تو آپ نے ۹ ذی الحجہ کو وہاں سے کوچ فرمایا۔ آپ اپنی اونٹنی قصوا پر سوار میدان عرفات میں تشریف لائے۔ ایک لاکھ ۴۴ ہزار اور دوسری روایت کے مطابق ایک لاکھ ۴۰ ہزار صحابہ کرامؓ آپ کے ساتھ تھے۔ سارا میدانِ عرفات کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس میدان میں ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ کو آپ ﷺ نے ان صحابہ کرامؓ کے سامنے جو خطبہ ارشاد فرمایا اور حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے، وہ دراصل انسانیت کا سب سے پہلا منشور آزادی (Charter of Human Freedom) ہے۔

ایک لاکھ سے زائد انسانوں کا یہ اجتماع جن کی خوش نصیب آنکھیں حضور اقدس ﷺ کے چہرۂ انور پر مرکوز تھیں، پوری دنیا کو یہ اعلامیہ سنا رہا تھا کہ حق میں اتنی طاقت اور اتنا فروغ ہوتا ہے کہ ۲ھ میں جو تعداد تین سو سے کچھ زائد تھی اور قریش مکہ بدر میں اس کو دنیا سے ختم کرنے کے لیے اکٹھے ہو کر آئے تھے، وہ تعداد اب لاکھوں میں پہنچ گئی ہے اور ساری دنیا مل کر بھی شمع توحید کے ان پروانوں کو ختم نہیں کر سکتی۔ جس مکہ سے آپ کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ آپ کے خون کا پیاسا مکہ۔ وہ مکہ جس کو رات کی تاریکی میں اپنے ایک جاں نثار۔ (ابوبکرؓ) کے ساتھ آپ نے چھوڑا تھا اب اسی مکہ سے قریباً ۱۲ کلومیٹر دور ایک بے آب و گیاہ میدان میں ایک اونٹنی پر سوار تھے اور سوا لاکھ سے بھی زائد انسان آپ کے ارشادات عالیہ کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھے۔ اتنا بڑا اجتماع جو

ادب آمیز سکوت کے ساتھ آپ ﷺ کے سامنے کھڑا تھا، چشم فلک نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس اجتماع کے سامنے آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں آپ نے عظمت انسانیت کا اعلان فرمایا اور بتایا کہ تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں اور کسی کو سوسائٹی میں کمزور طبقہ پیدا کرنے اور پھر اس کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ آج اقوام متحدہ (United Nations) کی فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اقوام عالم کے سینکڑوں بزرجمہر انسانی حقوق کا چارٹر (Charter of Human Right) بناتے ہیں اور اس کے بنانے میں کروڑوں ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ اس پر لمبے چوڑے سیمنار کرتے ہیں لیکن پھر بھی اس کا نفاذ نہیں کر پاتے۔

صحرائے حجاز میں ایک نبی امی نے میدان عرفات میں اونٹنی کی پیٹھ پر بیٹھ کر انسانیت کو انسانی حقوق کا جو چارٹر دیا تھا۔ چودہ سو سال سے اس کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے ایسی آواز نہ اس سے پہلے کبھی سنی گئی اور نہ اس کے بعد کبھی سنی جائے گی۔

سرور کائنات فخر موجودات علیہ افضل الصلوات والتحیات نے فرمایا

"لوگو! مجھے امید نہیں کہ ہم تم پھر کبھی اس اجتماع میں اکٹھے ہو سکیں گے۔

دیکھو! تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت و آبرو ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں جیسے آج کے دن، اس شہر میں اور اس مہینہ میں حرام ہیں۔

سنو! تم اپنے پروردگار سے ملو گے تو وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں باز پرس کرے گا۔

خبردار میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگو۔

دیکھو، جاہلیت کی ہر بری رسم کو میں اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں۔ دور جاہلیت کے تمام خون کا بدلہ اپنے پیروں تلے رکھتا ہوں، اور سب سے پہلے میں خود ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا قصاص چھوڑتا ہوں جس نے بنی سعد کا دودھ پیا تھا اور جسے بنو ہذیل نے قتل کیا تھا۔

جاہلیت کے دور کے سارے سود بھی ختم کرتا ہوں اور سب سے پہلے میں اپنے

خاندان سے عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود چھوڑتا ہوں۔

لوگو! اپنی بیویوں کے بارہ میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ تم نے اللہ کی ذمہ داری پر انہیں اپنا بنایا ہے۔ اور اللہ کے کلام سے ان کے جسم کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔

عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو نہ آنے دیں اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ انہیں اچھی طرح کھلاؤ اور پہناؤ۔

دیکھو! میں نے تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑی ہے کہ اسے مضبوط پکڑ لو گے تو تم گمراہ نہیں ہوگے اور وہ اللہ کی کتاب ہے۔

لوگو! یقیناً نہ میرے بعد کوئی نبی آئے گا اور نہ تمہارے بعد کوئی امت آنے والی ہے۔

دیکھو! اپنے رب کی عبادت کرتے رہنا۔ پانچوں وقت نماز پڑھنا، ایک مہینہ روزے رکھنا، اپنے مال کی زکوٰۃ خوش دلی سے ادا کرتے رہنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ اپنے حاکموں کی اطاعت کرنا تا کہ تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو سکو۔

اور دیکھو! کل قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا، بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟ سب نے کہا: ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کے احکام پہنچا دیئے۔ اور حق رسالت ادا کیا اور ہماری بہتری اور خیر خواہی کی باتیں ہمیں پہنچا دیں۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کی پھر تین بار فرمایا:

''اے اللہ! گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا۔''

دیکھو! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس وقت حاضر نہیں ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سننے والوں سے زیادہ سمجھدار ہوں۔

یہ تھا وہ انسانیت کا منشور آزادی۔ ان میں جو اصول بیان کیے گئے، اب انہیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) پہلا اصول: Peaceful Co-existence کا ہے یعنی جیو اور جینے دو۔ اور یہی وہ بنیادی حق ہے جس کے لیے آج تیسری دنیا جدوجہد کر رہی ہے اور عالمی طاقتیں اسے یہ حق دینے پر تیار نہیں اور پیغمبر اسلام ﷺ نے چودہ سو سال پہلے انہیں یہ حق دیا۔

(۲) دوسرا اصول: سرکار دو عالم ﷺ نے انتقام کے چکر کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا جو افراد اور قوموں کی زندگی میں سب سے بڑی فساد کی جڑ ہے۔ آج کی اصطلاح میں یہ جذبۂ انتقام، توازنِ طاقت (Balance of Power) کے خوبصورت نام کی آڑ میں پرورش پاتا ہے اور اسے نزع سلاح (Disarmament) کی تحریک سے دبانے کی ساری کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔

(۳) تیسرا اصول: آپ نے عورتوں کے حقوق کی تاکید فرمائی۔ آج کی دنیا میں (Women's Liberty) یعنی آزادئ نسواں کی تحریک کا خلاصہ بھی یہی ہے، مگر اس تحریک نے عورتوں کے فرائض پر دھیان نہیں دیا صرف حقوق سے روشناس کرایا ہے، اسی لیے مغرب کی میکانکی زندگی میں ازدواجی رشتے اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔ آپ نے مرد اور عورت دونوں کے حقوق کی وضاحت کر دی اور بتا دیا کہ عورت سے عفت و عصمت اور وفاداری کا مطالبہ کرنا مرد کا حق ہے۔

(۴) چوتھا اصول: اس خطبہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے تصورِ آخرت کو یاد دلایا جو اسلامی عقیدہ کی اساس ہے۔ اگر کوئی فرد یا معاشرہ خود کو محاسبہ (Accountabilty) سے آزاد سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس سے ظلم و شر کے سوا کچھ سرزد نہیں ہوگا اور اسے کسی چیز کی دہائی نہیں دی جا سکتی۔ آج کی اصطلاح میں (Chauvinism) کہا جاتا ہے۔ ایک خدا ترس سوسائٹی میں ظلم و جبر پنپنے کے لیے مشکل ہی سے سازگار ماحول مل سکتا ہے۔

(۵) پانچواں اصول: آپ نے اتفاق و اتحاد کی تعلیم فرمائی کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا۔

(۶) چھٹا اصول: اس میں فرسودہ روایات کی بیخ کنی کر کے ایک صحت مند سوچ کی انقلاب کی دعوت دی گئی ہے اور صاف اعلان فرمایا کہ جاہلی رسمیں منسوخ کی جائیں یہ Radicalism کی بنیاد ہے۔

(۷) ساتواں اصول: سود کی مخالفت کر کے آپ نے اقتصادی اور معاشی زندگی سے استحصال کا خاتمہ کر دیا۔

(۸) آٹھواں اصول: تمام اہل اسلام کو کتاب اللہ کی طرف بلایا جو اسلامی معاشرہ کا بنیادی دستور ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ بھی واضح فرما دیا۔ گویا اس دستور میں ترمیم کی گنجائش نہیں۔

(۹) نواں اصول: ارکان اسلام کی ادائیگی کی تلقین فرما دی۔

(۱۰) دسواں اصول: حاکمان وقت کی اطاعت کی تلقین سے یہ مراد ہے کہ نا واجبی آرزو کے مسائل اور سیاسی خلفشار پیدا نہ ہو۔ اولوالامر کا انتخاب جو کہ جمہوری طریقہ پر ہوتا تھا، اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے، مگر اس کی حکومت کو بدنظمی اور انتشار کا شکار نہ بنایا جائے۔

آخر میں سرکار دو عالم ﷺ نے یہ بھی فرما دیا کہ انسانی حقوق کے اس چارٹر کو دنیا کے کونے کونے میں عام اور شائع کر دیا جائے تا کہ ساری انسانیت اپنے حقوق پہچان لے اور اس کے حصول کی جدوجہد اور حصول کے بعد اس کی حفاظت کرے۔ اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی﴾

”آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتوں کو تمہارے لیے تمام کر دیا۔“

حق تعالیٰ شانہ نے تکمیل دین اور اتمام نعمت کی خوشخبری دے کر یہ بتایا کہ روئے زمین پر خلافت الٰہیہ کا نادر نمونہ پیش کرنے والی ہے۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی مدت میں زندگی کے ہر دائرے میں عظیم الشان خدمات کے ایسے انبار لگا دیئے جن کی کوئی مثال نہ پہلے موجود تھی اور نہ بعد میں سامنے آ سکی۔ عالم انسانیت میں اس سے پہلے بھی

بہت انقلاب آ چکے تھے مگر ساتویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے سے جس انقلاب کی ابتداء ہوئی تھی اور حجۃ الوداع پر اس کی تکمیل ہوئی وہ ہر نقطۂ نگاہ سے یگانہ و نادیدہ تھا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے قول کے مطابق ایک نئے نظام، نئی شریعت اور نئے عالم کا آغاز ہو رہا تھا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''زمانہ ہر پھر کر آج پھر اسی نقطے پر آ گیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کیے تھے۔''

غور فرمایئے کہ تاریخ عالم میں جو نیا دور شروع ہو رہا تھا اس کی تعبیر کے لیے اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی کہ زمانہ پھر اس جگہ آ گیا جب اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق فرمائی تھی۔

* * *

﴿خوف آخرت﴾

امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ سلیمان بن عبدالملکؒ کے انتقال کے بعد مسند آرائے خلافت ہوئے۔ اس سے قبل آپ مدینہ منورہ کے گورنر رہ چکے تھے۔ گویا آئین جہاں بانی سے بخوبی واقف و آشنا تھے۔ یہ ماں کی طرف سے فاروقی اور باپ کی طرف سے اموی تھے۔ نہایت ناز و نعم میں پرورش پائی تھی لیکن حکومت کے بار دوش کے بعد شاہی فقیری میں تبدیل ہو گئی۔

شہزادے تو تھے ہی لیکن اس کے ساتھ بڑے نفاست پسند بھی تھے۔ ایک بار جو لباس پہنتے اس کو دوبارہ استعمال نہ کرتے۔ مدینہ طیبہ کی گورنری پر مامور ہوئے تو تیس اونٹوں پر ان کا ذاتی سامان لدا ہوا تھا۔

ایک بار خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ساتھیوں کے سامان پیچھے رہ گئے۔ اس وجہ سے شاہی سواری پیچھے ٹھہر گئی جن کے سامان روانہ ہو چکے تھے وہ آ رہے تھے لیکن جن کے سامان روانہ نہ ہوئے تھے، ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات پر عمر بن عبدالعزیزؒ کو آخرت یاد آ گئی اور آپ فرط تاثر سے رو پڑے۔ خلیفہ عبدالملکؒ نے رونے کا سبب پوچھا۔ فرمایا

"کل قیامت کے دن بھی ایسا ہی ہوگا۔ جس نے یہاں سے کچھ بھیجا ہوگا اُسے تو وہاں ملے گا اور جس نے نہ بھیجا ہوگا وہ محروم رہے گا۔"

بس اسی فکر نے دل کی دنیا تبدیل کر دی اور پھر موت تک آخرت کی یاد سامنے رہی۔

قرآن حکیم نے اسی لیے کہا ہے

﴿یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ماقدمت لغد، واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون﴾

> ”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھتا رہے کہ کل (قیامت کے دن) کے لیے اس نے کیا سامان (آگے) بھیجا ہے۔ (پھر سن لو!) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھتا ہے۔“

چونکہ دل کی دنیا تبدیل ہو چکی تھی، لہٰذا خلافت کی ذمہ داری اٹھانے کے بعد لوگوں کو مسجد میں جمع کر کے خطبہ دیا۔ فرمایا

> ”لوگو! بغیر اس کے کہ مجھ سے رائے طلب کی جاتی یا میں اس کا طالب ہوتا یا عام مسلمانوں سے مشورہ لیا جاتا، مجھ پر خلافت کا بار ڈال دیا گیا، لہٰذا تمہاری گردنوں میں میری بیعت کا جو قلادہ ہے اسے میں خود تمہاری گردنوں سے نکال دیتا ہوں۔ تم جسے چاہو اسے اپنا خلیفہ بنالو۔“

جب خلیفۂ وقت خود اپنی طرف سے ایسی پیش کش کر دے تو لوگ ایسے حکمران کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ ہم نے آپ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ ہم آپ کی خلافت سے راضی ہیں۔

جب سب لوگوں نے آپ کی خلافت کی توثیق کر دی تو آپ نے پھر لوگوں کو تقویٰ، موت کی یاد اور آخرت کی فکر کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد فرمایا:

> ”لوگو! جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اس کی اطاعت واجب ہے اور جو شخص اس کی نافرمانی کرے اس کی فرمانبرداری جائز نہیں۔ میں بھی جب تک خدا کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت اور فرمانبرداری واجب نہیں ہے۔“

اسی مضمون کے خطبات سیدنا فاروق اعظمؓ اور سیدنا صدیق اکبرؓ نے خلافت کا بار اٹھانے کے بعد دیئے تھے۔

بار خلافت اٹھانے کے بعد تو فکر آخرت اور زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ ایک بار اپنے

فوجی افسر سلیمان کو لکھا:

> "خدا سے سب سے زیادہ اس شخص کو ڈرنا چاہیے جو اس مصیبت میں مبتلا ہو جس میں میں مبتلا ہوں۔ اگر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو خدا کے ہاں مجھ سے زیادہ مستحق عذاب اور ذلیل کوئی نہیں۔ میں اپنی اس حالت سے سخت فکرمند ہوں، اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہی فکر میری ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم جہاد پر جانے والے ہو۔ میرے بھائی! صف جنگ میں کھڑے ہونا تو خدا سے دعا کرنا کہ حق تعالیٰ شانہ مجھے شہادت عطا فرمائیں کیونکہ مجھے سخت حالت اور عظیم خطرہ درپیش ہے۔"

ان کی اہلیہ فاطمہ بیان کرتی ہیں کہ جو خود ایک خلیفہ کی بیٹی تھیں کہ آپ رات کی تنہائیوں میں رویا کرتے۔ میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو پہلے تو آپ نے ٹالنے کی پوری کوشش کی لیکن جب میں نے اصرار کیا تو فرمایا:

> "فاطمہ! میں اس امت کے ہر چھوٹے بڑے کا ذمہ دار ہوں اور ملک بھر میں بے کس، غریب محتاج اور فقیر و نادار پھیلے ہوئے ہیں۔ قیامت کے دن ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ دعویٰ کریں گے۔ اگر میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے کوئی عذر پیش نہ کر سکا تو انجام کیا ہوگا۔ اسی خوف سے مجھ پر گریہ طاری ہو جاتا اور میں راتوں کو اٹھ کر روتا ہوں۔"

ایک روز آپ کو خلافت سے پہلے کا اطمینان و فراغت کا زمانہ یاد آ گیا۔ اہلیہ سے فرمایا "ہمارا گذشتہ زمانہ کتنا راحت بخش اور خوش آئند تھا۔"

اہلیہ نے کہا: "آج تو آپ کو اس زمانہ سے کہیں زیادہ اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ اس وقت آپ صرف ایک صوبہ کے حاکم تھے اور آج پوری مملکت اسلامیہ آپ کے زیر اقتدار ہے۔ کوئی شخص روک ٹوک کرنے والا نہیں۔" اہلیہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر

آپ نے بڑے پر درد لہجے میں فرمایا:

"فاطمہ! تم صرف یہ دیکھ رہی ہو کہ میں ساری سلطنت کا فرمانروا ہوں۔ ذرا اس ذمہ داری کا بھی خیال کرو جو اس فرمانروائی کی وجہ سے مجھ پر آن پڑی ہے۔ میں روز جزا کے خوف سے لرزہ براندام رہتا ہوں۔

﴿انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم﴾
"اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو (اس کی پاداش میں)
ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔"

اس جواب میں ایسا درد اور سوز تھا کہ فاطمہ بھی بے اختیار رو پڑیں۔ اور خدا سے دعا کرنے لگیں کہ اے اللہ! ان کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔

قرآن حکیم کی تلاوت اور نماز کے وقت بھی آخرت کے خوف سے آپ کا دل معمور اور لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ بلکہ بتانے والے بتاتے ہیں کہ موت اور آخرت کے ذکر سے آپ اس طرح روتے جیسے کوئی جنازہ سامنے رکھا ہو۔

ایک مرتبہ اپنے ایک ساتھی سے قبر کے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر تم مردے کو تین دن کے بعد قبر میں دیکھو تو انس و محبت کے باوجود اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرو۔ تم قبر کو ایک ایسا گھر دیکھو گے جس میں خوش وضعی، خوش لباسی اور خوشبو کے بعد کیڑے رینگ رہے ہیں۔ پیپ بہ رہی ہے اور اس میں کیڑے تیر رہے ہیں۔ بدبو پھیل رہی ہے۔ کفن بوسیدہ ہو چکا ہے۔"

یہ کہتے کہتے آپ کی ہچکی بندھ گئی اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کی اہلیہ نے پانی چھڑکا تو ہوش میں آئے۔

ہم بھی روز تلاوت قرآن کرتے ہیں لیکن ہم پر اس کی تلاوت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ تلاوت کرتے تو ان آیات پر جن میں قیامت کا ذکر ہے، پڑھ کر تڑپ اٹھتے۔ چنانچہ ایک بار گھر والوں نے دیکھا کہ ان کی اہلیہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہیں۔ بھائیوں نے رونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ رات میں نے امیرالمومنین کو بڑی دل گداز

حالت میں دیکھا۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ آیت پڑھی کہ

> ﴿یوم یکون الناس کالفراش المبثوث وتکون الجبال کالعھن المنفوش﴾
>
> "جس دن انسان پراگندہ پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔

تو چیخے، پھر اچھلے اور اچھل کر اس طرح گرے کہ معلوم ہوا کہ دم توڑ رہے ہیں۔ پھر ایسے ساکن و ساکت ہوئے میں نے سمجھا کہ دم نکل گیا۔ ہوش میں آئے تو پھر نعرہ مارا۔ پھر اچھلے اور تمام گھر میں پھر پھر کر کہنے لگے۔ "ہائے وہ دن جس دن انسان پراگندہ پتنگوں کی طرح اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔" پھر گرے اور ایسے حالت ہو گئی کہ میں نے سمجھا کہ کام تمام ہو گیا یہاں تک کہ مؤذن نے فجر کی اذان دی تو ہوش میں آئے۔

مرض الموت میں بھی خوف آخرت دامنگیر رہا۔ مرض الموت میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک عجیب کیفیت تھی جس کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

خلیفہ سلیمان بن عبدالملکؒ نے آپ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا تو آپ کے بعد یزید بن عبدالملک کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ اس لیے جب آپ کو زندگی کی امید باقی نہ رہی تو اسے بلا کر ایک وصیت نامہ تحریر فرمایا جس میں لکھا:

> "میں یہ وصیت نامہ اس حالت میں لکھ رہا ہوں کہ مرض سے لاغر ہو گیا ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ خلافت کے بارہ میں خدا مجھ سے سوال کرے گا اور اس کا حساب لے گا اور میں اس سے کسی کام کو چھپا نہ سکوں گا۔"
>
> اگر خدا مجھ سے راضی ہو گیا تو میرے لیے کامیابی و کامرانی ہے۔ مجھے ایک طویل اور دردناک عذاب سے نجات مل جائے گی۔ اور اگر خدا مجھ سے ناراض ہوا تو میرے انجام پر افسوس ہے۔ میں اس خدا سے جس کے سوا اور کوئی خدا نہیں، دعا کرتا ہوں کہ مجھے اپنی

> رحمت سے جہنم کے عذاب سے نجات دے اور اپنی رضامندی سے جنت عطا فرمائے۔ تم کو تقویٰ اختیار کرنا چاہیے اور رعایا کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ میرے بعد تم بھی صرف تھوڑے ہی دن زندہ رہو گے۔ تم کو اس سے احتراز کرنا چاہیے کہ تم سے غفلت میں ایسی لغزش سرزد ہو جس کی تلافی نہ کر سکو۔"

آپ کی اہلیہ وفات کے سلسلہ میں یوں بیان کرتی ہیں کہ میں نے آپ سے کہا: "آپ سوئے نہیں ہیں۔ میں آپ کے پاس سے ہٹ جاؤں شاید آپ کو نیند آ جائے۔ یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں سے میں نے سنا کہ آپ بار بار اس آیت کی تلاوت کر رہے تھے۔

> ﴿تلک الدار الآخرة نجعلها للذین لا یریدون علواً في الارض ولا فساداً، والعاقبة للمتقین﴾
>
> "یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو زمین میں نہ تفوق چاہتے ہیں اور نہ فساد کرتے ہیں۔ اور عاقبت صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے۔"

اس کے بعد آپ نے گردن جھکالی اور کافی دیر تک کسی قسم کی حرکت دیکھنے میں نہ آئی۔ فرماتی ہیں کہ میں نے تیماردار خادم سے کہا جا کر دیکھو آپ کا کیا حال ہے؟ خادم آپ کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا۔ فاطمہ نے قریب جا کر دیکھا تو اللہ کا یہ محبوب بندہ جو ہر وقت اپنے دل میں آخرت کا خوف رکھتا تھا، دار آخرت کو کوچ کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس آفتاب کے غروب ہونے کے بعد امت مسلمہ میں بڑے چھوٹے ستارے تو نمودار ہوتے رہے لیکن پھر ایسا آفتاب طلوع نہ ہوا۔

محمد بن معبد کا بیان ہے کہ میں شاہ روم کے پاس گیا تو وہ نہایت مغموم حالت میں بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی حالت دریافت کی بولا تم کو معلوم نہیں مرد صالح کا انتقال ہو گیا۔ میں نے پوچھا وہ کون؟ اس نے کہا: عمر بن عبدالعزیزؒ۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اگر کوئی مردے کو زندہ کر سکتا تو وہ عمر بن عبدالعزیزؒ ہی ہوتے۔ مجھے اس راہب کی حالت پر

کوئی تعجب نہیں جس نے دنیا کی طرف سے اپنا دروازہ بند کر لیا ہو اور عبادت میں اپنے کو محو رکھتا ہو۔ مجھے اس شخص کی حالت پر تعجب ہے جس کے قدموں کے نیچے دنیا تھی اور اس نے اس کو پامال کر کے راہبانہ زندگی بسر کی۔

موجودہ دور میں ہے کوئی عوامی حکومت کا ایسا عوامی نمائندہ جو حکومت کو اللہ کی امانت سمجھ کر چلائے اور یوم آخرت کی جوابدہی کی اسے فکر ہو؟

……

﴿امر بالمعروف﴾

امام اوزاعیؒ ائمہ مجتہدین میں سے تھے۔ نہایت زاہد و متقی، ریاضت و عبادت میں ممتاز، زاہد شب زندہ دار اور عابد مرتاض۔ رات کا اکثر حصہ عبادت الٰہی میں گزرتا اور رات کی نماز میں اس قدر روتے کہ آنسو سے مصلی تر ہو جاتا۔ ایک روز ایک عورت آپ کی اہلیہ سے ملنے آئی۔ اس نے مصلی کے ایک کونے کو بھیگا ہوا دیکھا۔ پوچھا کیا اس پر بچے نے پیشاب کر دیا ہے۔ اہلیہ نے جواب دیا نہیں بلکہ شیخ کے آنسوؤں سے تر ہو گیا ہے۔

آپ کا یہ خشوع و خضوع اور سوز و گداز نتیجہ تھا آخرت کے استحضار کا۔ چنانچہ فرماتے کہ انسان عمر کی جتنی گھڑیاں گزار رہا ہے وہ سب قیامت میں اس کے سامنے ترتیب سے پیش کی جائیں گی۔ اس لیے دنیا میں زندگی کی جو ساعت خدا کی یاد سے غفلت میں گزرے گی اس پر انسان کو سخت حیرت ہوگی۔

ان سب باتوں کے باوجود آپ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے نہ چوکتے۔ عباسی خلیفہ منصور نہایت سخت گیر خلیفہ ہوا ہے۔ اس نے حضرۃ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام سفیان ثوریؒ پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ ایک بار اسی منصور نے آپ کو دربار میں بلا بھیجا۔ راستہ کی دوری کی وجہ سے آپ دیر سے پہنچے۔ خلیفہ نے کہا: آپ نے آنے میں دیر کی۔ میں کب سے آپ کا منتظر ہوں۔ آپ نے پوچھا: مجھے کس لیے یاد کیا ہے؟ کہا کچھ نصیحت کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ فرمایا میں تیار ہوں بشرطیکہ جو میں کہوں اسے تم بھول نہ جاؤ۔ اس نے کہا کہ جب میں نے خود ہی آپ کو اس کے لیے تکلیف دی ہے تو آپ کے ارشادات کیسے بھول سکتا ہوں؟ فرمایا ہو سکتا ہے کہ آپ اسے سن لیں لیکن اس پر عمل نہ کریں گے۔

منصور کے حاجب ربیعؒ کو آپ کا یہ انداز گفتگو برا لگا۔ اس نے آپ کو تنبیہ کرنا چاہی۔ لیکن منصور نے اسے روک دیا اور کہا کہ یہ درس و موعظت کی مجلس ہے، دربار شاہی

نہیں ہے۔ جب امام اوزاعی کو یہ یقین ہو گیا کہ اس وقت منصور میں نصیحت پذیری کا جذبہ موجود ہے تو آپ نے ایک ایسی تقریر فرمائی جس کا ایک ایک حرف خوف خدا، اندیشۂ آخرت اور تذکیر و ترہیب کے اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ نے منصور کو مخاطب کر کے فرمایا

> "سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب بندے کو خدا کے دین کی کوئی بات معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کو قبول کر کے اس کی قدر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے خدا کی ایک نعمت ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ اسے ٹھکرا کر اس کی ناقدری کرتا ہے تو وہ اس کے اوپر ایک حجت ہو جاتی ہے اور وہ اس طرح اپنے گناہوں میں اضافہ کر لیتا ہے اور اپنے کو خدا کے غضب کا مزید سزاوار بنا لیتا ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جو حاکم رعیت پر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور خود آرام کی نیند سوتا ہے اس پر خدا جنت حرام کر دے گا۔"

> "آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ لوگوں پر خدا اور بندوں کے حقوق نافذ کریں۔ ان کے درمیان انصاف کریں، ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کریں اور ان کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے دروازے پر پہرے دار ہوں اور لوگ آپ تک نہ پہنچ سکیں"

> "امیر المومنین! آپ سوچیے کہ اس شخص کا خدا کے ہاں کیا حال ہو گا جس نے لوگوں کے چہرے خون آلود کیے، ان کا لہو بہایا، ان کی بستیاں اجاڑیں، ان کو جلاوطن کیا۔"

> "امیر المومنین! سیدنا عمرؓ میں کتنا احساس ذمہ داری تھا۔ ان کے بارہ میں مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "اگر ایک بکری کا بچہ میری دیکھ بھال کے بغیر فرات کے کنارے مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ مجھ سے اس کی باز پرس ہو گی۔ تو پھر اس مظلوم کے بارہ

> میں آپ سے کتنی سخت باز پرس ہوگی جو آپ کے سامنے عدل سے محروم رہا۔''
>
> ''امیر المومنین! آپ پر ایک ایسی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اگر وہ زمین اور آسمانوں اور پہاڑوں پر ڈالی جاتی تو وہ اس کے اٹھانے سے انکار کر دیتے۔ مجھ سے یزید بن یزید فقیہِ شام نے بیان کیا ہے کہ سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک شخص کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر فرمایا۔ کچھ دنوں کے بعد دیکھا کہ وہ شخص گھر پر موجود ہے۔ آپ نے پوچھا: تم وصولی پر کیوں نہیں گئے؟ تم کو نہیں معلوم کہ تمہیں اس کام کا اجر جہاد کے برابر ملے گا؟ اس نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے یہ حدیث نبویؐ پہنچی ہے کہ قیامت کے دن ہر والی اور حاکم کو بلایا جائے گا اور اس کو آگ کے پل پر کھڑا کر دیا جائے گا جس کی وجہ سے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اور اس کے بعد وہ پھر واپس لایا جائے گا، اور اس سے حساب کتاب ہوگا۔ اگر اس نے اپنی ذمہ داری بخوبی انجام دی ہے تو بچ جائے گا ورنہ پھر وہ پل اس کو جہنم میں پھینک دے گا۔'' سیدنا عمرؓ نے یہ روایت سن کر ٹھنڈی آہ بھری اور فرمایا: افسوس عمرؓ کو بھی اس سے گزرنا پڑے گا۔''

امام اوزاعیؒ کی ان باتوں کا منصور پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ منہ پر رومال ڈال کر زاروقطار رونے لگا۔ اس کے اس طرح رونے نے امامؒ پر بھی گریہ طاری کر دیا۔ اس کے آنسو تھمے تو امامؒ نے پھر فرمایا:

> ''امیر المومنین! سب سے سخت چیز حق کا قیام ہے۔ اور اللہ کے ہاں سب سے معزز شی تقویٰ ہے۔ جو شخص خدا کی اطاعت کے ذریعہ عزت چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے سربلند کرتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور عزت کا خواہاں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ

اسے ذلیل اور پست کرتا ہے۔"

امام اوزاعیؒ اپنی نصائح ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ منصور نے پوچھا اب کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ فرمایا: "وطن۔" اگر آپ اجازت دیں۔ منصور نے اجازت دی اور عرض کیا: میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے ایسی قیمتی نصیحتیں کیں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور میری مدد کریں۔

منصور نے حکم دیا کہ آپ کی خدمت میں سفر خرچ پیش کیا جائے۔ آپ نے فرمایا:

﴿ما كنت لابيع نصيحتي بعرض الدنيا ولا بكلها﴾

"میں اپنی نصیحت کو دنیا کی ایک حقیر متاع بلکہ پوری دنیا کے عوض بھی فروخت نہیں کر سکتا۔

آج کس عالم میں حوصلہ ہے کہ ظالم و جابر حکمران کے سامنے اس طرح کی باتیں کرے۔ آج تو دنیا کی حقیر متاع کے عوض دین کی قیمتی متاع کو بیچا جاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا:

هداة الدين قد ضلوا   وقد بانت خسارتهم
يباع الدين بالدنيا   وما ربحت تجارتهم

……

عدل میں کوتاہی کا افسوس

امام ابو یوسفؒ امام ابو حنیفہؒ کے خاص شاگرد تھے۔ حدیث و فقہ میں اللہ تعالیٰ نے خاص مہارت عطا فرمائی تھی۔ آپ تین عباسی خلفاء ہادی، مہدی اور ہارون الرشید کے عہد میں قاضی القضاۃ (Chief Justice) رہے۔ آپ نے نہ تو کبھی اپنے عہدہ کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور نہ ہی عدل و انصاف سے کبھی چشم پوشی کی تھی۔ تین خلفاء کے عہد میں قاضی رہنے کے باوجود اور غرور و تمکنت کو کبھی قریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔ عہدۂ قضا پر متمکن ہونے سے قبل نہایت فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے اپنی معاشی تنگی کا حال بیان کیا۔ میں نے تسلی دی۔ جب ان کے پاس سے چلنے لگا تو دیکھا کہ مٹی کا ایک میلا سا برتن ان کے پاس رکھا ہوا ہے۔ وہ اتفاق سے میرے دامن سے لگ کر ٹوٹ گیا۔ برتن کا ٹوٹنا تھا کہ ان کے چہرے پر شکن آ گئی اور رنگ فق ہو گیا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے کہا: کیا بات ہے؟ فرمایا: یہی ایک برتن تھا جس سے میں اور میری والدہ وضو کرتے تھے اور اسی سے پانی بھی پیتے تھے۔ عبداللہ بن مبارکؒ ان کا یہ حال دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور کچھ رقم ان کو دی۔

منصب قضا میں فکر آخرت کا خاص احساس رہا۔ ہر ممکن کوشش فرماتے کہ فیصلہ نہایت عدل و انصاف سے ہو اور کسی فریق پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ اگر کبھی نادانستگی میں کوئی بھول چوک ہو گئی تو زندگی بھر اس پر متاسف رہے۔

عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر آپ نے کبھی کسی کی رو رعایت نہیں کی تھی اور کسی کے جاہ و جلال سے کبھی متاثر نہیں ہوئے تھے۔ تمام فیصلے قرآن و سنت کی روشنی میں کرتے۔ عباسی خلفاء خصوصی طور پر ہارون الرشید آپ کے علم اور تقویٰ سے بہت متاثر تھا۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید قاضی ابو یوسفؒ کے پہلو میں بیٹھ کر مختلف مقدمات سن

رہا تھا۔ کیونکہ خلیفہ ہفتہ میں کچھ خود بھی قاضی ابو یوسفؒ کے ساتھ بیٹھ کر مقدمات سنا کرتا تھا۔ اس روز بھی خلیفہ خود کرسی عدالت پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نصرانی بڈھے نے خود ہارون الرشید کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ دعویٰ یہ تھا کہ فلاں باغ میرا ہے جس پر خلیفہ نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔

کہتے ہیں کہ موجودہ دنیا میں لوگوں کو بہت آزادی ہے اور جمہوریت نے تو غلام و آقا، اور مالک اور نوکر کو ایک صف کھڑا کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے مالک اور ملازم کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہو اگرچہ یہ بھی غلط ہے، لیکن بادشاہ اور رعایا کو ایک صف میں ابھی تک دنیا کے کسی ملک میں کھڑا نہیں کیا گیا۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے ایک نصرانی بڈھے کو یہ اجازت دی کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کے خلیفہ پر اس کی موجودگی میں استغاثہ دائر کرتا اور خلیفہ کو جرأت نہیں کہ وہ اس کو کچھ بول سکے۔ آج تو صوبے کے گورنر کے خلاف دعویٰ دائر نہیں ہو سکتا، صدر مملکت تو بڑی چیز ہے۔

قاضی ابو یوسفؒ فریقین کے دعوے اور ان کے بیانات ہارون الرشید کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ جب اس مقدمہ کی باری آئی تو انہوں نے خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کیا اور کہا: ”آپ کے اوپر دعویٰ ہے کہ آپ نے مدعی کے باغ پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ مدعی عدالت میں موجود ہے حکم ہو تو اس کو حاضر کیا جائے۔

خلیفہ کو قاضی صاحب کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی کیونکہ عدلیہ اس زمانے میں آزاد تھی۔ آج کل کی طرح مجبور و مقہور نہ تھی۔ آج تو عدلیہ اگر جرأت کر کے کوئی فیصلہ حکومت کے خلاف کر دے تو پوری عدلیہ کو تنقید کا ہدف بنا دیا جاتا ہے۔ خلیفہ نے مدعی کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ بڈھا نصرانی سامنے آیا تو قاضی صاحب نے پوچھا: ”تمہارا دعویٰ کیا ہے؟“ اس نے کہا: میرے باغ پر امیر المومنین نے قبضہ کر لیا ہے جس کے خلاف میں دادرسی چاہتا ہوں۔

امام صاحب نے ہارون سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”آپ اس دعویٰ کے جواب میں کچھ کہنا چاہتے ہیں!؟“ ہارون نے کہا: ”میرے قبضہ میں اس شخص کی کوئی چیز نہیں۔ اور نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے۔ قاضی صاحب نے مدعی سے اس کے دعوے کے

ثبوت کے لیے دلیل طلب کی۔ اس نے کہا ''امیر المومنین سے قسم لے لی جائے۔''

ہارون نے قسم کھا کر کہا کہ یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے دیا تھا۔ میں اس کا مالک ہوں۔ بڈھے نے یہ سنا تو غصے میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا کہ جس طرح کوئی ستو گھول کر پیتا ہے اسی طرح اس شخص نے بآسانی قسم کھائی ہے۔ ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ ہتک آمیز الفاظ سن کر ہارون کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا، لیکن قاضی ابو یوسفؒ کی دینی جلالت کے باعث وہ آپ کے عادلانہ فیصلے کے خلاف چوں بھی نہ کر سکا، لیکن قاضی ابو یوسفؒ اس کے بعد جب اس واقعہ کا ذکر فرماتے تو آخرت کی باز پرس سے کانپ اٹھتے تھے۔ فرماتے تھے:

> ''میں اپنے اندر سخت اندوہ و غم اور اذیت محسوس کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے، قیامت میں اللہ تعالیٰ کے حضور اس کا کیا جواب دوں گا۔'' لوگوں نے پوچھا: ''آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی؟ اور آپ اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے؟ کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں اتنی بڑی سلطنت کے خلیفہ کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا۔'' فرمایا ''تم لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے۔ پھر افسوس کے لہجے میں فرمایا ''مجھے تکلیف اور کوفت اس کی ہے کہ میں نے ہارون سے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ آپ کرسی سے اتر جائیے اور جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہو جائیے یا پھر اجازت دیجئے کہ اس کے لیے بھی کرسی لائی جائے۔''

اتنا پاکدامن ہونے کے باوجود تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ انتقال کے وقت زبان پر یہ کلمات تھے

> ''بار الہا! تو جانتا ہے کہ میں نے تیرے بندوں کے درمیان کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے میں کبھی خود رائی سے کام نہیں لیا اور نہ خلاف

واقعہ کوئی فیصلہ کیا۔ میں نے ہمیشہ تیری کتاب اور تیرے رسولؐ کی سنت کے موافق فیصلہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاک دامن رہا اور کبھی ایک درہم جان بوجھ کر حرام کا نہیں کھایا۔“

یہ وہ لوگ ہیں جن کی باتیں ہمارے لیے نمونہ اور مثال ہیں نہ کہ مغرب کے ان مفکرین کی جن کا کوئی کردار نہ تھا۔ نہ ان کا خدا پر یقین تھا اور ان میں فکر آخرت تھی۔

……

قبر کی یاد

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ ایک مرتبہ ایک جنازہ کے ساتھ تشریف لے گئے۔ قبرستان میں پہنچ کر ایک طرف بیٹھ گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ کسی شخص نے عرض کی، امیر المومنین! آپ اس جنازہ کے ولی تھے، آپ ہی علیحدہ بیٹھ گئے؟ فرمایا: ہاں، مجھے ایک قبر نے آواز دے دی اور مجھ سے یوں کہا: اے عمرؒ! تو مجھ سے یہ نہیں پوچھتا کہ میں ان آنے والوں کے ساتھ کیا کیا کرتی ہوں؟ میں نے کہا تو بتا کہ کیا کرتی ہے؟

قبر ہر ایک کو پکارتی ہے۔ ہر ایک کو سندیسہ دیتی ہے، ہر ایک کو ہر روز اپنے بارہ میں بتاتی ہے، وہ نہایت فصیح اور صاف آواز کے ساتھ یہ اعلان کرتی ہے کہ اے آدم کے بیٹے! تو مجھے بھول گیا۔ میں تنہائی کا گھر ہوں۔ اجنبیت کا گھر ہوں، میں وحشت کا گھر ہوں، میں کیڑوں کا گھر ہوں، میں نہایت تنگی کا گھر ہوں، مگر اس شخص کے لیے جس پر اللہ تعالیٰ مجھے وسیع بنا دے۔'' لیکن ہم نے اس آواز کے لیے اپنے کانوں کو بہرہ بنا لیا ہوا ہے۔ دنیا کی ریل پیل نے ہمیں اس آواز کو سننے کی فرصت ہی نہیں دی، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ ان جیسے کئی بزرگ اس آواز کو سنتے ہیں۔ چنانچہ جب عمر بن عبدالعزیزؒ نے قبر سے پوچھا کہ بتا تو کیا کرتی ہے؟ اس نے جواب دیا:

> ''میں آنے والوں کے کفن پھاڑ دیتی ہوں، بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہوں، خون سارا چوس لیتی ہوں، گوشت کھا لیتی ہوں۔''
>
> اور بتاؤں کہ آدمی کے جوڑوں کے ساتھ کیا کرتی ہوں؟ مونڈھوں کو بانہوں سے جدا کر دیتی ہوں اور سرینوں سے رانوں کو جدا کر دیتی ہوں، اور رانوں کو گھٹنوں سے اور گھٹنوں کو پنڈلیوں سے اور پنڈلیوں کو پاؤں سے جدا کر دیتی ہوں۔''

یہ فرما کر سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ رونے لگے اور فرمایا:

''دنیا کا قیام بہت ہی تھوڑا ہے اور اس کا دھوکہ بہت زیادہ ہے۔ اس میں جو عزیز ہے وہ آخرت میں ذلیل ہے۔ اس میں جو دولت والا ہے وہ آخرت میں فقیر ہے۔ اس کا جوان بہت جلد بوڑھا ہو جائے گا۔ اس کا زندہ بہت جلد مر جائے گا۔ اس کا تمہاری طرف متوجہ ہونا تم کو دھوکہ میں نہ ڈال دے حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کتنی جلدی منہ پھیر لیتی ہے۔ اور بے وقوف وہ ہے جو اس کے دھوکہ میں پھنس جائے۔''

''کہاں گئے اس کے وہ دلدادہ جنہوں نے بڑے بڑے شہر آباد کیے، بڑی بڑی نہریں نکالیں، بڑے بڑے باغ لگائے اور بہت تھوڑے دن رہ کر سب کو چھوڑ کر چل دیئے۔ وہ اپنی صحت وتندرستی سے دھوکہ میں پڑے کہ صحت کے بہتر ہونے سے ان میں نشاط پیدا ہوا اور اس سے گناہوں میں مبتلا ہوئے۔ بخدا! وہ لوگ دنیا میں مال کی کثرت سے قابل رشک تھے، باوجودیکہ مال کے کمانے میں ان کو رکاوٹیں پیش آتی تھیں مگر پھر بھی خوب کماتے تھے۔ ان پر لوگ حسد کرتے تھے لیکن وہ بے فکر مال کو جمع کرتے رہتے تھے اور اس کے جمع کرنے میں ہر قسم کی تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے تھے، لیکن اب دیکھو کہ مٹی نے ان کے بدنوں کا کیا حال کر دیا اور خاک نے ان کے بدنوں کو کیا بنا دیا۔ کیڑوں نے ان کے جوڑوں اور ہڈیوں کا کیا حال بنایا۔ وہ لوگ دنیا میں اونچی اونچی مسہریوں پر اونچے اونچے فرش اور نرم نرم گدوں پر نوکروں اور خادموں کے درمیان آرام کرتے تھے، عزیز واقارب، رشتہ دار اور پڑوسی ہر وقت دلداری کو تیار رہتے تھے، لیکن اب کیا ہو رہا ہے، ان سے آواز دے کر پوچھو کہ کیا گزر رہی ہے؟ غریب اور امیر سب ایک میدان میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مالدار سے پوچھو کہ اس کے مال

> نے کیا کام دیا۔ اس کے قصر سے پوچھ کہ اس کے قصر نے کیا نقصان کیا۔ کہاں ہیں ان کے وہ خیمے اور کمرے جن میں آرام کرتے تھے۔ کہاں ہیں ان کے وہ مال اور خزانے جن کو جوڑ جوڑ کر رکھتے تھے۔ ان کے حشم و خدم نے ان کو قبر میں کھانے کے لیے کوئی توشہ بھی نہ دیا اور ان کی قبر میں کوئی بستر بھی نہ بچھایا۔ کوئی تکیہ بھی نہ رکھ دیا، زمین ہی پر ڈال دیا۔ آہ! اب وہ بالکل اکیلے پڑے ہیں، اندھیرے میں پڑے ہیں، ان کے لیے اب رات دن برابر ہیں، دوستوں سے مل نہیں سکتے اور کسی کو اپنے پاس بلا نہیں سکتے۔"

کتنے نازک بدن مرد، نازک بدن عورتیں آج ان کے بدن بوسیدہ ہیں، ان کے اعضا ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ آنکھیں نکل کر منہ پر گر گئیں۔ گردن جدا ہوئی پڑی ہے۔ منہ میں پانی پیپ وغیرہ بھرا ہوا ہے اور سارے بدن میں کیڑے چل رہے ہیں۔ وہ اس حال میں ہیں کہ ان کی بیواؤں نے دوسرے نکاح کر لیے اور وہ مزے اڑا رہی ہیں۔ بیٹوں نے مکانوں پر قبضہ کر لیا۔ وارثوں نے مال تقسیم کر لیا۔ مگر بعض خوش نصیب ایسے بھی ہیں جو اپنی قبروں میں بھی مزے اڑا رہے ہیں۔ تر و تازہ چہروں کے ساتھ راحت و آرام میں ہیں۔

> "اے انسان اس دنیا کے ساتھ آخر کس شی نے تجھے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ تجھے امید ہے کہ یہ کمبخت دنیا تیرے ساتھ رہے گی۔ کیا تجھے یہ امید ہے کہ تو اس دنیا کے گھر میں ہمیشہ رہے گا۔ تیرے یہ وسیع و عریض مکان، تیرے باغوں کے پکے ہوئے پھل، تیرے نرم و گرم بستر، تیرے گرمی و سردی کے جوڑے، یہ سب کے سب ایک دھرے رہ جائیں گے، جب ملک الموت آ کر مسلط ہو جائے گا۔ تیری کوئی شی اس کو نہ ہٹا سکے گی۔ پسینوں پہ پسینے آنے لگیں گے، پیاس کی شدت بڑھ جائے گی اور جان کنی کی سختی میں تو کروٹیں بدلتا رہ جائے گا۔"

"افسوس صد افسوس، اے وہ شخص جو باپ کی آنکھ بند کر رہا ہے، آج مرتے وقت اپنے بھائی کی آنکھ بند کر رہا ہے، اپنے بیٹے کی آنکھ بند کر رہا ہے۔ ان میں کسی کو نہلا رہا ہے، کسی کو کفن دے رہا ہے، کسی کے جنازے کے ساتھ جا رہا ہے، کسی کو قبر کے گڑھے میں ڈال رہا ہے۔ کل کو تجھے بھی یہ سب کچھ پیش آنا ہے۔"

کہتے ہیں کہ اس وقعہ کے بعد ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا انتقال ہو گیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

اس بارہ میں خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کا شعر ہے ؎

دفن خود صدہا کیے زیر زمیں پھر بھی مرنے کا نہیں حق الیقین
تجھ سے بڑھ کر بھی کوئی غافل نہیں کچھ تو عبرت چاہیے نفس لعین

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

یہ موت ہی ہے جو انسان کی تمام لذتوں کو ختم کر دیتی ہے۔ تمام مصروفیتوں کو مٹا دیتی ہے۔ تمام رشتوں کو منقطع کر دیتی ہے، تمام تعلقات کو توڑ دیتی ہے، تمام حرصوں کو ختم کر دیتی ہے اور تمام جلوتوں سے انسان کو خلوت نشین بناتی ہے۔ اکیلا اور بالکل اکیلا کر دیتی ہے ؎

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے
تہ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے

◆

مقبول دعائیں

عروہؒ سرکار دو عالم ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور عشرہ مبشرہ کے صحابی سیدنا زبیر بن العوامؓ کے صاحبزادے تھے۔ زاہد اور پاکباز اور عابد مرتاض۔ ان کی نگاہ میں دولت دنیائے دوں اور چند روزہ تنعم و عیش کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دولت دنیا کے لیے کبھی دعا نہ مانگی تھی۔ ایک مرتبہ سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ کے عہد خلافت میں عروہؒ اور ان کے بھائی عبداللہؓ، مصعب بن زبیرؓ اور عبدالملک بن مروانؒ چاروں مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں جہاں دعاؤں کو شرف قبولیت عطاء ہوتا ہے اور آرزوؤں اور تمناؤں کو حقیقت کا جامہ پہنایا جاتا ہے۔ لہٰذا اپنی آرزوئیں اپنے خدا کے سامنے پیش کریں۔ سب حضرات نے اسے پسند کیا۔

سب سے پہلے عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا:

”میری آرزو یہ ہے کہ میں حرم کا بادشاہ ہو جاؤں اور مجھے تخت خلافت مل جائے۔“

ان کے بھائی مصعب نے کہا:

”میری تمنا ہے کہ قریش کی دو حسین عورتیں عائشہ بنت طلحہؓ اور سکینہ بنت حسینؓ میرے نکاح میں آجائیں۔“

عبدالملک بن مروانؒ نے کہا:

”میری تمنا یہ ہے کہ میں کل روئے زمین کا بادشاہ بن جاؤں اور امیرالمومنین سیدنا معاویہؓ کا جانشین بنوں۔“

سب سے آخر میں عروہ بن زبیرؒ نے کہا:

”مجھے تمہاری ان خواہشات میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ میں صرف

دنیا میں زہد اور علم اور آخرت میں کامیابی چاہتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے ان چاروں کی دعا قبول فرمائی۔ چنانچہ عبداللہ سات برس تک ملک عرب کے خلیفہ رہے۔ مصعبؓ کے عقد میں دونوں خواتین آئیں۔ عبدالملکؒ سندھ سے لے کر چین کا فرمانروا ہوا اور سیدنا امیر معاویہؓ کی قائم کردہ سلطنت کا وارث بنا۔ اور عروہؒ کو خاصانِ خدا کا مرتبہ ملا۔ اور علم و زہد اُن کا امتیازی نشان ہوا۔

……

﴿صحبت کے اثرات﴾

مشہور قول ہے کہ آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر کسی کے دوست برے ہوں تو اس شخص سے نیکی کی توقع عبث ہے۔ آوارہ گرد اور بد سیرت لوگ کچھ تو اپنی کمزوری سے بگڑتے ہیں اور کچھ ان کے بگاڑ میں دوستوں اور مشیروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں ہے۔

﴿فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین﴾

”نصیحت حاصل ہو جانے کے بعد ظالم لوگوں کے پاس بیٹھو بھی نہ۔“

یعنی اپنے ماحول کو پاکیزہ رکھو۔ بروں کی صحبت سے بچو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی برائی کے جراثیم تمہاری روحانی اور اخلاقی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیں۔ آدمی نیکی کا اثر دیر سے قبول کرتا ہے لیکن برائی اور خرابی کو بہت جلد اپنے اندر سموتا ہے۔

تاریخ عالم پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں اچھے حکمرانوں نے خوشامدی اور بد کردار لوگوں کو اپنا حاشیہ نشین نہیں رکھا۔ سکندر رومی شاید اتنا اولوالعزم بادشاہ نہ ہوتا اگر ارسطو جیسا حکیم اور دانشور اس کا ساتھی نہ ہوتا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے مصاحب متقی اور پرہیزگار لوگ تھے۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے بھی اپنے اردگرد علماء اور نیک لوگوں کو رکھا ہوا تھا جو اسے ہر غلطی پر ٹوکتے رہتے تھے۔ اور وہ گوشِ حق نیوش سے ان کی باتوں کو سنتا۔ اللہ نے بڑا دردمند اور نرم دل دیا تھا۔ قیامت کے مؤاخذہ کے ذکر سے وہ بے اختیار رونے لگتا۔ کبھی کبھی تو دھاڑیں مار مار کر روتا تھا۔ اسے یہ بات کبھی نہ بھولتی تھی کہ حکومت ایک پہاڑی ندی ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے ابل پڑتی ہے۔ پھر جو سمٹ جاتی ہے تو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ چنانچہ اس نے کبھی اپنے دماغ کے غبارے میں ہوا نہ بھرنے دی۔ ایک روز ابن السماکؒ نے ہارون سے پوچھا:

”امیر المومنین! کہاں ٹھکانہ بنانے کا ارادہ ہے؟ جہنم میں یا جنت

ہیں؟" یہ الفاظ سن کر ہارون پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ اتنا رویا کہ اس کی داڑھی بھیگ گئی۔ ہارون کی یہ حالت دیکھ کر اس کے وزیر فضل بن ربیع نے سیاست کے عام مہروں اور بڑے لوگوں کے عام خوشامدیوں کی طرح ابن السماک سے کہا:

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ امیر المومنین کے جنت میں داخل ہونے میں کیا شبہ ہے؟" صاحبِ اقتدار آج کے ہوں یا ماضی کے، ان کے دنیادار دوست انہیں باور کراتے ہیں کہ ان سے زیادہ جنت کا مستحق اور کوئی نہیں۔

فضل بن ربیع کی بات سن کر ابن السماک نے فرمایا:

"امیر المومنین! قیامت کے دن فضل آپ کے ساتھ نہ ہوگا۔ وہاں آپ کو اکیلے حساب دینا ہوگا۔"

یہ سن کر ہارون اور زیادہ بے قرار ہو گیا اور زار و قطار رونے لگا۔

یہ تھے اس زمانے کے بادشاہ جو آج کل کے جمہوریوں سے کروڑوں درجہ بہتر تھے۔

……

عدالت کا محاسبہ

مسلمانوں کی عدالتیں اپنے فرائض منصبی کی تکمیل میں ہمیشہ بڑی ذمہ دار رہی ہیں، کیونکہ فیصلہ کرنے والے پر ہمیشہ خوف خدا طاری رہتا تھا۔ جس عدالت کے قاضی کے دل میں خدا کا خوف ہو وہ پھر نہ تو رشوت لیتا ہے، نہ جانبداری کا مظاہرہ کرتا ہے اور نہ ہی کسی کے دباؤ میں آتا ہے۔ اس قسم کی مثالوں سے مسلمانوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

جس زمانے ظہیر الدین بابر نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی اس زمانہ میں سندھ پر شاہ حسن ارغون حکومت کرتا تھا۔ یہ ۹۲۸ھ کا واقعہ ہے۔ ۳۴ سال تک وہ سندھ پر حکومت کرتا رہا، وہ نہایت خوف خدا رکھنے والا حکمران تھا خصوصی طور پر عدل و انصاف کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرنے والا تھا۔ وہ انتظامیہ ہی کا نہیں عدلیہ کا بھی احتساب کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عدلیہ کا احتساب کرنے کے لیے شاہ حسن نے ایک سوداگر سے فوجی گھوڑے خریدے اور اپنی سلطنت کے ایک خاص علاقے میں جا کر بیٹھ گیا۔ سوداگر نے گھوڑوں کے دام مانگے تو معلوم ہوا کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور شاہ کی نیت خراب ہے اور وہ سوداگر کو رقم دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ رقم بہت بڑی تھی اس وجہ سے سوداگر نہایت پریشان تھا۔ چار و ناچار اس نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ لوگوں نے بہت ڈرایا کہ حکومت کے خلاف دعویٰ دائر کرنے کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے اور وہ بھی صدر مملکت کے خلاف، لیکن سوداگر کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

آج کل تو صدر مملکت کیا وزیر اعظم اور عام وزراء حکومت کا کروڑوں کا ٹیکس اور قرض ہڑپ کر جاتے ہیں اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں ہوتا بلکہ الٹا اعتراض کرنے والوں کو جیل کی کال کوٹھری میں ٹھونس دیا جاتا ہے لیکن اس زمانہ میں جبکہ عدلیہ خوف خدا کے تحت یہ کام کرتی تھی وزراء تو ایک طرف خود صدر مملکت بھی سلطنت کے کسی فرد کی ایک پائی نہیں کھا سکتا تھا۔ عدالت اس سے فوراً اگلوا لیتی تھی۔

عدالت نے شاہ حسن ارغون کو فوراً سمن جاری کر دیئے۔ اور اسے عدالت میں طلب کر لیا۔ وقت مقررہ پر بادشاہ عدالت میں پہنچا اور اسے عدالت میں طلب کیا۔ دوسری طرف سے سوداگر بھی حاضر ہوا۔ سوداگر کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ ملزموں کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہے۔ بادشاہ کی کس مپرسی کی حالت دیکھ کر سوداگر کو کچھ اطمینان ہو گیا کہ عدالت کسی دباؤ میں نہیں آئے گی۔ آخر مقدمہ کا فیصلہ ہوا اور بادشاہ نے سوداگر کو پوری رقم فوری طور پر ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

مقدمہ ختم ہوا تو قاضی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بادشاہ کی تعظیم کی۔ اس سے قبل قاضی صاحب بالکل ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسے وہ بادشاہ کو جانتے ہی نہیں۔ خود بادشاہ نے بھی اپنے جلالِ شاہی کا قاضی صاحب کے سامنے اظہار نہ کیا۔ عدالت برخاست ہوئی تو بادشاہ قاضی صاحب کے پاس گدی پر آ بیٹھا اور اپنی عبا سے ایک خنجر نکال کر قاضی صاحب کو دکھایا اور بولا:

> ”میں نے آپ کے امتحان کے لیے یہ صورت اختیار کی تھی۔ اگر
> آپ انصاف نہ کرتے تو میں اس خنجر سے اسی جگہ آپ کو ختم کر دیتا۔“

بادشاہ کے یہ الفاظ سن کر قاضی صاحب جس گدی پر بیٹھے ہوئے تھے، اس سے نیچے اترے اور اس کا ایک کونا اوپر اٹھا کر اس کے نیچے سے ایک دودھاری تلوار نکالی۔ تلوار اتنی تیز تھی کہ بال اڑتا ہوا آ کر گرے تو دو ٹکڑے ہو جائے۔ پھر قاضی صاحب نے بادشاہ سے کہا، حضور نے یہ تلوار ملاحظہ فرمائی۔ میں تو آج گھر سے یہ طے کر کے آیا تھا کہ اگر آپ احکام شریعت سے ذرا بھی پھرتے تو اس تلوار سے آپ کا سر قلم کر دوں گا۔ ممکن ہے کہ عدالت کے لوگ آپ سے شاہی رعب سے متاثر ہو جاتے، لہٰذا میں نے سوچ لیا تھا کہ میں بذاتِ خود آپ سے حدودِ خدا کی تعمیل کراؤں گا۔

قاضی کے یہ الفاظ سن کر بادشاہ نے اسے سینے سے لگا لیا اور قاضی کی بے باکی، اخلاص، دیانت اور حدود اللہ کے تحفظ کے جذبہ پر خدا کا شکر ادا کیا۔ آج کل کے جمہوری حکمران اس جج ہی کے خلاف ہو جاتے ہیں جو حکومت کے خلاف فیصلہ کرے خواہ حکومت کتنا ہی ناجائز کام کیوں نہ کرے۔ کتنا فرق ہے اس زمانے کے بادشاہوں اور آج کل کے جمہوری حکمرانوں کے درمیان!

ابواسحاق شیرازی اور نظام الملک

نظام الملک اپنی علم دوستی کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ اپنے زمانے کا اہم ترین آدمی تھا۔ نام تو اس کا حسن تھا اور کنیت ابوعلی۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ جامعۂ بغداد اور جامعۂ نیشاپور تھا۔ سیاست نامہ جیسی نادرہ روزگار کتاب اسی نابغہ روزگار کی لکھی ہوئی تھی۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے لوگ انہیں خواجۂ بزرگ، تاج الحضرتین، قوام الدین اور جانے کیا کیا القابات سے نوازتے تھے۔

ایک دفعہ سلطنت سلجوقیہ کے ایک وزیر نظام الملک نے حکم دیا کہ ایک محضر نامہ تیار کراؤ اور اس پر عوام، علماء اور امراء کے دستخط کراؤ۔ اور اپنے دستخطوں سے اس بات کی تصدیق کریں کہ میں نے اپنے طویل دور وزارت میں کوئی ظلم اور زیادتی نہیں کی تاکہ قیامت کے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دستاویز میرے کام آسکے۔

اس زمانہ میں وزیر سلطنت کے بوجھ کو اٹھانے والے ہوتے تھے کیونکہ وزیر کا لفظ ''وزر'' سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے بوجھ اٹھانے والا۔ وہ سلطنت کے قابل ترین لوگ ہوتے تھے۔ جس وزیر نے یہ دستاویز تیار کرنے کا حکم دیا تھا اس کا شمار نوشیروان عادل کے وزیر بزرجمہر کی صف میں ہوتا ہے۔ نہایت جہاں دیدہ، تجربہ کار، دانشور و دانشمند، علم و فضل کا شیدائی اور علم کی ترویج کے لیے دن رات کوشش کرنے والا۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں وزیر کے ساتھ ''باتدبیر'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ لیکن آج کل کے وزیر ''بے تدبیر'' ہوتے ہیں اور حکومت کا بوجھ اُٹھانے کے بجائے خود حکومت پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔ مالی بوجھ، اخلاقی بوجھ، سیاسی بوجھ، ضمیر فروشی کا بوجھ اور اس طرح کے کئی اور بوجھ۔ تاریخ کے صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ایسے ہلکے، بے ضمیر، عدل و انصاف کے دشمن، حرص و آز کے بندے، تخلیقی صلاحیتوں سے محروم، خوشامد پرست اور کاسہ لیس لوگ اگر وزیر بن جائیں تو ان کا کردار ابن علقمی، میر جعفر، میر صادق اور حکیم

الٰہی بخش سے مختلف نہیں ہوتا۔ وہ سکھوں کے ناموں کی مخفی دستاویزات جو بڑی مشکل سے تیار کی گئی تھیں اور کئی سالوں کی کاوش کا نتیجہ تھیں، مخالف حکومت کو بھی دے آنے سے گریز نہیں کرتے۔ ایسے وزراء کو اگر ملک دشمن، غدار وطن، کینہ پرور، منتقم مزاج اور خود غرض نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ ایسے وزیر اگر ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا نہ ہوتے تو آج گجرات میں دولے شاہ کے چوہے ہوتے یا پھر شہباز قلندر کے عرس میں "لال میری پت رکھیو" کی دھمال ڈال رہے ہوتے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جمہوریت کی لعنت سے یہ لوگ وزارت کی کرسیوں پر براجمان ہو گئے ورنہ اسلامی نظام حکومت میں یہ چپڑاسی کے عہدے کے قابل بھی نہیں۔

نظام الملک طوسی کے حکم سے یہ محضر نامہ تیار ہوا اور دستخطوں کے لیے مختلف علماء کے پاس گیے۔ اکثر نے دستخط کر دیے، لیکن جب یہ محضر نامہ ابو اسحاق شیرازی کی خدمت میں دستخطوں کے لیے گیا۔ تو انہوں نے اس کو بغور پڑھا۔ امام غزالی کے استاذ امام الحرمین تھے جو جامعۂ بغداد کے وائس چانسلر تھے، ابو اسحاق شیرازی ان کے بھی مخدوم تھے۔ دونوں اپنی جگہ یگانۂ عصر۔ جب یہ محضر نامہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس درویش خدا مست اور مرد قلندر نے فرمایا:

> "قلم لاؤ، جو کچھ ہم اس وزیر کے بارہ میں جانتے ہیں وہ نہایت دیانت سے لکھ دیں گے۔"

وزیر اعظم کے حاشیہ نشینوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ یہ کچھ لکھنے لگے ہیں لیکن وہ کیا لکھیں گے کہ یہ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس درویش خدا مست کو قلم پیش کیا۔ آپ نے اس قلم سے اس محضر نامہ پر اپنی رائے یہ لکھی:

> "حسن یعنی نظام الملک دوسرے ظالموں سے بہتر ہے۔"

کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس مرد قلندر کا ہاتھ پکڑتا۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابو اسحاق شیرازی کی رائے دیکھ کر نظام الملک کو بالکل غصہ نہیں آیا کہ یہ انہوں نے کیا لکھ دیا بلکہ بے اختیار آنسو پھوٹ پڑے۔ بستر مرگ پر لیٹے لیٹے بولا:

> "یہ الفاظ صرف یہی ہستی لکھ سکتی تھی۔"

اس واقعہ کے کچھ روز بعد نظام الملک انتقال کر گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے ایک ساتھی نے اسے خواب میں دیکھا۔ پوچھا: ''کیا معاملہ ہوا بارگاہ رب العزت میں؟''

فرمایا: ''اس مرد خود آگاہ اور درویش خدامست نے میرے محضر نامہ پر جو جملہ لکھا تھا، وہ شہادت کام آ گئی۔ اس سچے جملے کو پڑھ کر ندامت کے جو آنسو بہائے تھے، اسی سے بارگاہ رب العزت نے مجھ پر کرم نوازی فرمادی

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

……◆……

دو سبق

''دو سبق سیکھے ہیں۔'' یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے ستر سال علماء کو درس دینے کے بعد جو دو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ ۔ فرمایا:

> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دنیوی اور دینی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلاف اور خانہ جنگی۔'' اس لیے میں دل (مالٹا) سے عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن حکیم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی عام کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کر دیا جائے اور قرآنی تعلیم پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ دوسرے مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی صورت برداشت نہ کیا جائے۔''

حضرۃ مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ

> ''نباض'' امت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص و تجویز فرمائی تھی، باقی ایام زندگی میں ضعف و علالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعی پیہم فرمائی۔ بذات خود درس قرآن شروع کرایا جیسے علماء بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی۔ آپ کا ترجمہ قرآن پاک اور تفسیر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

* * *

﴿دنیا کی حقیقت﴾

میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی قدس سرہ نے ایک روز مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے فرمایا:

"مولانا آج ہم نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔" مفتی صاحبؒ نے پوچھا: "حضرت! وہ کیا؟"

فرمایا:

"محلہ کوٹلہ سے باہر چند چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بیٹھی ہوئی آپس میں لڑ رہی تھیں اور ایک دوسری کو خوب مار رہی تھیں۔ ہم قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ سب مل کر جنگل سے گوبر چن کر لائی ہیں اور ایک جگہ ڈھیر کر دیا ہے۔ اب اس کی تقسیم کا مسئلہ زیر نزاع ہے۔ حصوں کی کمی بیشی پر لڑنے مرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اول نظر میں مجھے ہنسی آئی کہ یہ کس گندی اور ناپاک شے پر لڑ رہی ہیں۔ ہم ان کی کم عقلی اور بچکانہ ذہنیت پر ہنستے ہوئے ان کی لڑائی بند کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ خدا تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ ان کی بے وقوفی پر ہنسنے والے جو دنیا کے مال و اسباب اور جاہ و منصب پر لڑتے ہیں، اگر ان کو چشم حقیقت بین نصیب ہو جائے تو وہ یقین کریں گے کہ ان عقلاء زمان اور حکماء وقت کی سب لڑائیاں بھی ان بچیوں کی جنگ سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں۔ فنا ہو جانے والی اور چند روز میں اپنے قبضہ سے نکل جانے والی یہ سب چیزیں بھی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں ایک گوبر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿الدنیا جیفة وطلابها کلاب﴾

"دنیا ایک مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔"

﴾اللہ کا بندہ﴿

سلطان طغرل نے ایلچی کو طلب کر کے کہا کہ "فوراً ابومنصور کے پاس جاؤ اور وہ جس حال میں بھی ہو اُسے میرے پاس لے کر آؤ۔"

حکم ملتے ہی ایلچی ہوا کے گھوڑے پر سوار وزیراعظم ابومنصور کی ڈیوڑھی پر گیا اور اطلاع کرائی اور سیدھا ابومنصور کی خدمت میں پہنچا۔

ابومنصور سلطان طغرل کے وزیر تھے بلکہ وزیراعظم تھے لیکن ایسے نہ تھے جو کہ عوامی حکومت کے وزیروں کی طرح آقاؤں کے قدموں پر سر رکھ کر وزارت حاصل کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی ان کے جائز اور ناجائز کاموں میں ہاں میں ہاں ملا کر اپنی عاقبت برباد کرتے ہیں۔ ابومنصور اپنے آقا سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے اور ہر معاملہ میں دین کو دنیا پر اور عاقبت کو دنیوی زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ اپنی قابلیت اور اہلیت سے وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر پہنچے تھے نہ کہ کسی کی سفارش سے۔

ایلچی جب ابومنصور کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ نماز فجر کے بعد ابھی تک مصلے پر بیٹھے ہیں۔ کیونکہ ابومنصور کا معمول تھا کہ وہ نماز فجر پڑھ کر طلوع آفتاب تک جائے نماز پر بیٹھ کر کچھ درود و وظائف کرتے رہتے اور پھر نماز اشراق پڑھتے اور بارگاہ خداوندی میں اپنے لیے اور اپنی رعایا کے لیے گڑگڑا کر دعائیں مانگتے۔ عوامی وزیروں کی طرح خدا تعالیٰ کو فراموش کر کے کسب زر و لوٹ مار کے طریقے نہ سوچتے بلکہ وہ یہ دعا کرتے کہ "اے اللہ! میری حفاظت فرمانا کہیں اقتدار مجھے ناجائز فائدوں کی طرف مائل نہ کر دے اور عدل و انصاف میرے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔"

ایلچی کو چونکہ حکم تھا کہ ابومنصور جس حالت میں بھی ہوں ان کو لانا ہے۔ وہ مصلے پر بیٹھے تھے اس وجہ سے ایلچی نے وہیں کھڑے کھڑے شاہی فرمان سنایا۔ لیکن ابومنصور نے اس وقت اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور فرمان شاہی کو سنا ان سنا کر دیا۔

ایلچی واپس آ گیا تو اس نے بعض درباریوں کو یہ بات سنائی۔

ہر درباری میں خوشامدی اور حاسدوں کی ایک کثیر تعداد ہوتی ہے جو چغل خوریوں سے قابل اور اہل آدمیوں کو نیچا دکھانے اور اپنی نااہلی پر پردہ ڈال کر دربار میں اعلیٰ اور بلند مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حاسدوں کو موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے بات کا بتنگڑ بنا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ بھرے دربار میں غصے سے چنگاڑنے لگا۔

ابومنصور اپنے معمولات سے فارغ ہوئے۔ شاہی لباس پہنا اور بادشاہ کے پاس جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ جب بادشاہ کے پاس پہنچے تو بعض خیر خواہوں نے بادشاہ کے غصہ کی داستان سنائی اور مشورہ دیا کہ وہ ذرا سنبھل کر دربار میں جائیں اور سوچ سمجھ کر بادشاہ سے بات کریں۔

اقتدار کا نشہ شراب کے نشے سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ انسان کو فرعونیت کی طرف مائل کرتا ہے۔ اختلاف رائے رکھنے والوں کو فوراً جیل کی کال کوٹھریوں میں بند کر دیتا ہے۔ اور ایسی دفعہ لگا کر بند کرتا ہے جس کی نہ اپیل ہوتی ہے اور نہ ضمانت۔ کبھی مخالفوں پر کلاشنکوفوں کے جھوٹے کیس بنائے جاتے ہیں تو کبھی بھینس چوری کے۔ یہ سب کچھ اقتدار کے نشہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ عورتوں میں اقتدار کا نشہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے کیونکہ فطری طور پر ان کی شخصیت غیر متوازن ہوتی ہے۔

ابومنصور سلطان طغرل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ بادشاہ کا چہرہ واقعی غصے سے تمتمایا ہوا ہے۔ حاسدین دم سادھے ہوئے کبھی بادشاہ کو دیکھتے اور کبھی ابومنصور کو۔ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے؟ یہ یقین سب کو تھا کہ بادشاہ کی نگاہ عتاب آلود ابومنصور کو دربار شاہی سے نکال دے گی۔

ابومنصور خاموش اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انہیں دیکھ کر سلطان کی آواز بجلی کے کڑکے کی طرح گونجی۔ پوچھا کہ فوراً طلب کیا گیا تھا اتنی دیر سے کیوں حاضر ہوئے۔ تمہیں فرمان شاہی کا کوئی احساس نہیں؟" یہ گستاخی، بے پروائی اور بے ادبی ناقابل برداشت ہے۔"

بات کوئی اتنی بڑی نہ تھی لیکن شاہی مزاج ''گاہے بسلامے برنجند اور گاہے بدشنامے خلعت دہند'' کی طرح ہوتا ہے۔ بادشاہ اپنا غصہ جھاڑ رہا تھا۔ اصل میں سلطان طغرل نہیں بول رہا تھا بلکہ اس کا نشۂ قوت بول رہا تھا۔ لیکن ابو منصور بہت بڑے آدمی تھے۔ حوصلہ، صبر، اخلاق اور مستقل مزاجی اللہ تعالیٰ نے ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ چپ چاپ بادشاہ کی باتیں سنتے رہے۔ آخر بڑی نرمی اور بردباری سے جواب دیا

> ''سلطان میں خدا کا بندہ ہوں اور تیرا نوکر۔ جب تک میں اپنے پیدا کرنے والے اور ہر نعمت کے عطا کرنے والے کی بندگی سے فارغ نہ ہو جاؤں تیری نوکری پر نہیں آ سکتا۔''

ابو منصور کا یہ جواب سن کر بادشاہ تخت سے نیچے اترے۔ ابو منصور کو سینے سے لگایا اور بولا:

> ''ابو منصور! خدا تمہیں خوش رکھے۔ اللہ کی بندگی میری نوکری پر ہمیشہ مقدم رکھنا۔ اس کی برکت سے ہمارے سب کام درست ہو جائیں گے۔''

یہ الفاظ سن کر حاسد اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ کاش آج کل کے وزراء بھی اللہ کی بندگی کو اپنی ملازمت پر ترجیح دیں۔

……

عدالت کی سزا

محمد تغلق ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ ایک روز اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک سامنے سے ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بادشاہ سے ٹکرا گیا۔ بادشاہوں کی نازک مزاجی تو تابِ سخن نہیں رکھتی ایک لڑکے کا بادشاہ سے ٹکرانا تو بہت بڑی بات تھی۔ محمد تغلق کو بچے کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور اس نے لڑکے کو چھڑی سے پیٹ ڈالا۔

لڑکا روتا ہوا عدالت میں پہنچا کیونکہ اس زمانہ میں وکیلوں اور فیسوں سے عدالت میں نہیں جایا جاتا تھا۔ قاضی القضاۃ کے پاس ہندوستان کے شہنشاہ محمد تغلق کے خلاف اس نے استغاثہ دائر کر دیا کہ اس نے مجھے ناجائز اور بے قصور پیٹا ہے۔ ماضی میں بادشاہوں اور حکمرانوں میں خواہ کتنی ہی ذاتی خرابیاں کیوں نہ ہوں انہوں نے عدلیہ کو آزاد رکھا ہوا تھا۔ اور عدلیہ جب تک آزاد رہی ملک میں ہر چھوٹے بڑے کو انصاف ملتا تھا۔ اور بادشاہ کو رعایا پر ظلم و تعدی کرنے پر قدغن تھی۔ اور اگر کوئی بادشاہ ظلم و تعدی کے جرم کا مرتکب ہوتا تو عدالت فوراً اس کا محاسبہ کرتی۔ چنانچہ عدالت نے فوراً بادشاہ کے نام سمن جاری کر دیئے اور اس کو عدالت میں طلب کیا۔

محمد تغلق اب تک بادشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوا اور ملزموں کے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے قاضی کے سامنے اپنا جرم تسلیم کر لیا اور کہا لڑکے نے مجھے نہیں دیکھا تھا اور مجھ سے واقعی لڑکے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ قاضی القضاۃ نے بادشاہ کو ایک روز کی مہلت دی اور کہا کہ کل تک اس لڑکے کو راضی کر لو ورنہ قصاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔

محمد تغلق نے لڑکے کو راضی کرنے کے لیے بہت سا مال و زر دینا چاہا لیکن وہ کسی

صورت رضامند نہ ہوا۔ دوسرے دن بادشاہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوا اور بچے کو راضی کرنے میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ قاضی نے قصاص کا حکم جاری کر دیا۔ چنانچہ قاضی القضاۃ کے حکم سے لڑکے نے اسی چھڑی سے جس سے بادشاہ نے اسے پیٹا تھا، بادشاہ کے جسم پر ۲۱ بید مارے اور بادشاہ نے نہایت صبر اور تحمل سے اس چھڑی کی ضربوں کو برداشت کیا۔ اور اف تک نہ کی۔ سزا کے بعد بادشاہ نے دو رکعت نفل شکرانہ ادا کی کہ حق تعالیٰ شانہ نے اُسے عدل و انصاف پر ثابت قدم رکھا اور دنیا میں اس سے جو غلطی ہوئی تھی اس کی سزا اسے دنیا ہی میں مل گئی۔

……

دیناروں کے دس بستے

اللہ والے بادشاہوں کے تحفے تحائف قبول نہیں کرتے کیونکہ ایک تو انہیں دنیا کی حرص نہیں ہوتی اور دوسرے وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ ان لوگوں نے یہ دولت لوگوں کا خون چوس چوس کر جمع کی ہے۔ دولت کی سب کو ضرورت ہوتی ہے دنیا والوں کو بھی اور اللہ والوں کو بھی لیکن دنیا والے مال و دولت کے پیچھے دوڑتے ہیں اور مال و دولت اللہ والوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ مال و دولت کی مثال سائے کی سی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے سائے کو پکڑنے کے لیے دوڑے تو سایہ اس کے آگے آگے دوڑتا ہے اور آدمی اس کو پکڑ نہیں سکتا۔ اور اگر آدمی سایہ سے منہ موڑ کر اس کے آگے دوڑنا شروع کر دے تو سایہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ بھی ان اللہ والوں میں سے تھے جو بادشاہوں کے تحفے اور ہدیے قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفۂ وقت نے انہیں دیناروں کے دس بستے پیش کیے لیکن شیخ نے حسب معمول انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ نے اصرار کیا لیکن آپ نے پھر بھی قبول نہ کیے۔ جب خلیفہ کا اصرار حد سے بڑھا تو آپ نے دو بستے لیے۔ ایک کو دائیں ہاتھ میں پکڑا اور دوسرے کو بائیں میں۔ پھر ان دونوں کو آپس میں رگڑا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اشرفیوں سے خون رس رس کر زمین پر گرنے لگا۔ آپ نے خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

> "تمہیں شرم آنی چاہیے۔ بغداد کے لوگوں کا خون پیتا ہے اور اسے
> جمع کر کے میرے پاس لاتا ہے۔"

خلیفہ نہایت شرمندہ ہوا اور وہ دینار واپس لے گیا۔

* * *

﴿عجیب دعوت﴾

حضرۃ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ حضرۃ مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے فرزند ارجمند اور حضرۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے استاذ تھے۔ علم وعمل میں یگانۂ روزگار۔ حضرۃ تھانویؒ نے اپنے اساتذہ میں سے جتنی تعریف ان کی کی ہے شاید ہی کسی اور کی ہو۔ نہایت خوش پوشاک، نازک مزاج، نازک بدن اور نفاست پسند تھے۔ اور حسین بھی ایسے کہ معلوم ہوتا تھا کہ شہزادہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دیوبند میں ایک بزرگ تھے عبداللہ شاہ۔ یہ جنگل سے گھاس کھود کر لایا کرتے تھے اور دو آنہ کی بیچ دیتے تھے۔ اس میں سے دو پیسے خیرات کر دیتے تھے اور باقی چھ پیسے بال بچوں میں خرچ کر دیتے۔ انہوں نے ایک روز کہا کہ مولوی جی! آپ لوگوں کی دعوت کرنے کو جی چاہتا ہے، مگر کھانا پکا کر کھلانا میرے بس میں نہیں۔ دام مجھ سے لے لو اور اپنے گھر میں پکا لو۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ ہم کئی آدمی تھے۔ مولانا محمد قاسم بھی تھے اور آپ کے ساتھ چند اور آدمی بھی تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عبداللہ شاہ صاحب نے جو پیسے دیئے ہیں ان سے گڑ والے میٹھے چاول پکائے جائیں۔ سب نے مل کر مولانا یعقوبؒ کے ذمہ اس کا پکوانا رکھا۔ چنانچہ میٹھے چاول مولانا کے گھر میں پکے۔ پکانے میں مولانا نے یہ احتیاط کی کہ کوری ہانڈی منگوائی اور پکانے والے کو وضو کرایا۔ جب چاول پک کر تیار ہو گئے تو سب نے مل کر دو دو لقمے کھائے کیونکہ پیسے کم ہونے کی وجہ سے چاول کم پکے تھے۔

حضرۃ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ جیسے ہی وہ چاول حلق سے نیچے اترے ایک لذت اور نور محسوس ہوا۔ اور لطف یہ کہ اس کا اثر مدت تک رہا۔ ہم نے کہا کہ جب ایک بار کے کھانے کا یہ اثر ہے تو اس شخص کی کیا حالت ہوگی جو ہمیشہ ایسا ہی کھانا کھاتا ہے اور اس کے سوا دوسرا کھانا اس کے پیٹ میں جاتا ہی نہیں۔

آج رشوت اور دوسرے حرام طریقوں کی کمائی ہمارے پیٹوں میں جاتی ہے تو نیک عمل کی توفیق کیسے پیدا ہو؟ اور دعا کیسے قبول ہو؟

عدل وانصاف

مامون الرشید عباسی ایک نہایت تزک واحتشام والا خلیفہ تھا۔ آدھی دنیا اس کے زیر نگین تھی یہ ہارون الرشید کا بیٹا تھا جو اللہ والوں سے ملنے کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک روز مامون اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شکستہ حال بڑھیا شکایت گذارنے کے لیے اس کے دربار میں آئی کہ ایک جابر اور ظالم شخص نے میری جائداد چھین لی ہے۔ خلیفہ مامون نے پوچھا: کس نے چھینی اور وہ کہاں ہے؟

بڑھیا نے مامون کے پہلو کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ شخص آپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔ مامون نے دیکھا کہ تو وہ اس کا اپنا بیٹا عباس تھا۔ مامون نے وزیر کو فوری حکم دیا کہ شہزادے کو بڑھیا کے برابر کھڑا کر دیا جائے کیونکہ اب اس کی حیثیت ایک ملزم کی ہے۔ وزیر نے فوری طور پر حکم کی تاویل کی۔

اس زمانے کے وزیر دانا و بینا ہوتے تھے علم وفضل سے مالا مال۔ علم کے ساتھ عقل و دانش بھی ہوتی تھی۔ آج کل کے وزیر احمق و جاہل ہوتے ہیں اور حکومت کا بوجھ اٹھانے کے بجائے حکومت پر بوجھ ہوتے ہیں۔ آج کل کا وزیر ہوتا تو بڑھیا کو ڈانٹ کر نکال دیتا کہ تو وقت کے بادل پہ الزام تراشی کر رہی ہے۔ اور اگر واقعی اس نے تیری جائداد چھین لی ہے تو یہ اس کا حق بنتا ہے۔ کیونکہ مال وزر کے حق دار زرداری ہی ہوتے ہیں و پھر بادشاہ کو سمجھاتا کہ حضور! یہ آپ کیا کرنے لگے۔ اس بڑھیا کی معمولی سی شکایت پر آپ شہزادے کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر رہے ہیں۔ یا پھر یہ کہتا کہ کسی شریف آدمی نے اسے رشوت دے کر اس کے منہ سے یہ الزام لگوایا ہے۔

جب شہزادہ بڑھیا کے ساتھ کٹہرے میں کھڑا ہو گیا تو مامون نے دونوں کے بیانات سنے۔ بیان دیتے وقت شہزادہ رک رک کر اور آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ جبکہ بڑھیا بے دھڑک بلند آواز سے مسلسل اپنا بیان دے رہی تھی۔

وزیر نے یہ دیکھ کر بڑھیا کو پاس ادب کا اشارہ کیا اور کہا کہ مامون کے سامنے تیز اور اونچی آواز سے بولنا بے ادبی ہے۔ مامون نے وزیر کو روکا اور کہا۔ اسے بولنے دو کیونکہ سچائی نے اس کی زبان تیز کر دی ہے اور شہزادے کو گونگا بنا دیا ہے۔

جب دونوں کے بیان ختم ہوئے تو مامون نے فیصلہ بڑھیا کے حق میں کیا اور شہزادے سے تمام جائداد اسے واپس دلا دی اور خاصی بڑی رقم شہزادے سے بطور جرمانہ وصول کر کے بڑھیا کو دلوائی تاکہ اس کی ذہنی کوفت کا ازالہ ہو سکے۔

……

سو دینار

سلطان سنجر شکار کھیلتا ہوا دور نکل گیا۔ بھوک نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ جب بھوک نے زیادہ ستایا تو وہ ایک کٹیا میں داخل ہو گیا۔ کٹیا کے رہائشی فقیر نے پہلی ہی نظر میں بادشاہ کو پہچان لیا لیکن سلطان سنجر اس غلط فہمی میں تھا کہ فقیر نے اسے نہیں پہچانا۔

بادشاہ نے فقیر سے پوچھا: ''کیا کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟۔''

فقیر نے نہایت انکساری سے جواب دیا: ''حضور! کیوں نہیں۔'' گھر میں ایک انڈا موجود ہے اور کچھ روٹی بھی مل جائے گی۔''

بادشاہ بھوک سے بلبلایا ہوا تھا اس لیے بولا: ''جو کچھ بھی ہے جلدی لاؤ۔''

فقیر نے انڈا تل کر روٹی کے ساتھ بادشاہ کے سامنے رکھا۔ بادشاہ سخت بھوکا تھا۔ فوراً کھا گیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد فقیر سے پوچھا: ''تمہیں اس کھانے کی کیا قیمت ادا کرنی چاہیے؟''

فقیر نے جواب دیا: ''سو دینار۔''

''سو دینار'' بادشاہ نے تعجب سے پوچھا ''کیا یہاں انڈے نہیں ملتے؟'' اور کھانے کی اشیاء کمیاب ہیں؟''

فقیر نے جواب دیا: ''نہیں، ایسا نہیں ہے، یہاں انڈوں کی کوئی کمی نہیں اور نہ ہی کھانے پینے کی اشیاء کمیاب ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ البتہ نایاب ہے۔''

بادشاہ نے فوری طور پر اس فقیر کو سو دینار ادا کر دیئے اور کہا کہ میں خوش ہوں کہ تم نے کھانے کی قیمت میرے شایانِ شان طلب کی۔''

……◆……

درویش بادشاہ

حضرت قطب الدین بختیار کاکی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں سے تھے۔ ان کا جب انتقال ہوا تو ان کی میت کو کفنا کر نماز جنازہ کے لیے میدان میں رکھا گیا۔ دور دور سے لوگ جنازہ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ خلقت کا اژدہام تھا جو نماز جنازہ میں شریک تھا۔ لیکن نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کوئی آگے نہ بڑھتا تھا کیونکہ شیخ نے مرنے سے قبل یہ وصیت فرمائی تھی کہ

> ”میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے گا جس نے کبھی نماز قضا نہ کی ہو، زندگی میں کبھی حرام کاری نہ کی ہو، نماز کا پابند ہی نہیں بلکہ باجماعت نماز کا پابند ہو اور وہ بھی ایسا کہ تکبیر اولیٰ اس کی نہ چھوٹی ہو۔ اور نماز عصر کی سنتیں اس کی کبھی قضا نہ ہوئی ہوں۔“

یہ شرائط تھیں حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی نماز جنازہ پڑھانے والے امام کی۔ اجتماع عام میں ان شرائط کا اعلان کیا گیا۔ ایسی سخت شرائط کو سن کر کسی میں جرأت نہ تھی کہ امامت کے لیے آگے بڑھتا۔ سنت عصر کی پابندی تو بڑے بڑے صاحبان عبا وقبا سے بھی نہیں ہوتی۔ ہر شخص ایک دوسرے کا منہ تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دیکھئے کون ایسا خوش قسمت امامت کے فرائض انجام دیتا ہے۔

دیکھا کہ ایک شخص آگے بڑھ رہا ہے۔ آنکھوں سے موسلا دھار بارش کی طرح آنسو ٹپک رہے ہیں۔ دل کی کیا کیفیت اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ درویش خدا مست امامت کے لیے کھڑا ہوا اور نماز جنازہ پڑھائی۔

نماز ختم ہوئی تو لوگوں نے پوچھا کہ ایسی کڑی شرائط پر پورا اترنے والا امام کون تھا؟ جواب ملا۔ شمس الدین التمش، سرزمین ہند کا بادشاہ بھی اور درویش وقت بھی۔ درباروں کی فضا ایسی ہوتی ہے کہ صاحبان اقتدار کے دماغ پھر جاتے ہیں۔ کتنے

خوشامدیوں کے جھرمٹ اور کہیں آداب بجا لانے والوں کے گروہ۔ اقتدار کے اس نشہ کو صرف اللہ والوں کی صحبت کی ترشی ہی اتار سکتی ہے۔ چنانچہ التمش ہفتے میں دو بار حضرت بختیار کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ جب بھی آتا تو اسے اپنے اعمال درست کرنے اور عوام سے نیک سلوک اور ان کی فلاح و بہبود کی تلقین کی جاتی۔ چنانچہ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ وہ رات کو گدڑی پہن کر سارے شہر میں گھومتا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر غریبوں اور محتاجوں تک پہنچتا اور اپنا آپ بتائے بغیر ان کی مدد کرتا۔ اگر کوئی پہچان لیتا تو اسے تاکید ہوتی کہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا۔

نزہۃ الخواطر میں ہے کہ پورے دربار کو سفید لباس پہننے کا حکم تھا جو کہ سادہ بھی ہو۔ کیا مجال کہ کوئی اپنے لباس اور دولت کی نمائش کرے۔ البتہ مظلوم کے لیے سرخ لباس کا حکم تھا کہ التمش کی فوری توجہ کا مستحق ہو۔ انصاف میں دیر اور طوالت کو وہ ظلم سمجھتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ عدل حاکم کی بنیادی خوبی ہے۔ جو حاکم عدل نہیں کرتا وہ کسی کام کا نہیں۔

حکیم الامت مولانا تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ کفر اور حکومت جمع ہو سکتے ہیں لیکن ظلم اور حکومت جمع نہیں ہو سکتے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ التمش نے اپنے گھر میں ایک زنجیر لٹکا رکھی تھی جس کی دوسری طرف ایک گھنٹی تھی جو اس کے سونے کے کمرے (بیڈ روم) میں لٹکی رہتی۔ تاکہ رات میں جن لوگوں پر ظلم ہو وہ دربار میں حاضری کے لیے دن کا انتظار نہ کریں۔

اس نے ۲۶ سال حکومت کی۔ پہلے وہ غلام تھا پھر اپنی ذہانت سے دنیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا تھا لیکن سنت نبوی کی پیروی میں وہ کم کھاتا اور کم سوتا تھا۔ خود کنوئیں سے پانی نکال کر وضو کرتا۔

آج کل کے جمہوری دور کے صدر اور وزیر اعظم ان جیسے بادشاہوں کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے جن کے دور حکومت میں لوگ خود انہی کے ہاتھوں ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو عوام کا نمائندہ کہتے ہیں لیکن عوام سے سوائے ووٹ لینے کے انہیں اور کوئی سروکار نہیں ہے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی ہے نیلم پری

تواضع کی انتہاء

مولانا معین الدین اجمیریؒ مدرسہ معینیہ اجمیر کے ایک بہت بڑے عالم اور معقولات میں ایک خاص مقام کے حامل تھے۔ انہوں نے حضرۃ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی شہرت سن رکھی تھی۔ ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا تو ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے اور حضرۃ شیخ الہند کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو بنیان اور تہ بند پہنے ہوئے تھے، کیونکہ گرمیوں کا موسم تھا۔ مولانا معین الدین صاحب نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ مجھے حضرۃ مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنا ہے۔ وہ صاحب بڑے تپاک سے مولانا اجمیری کو اندر لے گئے۔ آرام سے بٹھایا اور کہا کہ ابھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ مولانا اجمیری منتظر رہے۔ اتنے میں وہ تشریف لے آئے اور مولانا کو بلایا اس کے بعد مولانا اجمیریؒ نے کہا کہ ”حضرۃ مولانا محمود الحسن صاحب کو اطلاع دیجئے۔“ ان صاحب نے فرمایا: ”آپ بے فکر رہیں اور آرام سے تشریف رکھیں۔“ تھوڑی دیر بعد وہ صاحب کھانا لے آئے اور کھانے پر اصرار کیا۔ مولانا اجمیریؒ نے کہا کہ میں مولانا محمود الحسن سے ملنے آیا ہوں۔ آپ انہیں اطلاع کر دیجئے۔ ان صاحب نے فرمایا: ”انہیں اطلاع ہو گئی ہے، آپ کھانا تناول فرمائیں۔ ابھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ مولانا اجمیریؒ نے کھانا کھالیا تو ان صاحب نے انہیں پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ جب کچھ دیر گذر گئی تو مولانا اجمیری برہم ہو گئے اور فرمایا: ”آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں مولانا سے ملنے آیا تھا اور اتنی دیر ہو چکی ہے۔ ابھی تک آپ نے ان سے ملاقات نہیں کرائی۔ اس پر وہ صاحب بولے:

> ”دراصل بات یہ ہے کہ یہاں مولانا تو کوئی نہیں البتہ محمود خاکسار ہی کا نام ہے۔“

……

احساسِ فرض

نہاوند کا معرکہ اسلامی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس معرکہ نے ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور درفش کاویانی ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو گیا۔

نعمانؓ بن مقرن اس معرکہ میں اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے۔ کسریٰ اپنی ساری بچی کھچی طاقت میدان میں لے آیا تھا۔ بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ میدان میں زخمیوں کی چیخ و پکار اور تلوار کی جھنکار کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کشت و خون کا یہ عالم تھا کہ گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ کبھی کبھی نعرۂ تکبیر کی آواز گونجتی یا کبھی کسی قاری کی تلاوت قرآن سے قلب و روح میں موجزن سرفروشی کے ولولے کو اور زندگی مل جاتی۔

جنگ اپنے پورے عروج پر تھی۔ کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔ ایرانیوں کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اچانک ایک تیر نعمانؓ بن مقرن کو لگا۔ ساتھ ہی ان کے گھوڑے کا پاؤں پھسلا اور وہ شدید زخمی حالت میں زمین پر آ رہے۔ گرتے ہی پکارے

''مسلمانو! میری فکر نہ کرو، لڑائی جاری رکھو۔''

جب سورج افق مغرب میں چھپ گیا اور رات نے سیاہ چادر اوڑھ لی تو دشمن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا۔ زخمیوں اور مرنے والوں سے میدان اٹا پڑا تھا۔ فتح کے بعد ایک سپاہی سیدنا نعمانؓ کے قریب سے گزرا۔ دیکھا کہ نعمانؓ دم توڑ رہے ہیں۔ وہ سرہانے آ کر بیٹھ گیا اور ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ نعمانؓ نے آنکھیں کھولیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا:

''جنگ کا کیا بنا؟''

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مند کیا۔" سپاہی نے جواب دیا

نعمانؓ کے زرد اور پیلے چہرے پر زندگی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی اور فرمایا: "الحمد للہ"

پھر جیسے دور کنویں کی گہرائیوں سے بولے

"یہ خوشخبری امیر المومنین کو پہنچا دو۔"

اور پھر حیاتِ جاوید سے ایسے ہم کنار ہوئے کہ اس دنیا سے واپس نہ آئے۔"

* * *

بے مثال جرأت

چاندنی رات تھی۔ چاند نہایت فراخ دلی سے سطح زمین پر اپنی چاندنی نچھاور کر رہا تھا۔ ہر چیز شفاف اور صاف نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ اسلامی کیمپ اور ایرانی کیمپ میں بھی اگرچہ خاموشی طاری تھی لیکن اسلامی کیمپ میں اللہ کے کچھ بندے حق تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز تھے۔ ایرانی کیمپ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ طلیحہؓ اسلامی فوج کی انٹیلی جنس کے ایک اعلیٰ افسر اور نامور شہسوار تھے۔ رات کی تاریکی میں یہ نہایت خاموشی سے ایرانی کیمپ میں داخل ہو گئے۔ ایرانی خیموں سے باہر فرش زمین پر لیٹے خراٹے بھر رہے تھے۔ کہیں کہیں خیموں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید وہ پہرے دار تھے اور بے فکر بیٹھے تھے کیونکہ ان کے خیال میں لشکر کے عین وسط میں کون شخص پہنچ سکتا تھا، لیکن طلیحہؓ ان سب سے بچتے بچاتے کیمپ میں ہر طرف گھومتے پھرتے رہے۔

مشرقی افق سے سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو تھا اور طلیحہؓ ابھی تک کیمپ میں گھوم رہے تھے۔ طلیحہؓ ایک بہت بڑے خیمے کے قریب پہنچے۔ کچھ فوجی وہاں باتیں کر رہے تھے اور کچھ پڑے خواب خرگوش میں سو رہے تھے۔ پاس ہی ایک کوتل گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ سپاہیوں نے دور سے ایک سایے کو آتے دیکھا تو سمجھے کہ اپنی ہی فوج کا کوئی آدمی ہوگا۔ جب وہ سایہ قریب آیا تو ایک عرب کو ایرانی کیمپ کے عین وسط میں دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

ابھی یہ عالم حیرت میں دیکھ ہی رہے تھے کہ طلیحہؓ نے تلوار نکالی۔ گھوڑے کی باگ کاٹ کر ہاتھ میں لی اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ دونوں گھوڑے چشم زدن میں ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں ایرانی سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے شور مچایا اور طلیحہؓ کے پیچھے دوڑے۔ سارے کیمپ میں بھگدڑ مچ گئی۔ پکڑو پکڑو کا شور ہر طرف برپا ہو گیا۔ بعض زین کے بغیر ہی گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور طلیحہؓ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔

صبح کی روشنی خاصی پھیل چکی تھی اور آفتاب جلد مشرق سے نکلنے ہی والا تھا،

لیکن دشمن ابھی تک طلیحہؓ کا پیچھا کر رہا تھا۔ تین ایرانی شہسوار تو بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ چند منٹ کے بعد ایک شہسوار ان کے سر پر تھا۔ اس ایرانی نے طلیحہؓ پر حملہ کرنے کے لیے نیزہ بلند کیا۔ طلیحہؓ نے گھوڑے کو روکا دیا اور ایک طرف ہو گئے۔ ایرانی اپنے زور سے آگے نکلتا چلا گیا۔ طلیحہؓ نے تلوار اس انداز سے لہرائی کہ اس کا گھوڑا بھڑک اٹھا اور وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ پھر نہایت پھرتی سے طلیحہؓ نے اپنا نیزہ اس کی پشت میں پیوست کر دیا۔

اس عرصہ میں دوسرا شہسوار بھی پہنچ گیا۔ طلیحہؓ نے اس کے ساتھ بھی وہی داؤ کھیلا۔ وہ بھی اوندھے منہ زمین پر گرا۔ اس کے گرتے ہی طلیحہؓ کی تلوار اپنا کام کر چکی تھی۔ تیسرے شہسوار نے جب اپنے دونوں ساتھیوں کو خاک و خون میں تڑپتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا کیونکہ وہ دونوں اس کے چچا زاد بھائی تھے۔ وہ اپنے خیال میں ایک ایک ہزار شہسواروں پر بھاری تھے۔ اس نے غصے اور جوشِ غضب میں طلیحہؓ پر نیزے کا ایک وار کیا لیکن طلیحہ پہلو کر چکے تھے۔ اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور ایرانی دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ طلیحہؓ نے اُسے بلند آواز سے کہا:

”جان کی خیر چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو۔“

ایرانی نے ہتھیار ڈال دیئے اور طلیحہؓ نے اسے گرفتار کر لیا۔

اسی بھاگ دوڑ میں طلیحہؓ اس طرف جا نکلے جہاں ایرانی فوج کا بایاں بازو (میسرہ) جنگ کے لیے صف بندی کر رہا تھا، لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائے اور اپنے قیدی کو لیے تلوار لہراتے اور دشمن کو چیرتے نکل گئے۔

طلیحہؓ اپنے قیدی کو لے کر سپہ سالار فوج سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا کہ ”کیا خبر لائے ہو؟“

طلیحہؓ نے جواب دیا

”میں دشمن کے کیمپ کے اندر چلا گیا تھا اور ساری رات ان کے کیمپ میں گھومتا پھرتا رہا۔ ان کے ایک آدمی کو پکڑ لایا ہوں۔ کوئی ممتاز شخص معلوم ہوتا ہے۔ میں نے غلط کیا یا صحیح یہ آپ فیصلہ کر لیں

اور تفصیل اس شخص سے پوچھ لیں۔“

ایرانی نے سیدنا سعدؓ سے طلیحہؓ کی شجاعت اور بے خوفی کی بڑی تعریف کی جو ایک لاکھ سے زیادہ لشکر سے نہایت جرأت اور بہادری سے نکل آئے تھے۔ اس نے ایرانی لشکر کے بارہ میں نہایت اہم معلومات فراہم کیں۔

بعد ازاں وہ ایرانی مسلمانوں کے حسن سلوک، بہادری اور دیگر اخلاقی محاسن سے متأثر ہو کر مشرف با سلام ہو گیا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ نے اس کا نام مسلم رکھا۔ طلیحہؓ کے ساتھ اُسے خاص محبت تھی۔ وہ طلیحہؓ کے ساتھ بعد والی تمام جنگوں میں شریک رہا۔ وہ مسمانوں سے اکثر کہا کرتا تھا ”بخدا جب تک تم لوگ وفاداری، صدق و اخلاص اور غمخواری و ہمدردی کو اپنائے رکھو گے، تمہیں کبھی شکست نہ ہوگی۔

◆

﴾درویش بادشاہ﴿

سلطان شمس الدین التمش کے انتقال کے بعد دہلی کے تخت پر اس کا بیٹا ناصر الدین محمود متمکن ہوا۔ یہ بھی باپ کی طرح نہایت عبادت گزار اور درویش صفت تھا۔ زہد و ورع کا مجسمہ گویا سلطانی میں درویشی کرتا تھا۔ زندگی نہایت سادہ و سیدھی سادی تھی۔ تکلفات سے طبعی نفرت تھی۔ مسلمانوں کے بیت المال کو امانت سمجھتا اور اپنے کو اس کا کسٹوڈین (Custodian) خیال کرتا۔ لہٰذا ذاتی اخراجات کا بوجھ شاہی خزانے پر نہ ڈالتا۔

وہ نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ بلند پایہ خطاط بھی تھا۔ اپنے دور کے تمام خطاط اس کے آگے پانی بھرتے تھے۔ اپنے فن کو اس طرح کام میں لاتا کہ قرآن حکیم لکھ کر اس کے ہدیے سے گھر کے اخراجات چلاتا۔ قرآن حکیم کی کتابت کا ہدیہ لیتے وقت کسی کو پتہ نہ چلنے دیتا کہ یہ سلطان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن ہے تاکہ کوئی زیادہ ہدیہ نہ دے دے۔

اس کی اہلیہ بھی اسی کی طرح نیک بخت اور سادہ خاتون تھی۔ اس تھوڑی سی آمدنی پر نہایت عسرت اور تنگی ترشی سے وقت گزارتی لیکن زبان پر کوئی حرف شکایت نہ لاتی۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ روٹی پکاتے ہوئے اس کا ہاتھ جل گیا۔ ہاتھ اتنا جلا کہ آبلے پڑ گئے۔ آخر ایک روز حرف شکایت زبان پر آ گیا۔ بادشاہ نے سنا تو رونے لگے۔ پھر کہا:

> ''دنیا چند روزہ ہے۔ پلک جھپکنے میں گزر جائے گی۔ یہاں اس تکلیف کو برداشت کرلو۔ حق تعالیٰ شانہ قیامت کے دن تمہیں بے حد و حساب اجر دے گا۔ بیت المال میرا نہیں مسلمانوں کا ہے۔ میں تو صرف کسٹوڈین ہوں۔ آمدنی کا تمہیں پتہ ہے کہ نہایت قلیل ہے۔ اتنی استطاعت نہیں کہ تمہیں کوئی خادمہ رکھ دوں۔''

وہ نیک بخت بھی صابر و شاکر تھی، کہنے لگی:

> ''آپ فکر نہ کریں۔ میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں۔ اپنا اجر آخرت

کے لیے محفوظ رکھتی ہوں۔"

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود زہد و تقویٰ کا مجسمہ تھا۔ اسے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت تھی بلکہ آپ کے اسمِ مبارک کو بھی بے وضو زبان پر لانے سے گریز کرتا تھا اس کے ایک ندیم خاص کا نام "محمد" تھا۔ وہ اسے ہمیشہ اسی نام سے پکارتا تھا۔ ایک روز اس نے اس کو "تاج الدین" کے نام سے پکارا۔ وہ ندیم خاص حکمِ شاہی کی تعمیل کر کے گھر چلا گیا اور پھر تین روز تک دربارِ شاہی میں نہ آیا۔

سلطان نے اسے گھر سے بلا کر غیر حاضری کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب دیا:

> "جہاں پناہ! آپ مجھے ہمیشہ "محمد" کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ اس روز خلافِ عادت آپ نے مجھے "تاج الدین" کے نام سے یاد کیا تو میں سمجھا کہ جناب کے دل میں میرے بارہ میں کوئی بدگمانی پیدا ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے میں تین روز دربار سے غیر حاضر رہا۔ اور یہ تین روز میں نے سخت بے قراری اور اضطراب میں کاٹے ہیں۔"

سلطان نے اس کی یہ بات سن کر فرمایا:

> "میں تم سے بدگمان نہیں ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب میں نے تمہیں "محمد" کے بجائے "تاج الدین" کہہ کر پکارا اس وقت میں باوضو نہ تھا۔ مجھے شرم آئی کہ حضور ﷺ کا نام نامی بے وضو لوں۔"

……

شوقِ شہادت

رسول اللہ ﷺ کو مدینہ طیبہ ہجرت فرمائے ایک سال ہو گیا۔ دوسرا سال شروع ہوا تو رمضان کے مہینہ میں جنگ بدر کا واقعہ پیش آ گیا۔ یہ کفر اور اسلام کی پہلی باقاعدہ جنگ تھی۔ قرآن حکیم نے اس جنگ کو ’’یوم الفرقان‘‘ کے نام سے یاد کیا ہے کیونکہ اس روز کفر اور اسلام کے درمیان فرق ہو گیا تھا۔ مکہ سے جو لوگ لڑنے کے لیے آئے تھے وہ کوئی بیگانے نہ تھے اپنے تھے، اور اپنوں سے لڑنے کے لیے آئے تھے۔ ان میں سرکار دو عالم ﷺ کے چچا عباسؓ بھی تھے اور داماد ابو العاصؓ بھی۔ سیدنا علیؓ کے بھائی عقیل بھی تھے تو سیدنا عمرؓ کے ماموں ہشام بھی۔ سیدنا ابوبکرؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن بھی تھے تو سیدنا عثمانؓ کے عزیز و اقارب عتبہ اور شیبہ بھی۔ غرضیکہ مہاجرین کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کا کوئی عزیز تلوار سونت کر اس کے مقابلہ میں آیا نہ ہو۔

بدر کی جنگ کے لیے مسلمان مدینہ طیبہ سے سرکار دو عالم ﷺ کی زیر قیادت روانہ ہوئے۔ شہر کے قریبا ایک میل باہر نکل کر آپ نے اپنی فوج کا جائزہ لیا۔ جو کم عمر تھے انہیں واپس کر دیا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ جو رشتہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور کے ماموں تھے، ان کے بھائی عمیرؓ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ یہ کم سن بچے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں واپسی کے لیے فرمایا تو وہ رونے لگے۔ ان کا یہ ذوق و شوق دیکھ کر آپ ﷺ نے انہیں ساتھ چلنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

احد کی جنگ جو قریش مکہ نے بدر کا انتقام لینے کے لیے لڑی تھی، اس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ نبی اکرم ﷺ نے فوج کا معائنہ فرمایا اور کم سن بچوں کو واپس بھیج دیا۔ زید بن ثابتؓ، ابو سعید الخدریؓ، عبداللہ بن عمرؓ، براء بن عازبؓ اور عرابہ اوسیؓ وغیرہ اس لشکر میں شامل تھے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مجاہدین کو کھڑا کر کے ان کا معائنہ فرما رہے تھے۔ اچانک ان کی نظر رافعؓ بن خدیج پر پڑی۔ آپ ﷺ نے انہیں پکڑ کر فرمایا:

"تم عمر میں چھوٹے ہو لہٰذا واپس چلے جاؤ۔"

وہ پنجوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے تا کہ لمبے دکھائی دیں۔ ان کی اس حرکت کو دیکھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مسکرائے اور انھیں مجاہدین احد میں داخل فرما لیا۔

سمرہؓ بھی اس لشکر میں تھے۔ یہ رافعؓ کے ہم عمر تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں بھی دیکھ کر واپس جانے کے لیے فرمایا۔ انھوں نے بارگاہِ نبوتؐ میں عرض کیا کہ

> "یا رسول اللہ! لڑائی میں قد کا لمبا ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا طاقتور ہونا کام آتا ہے۔ میں رافعؓ سے زیادہ طاقتور ہوں، چنانچہ میں اس کو کشتی میں پچھاڑ سکتا ہوں۔ اگر ان کو اجازت دی گئی ہے تو مجھے بھی اجازت ملنی چاہیے۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کا جواب سن کر مسکرائے۔ آپ نے ان دونوں کی کشتی کروائی۔ واقعی سمرہؓ نے رافعؓ کو پچھاڑ لیا لہٰذا انھیں بھی جنگ میں شرکت کی اجازت مل گئی۔

اس زمانہ کے بچوں کو بھی کتنا شوق شہادت تھا۔ جنگ سے تو اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے ع

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

◆

﴿بتوں کی بے بسی﴾

''اس مرتبہ بات کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے بتوں کی کیا مجال کہ اس سیلاب کے آڑے آئیں۔'' یہ الفاظ ابو قحافہ کے تھے۔ سیدنا ابو بکرؓ کے والد ماجد، عمر بیانوے چورانوے طے کر کے اب اس پیٹے میں تھے جب تمام جسمانی قویٰ انسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جب انسان کمان جیسی کمر لے کر اپنی جوانی کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ چنانچہ ضعف پیری سے ان کی کمر بھی جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں کی بینائی مفقود۔ کمزوری اتنی کہ کسی سہارے کے بغیر چلنا محال، لیکن ابھی تک اسلام کی نعمت عظمیٰ سے یک قلم محروم!

فتح مکہ کا دن، دس ہزار قدوسی شہر کے باہر کھڑے اپنے قائد کے حکم کے انتظار میں تھے۔ قائد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعلان کروایا کہ مسلمان شہر میں داخل ہونے سے رک جائیں کیونکہ میں فوج کو نئے سرے سے ترتیب دینا چاہتا ہوں۔

ابو قحافہ کے کان میں بھی یہ بھنک پڑ گئی کہ اسلامی فوجیں شہر کے دروازوں تک آن پہنچی ہیں۔ بنو تیم کے اس بزرگ نے ایک بچی کو اپنے ساتھ لیا جو اس کی پوتی تھی یعنی ابو بکرؓ کی بچی اور جبل ابو قبیس پر چڑھنا شروع کیا۔ اس کے سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اور آنکھوں میں بھی سفیدی آ چکی تھی۔ کمر جھک چکی تھی لیکن ایک شوق تھا جو اس بڑے میاں کو کشاں کشاں پہاڑی پر لیے جا رہا تھا۔ راستہ میں پتھروں کی ٹھوکریں بھی کھائیں لیکن بالآخر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔

پہاڑی پر پہنچ کر منیٰ کی گھاٹی کی طرف منہ کر کے اپنی پوتی سے کہنے لگے:

''ہاں بچی! ذرا اچھی طرح دیکھ کر بتانا کہ اب تیری آنکھیں کیا منظر دیکھ رہی ہیں؟ پوتی نے جب وہ منظر دیکھا تو فوری طور پر اندر سے خوش ہو کر اپنے دادا سے بولیں:

''دادا ابا! مجھے تو حد نظر تک انسانی سروں کے علاوہ اور کچھ دکھائی ہی

نہیں دیتا۔''

انسانی سروں کا ایک سمندر ہے جو تاحد نگاہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔''

اب اس بوڑھے نے دوسرا سوال کیا:

''بیٹی! یہ بھی دیکھنا کہ کیا یہ سیدھے اس طرف آ رہے ہیں؟''

پوتی نے بغور دیکھنے کے بعد کہا:

''نہیں دادا ابا، یہ چل تو نہیں رہے بلکہ ذی طوی کے پاس رکے ہوئے ہیں۔''

پوتی کا جواب سن کر اس مرد بزرگ نے حیرانی اور پریشانی کے ملے جانے جذبات سے پوچھا:

''یہ سیلاب رک کیوں گیا بیٹی۔''

پوتی نے پھر غور سے مٹی کی گھاٹی کی طرف سروں کے اس سیلاب کو دیکھا اور بولی:

''ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ لوگ ادھر ادھر بٹ رہے ہیں۔''

''لڑکی اس طرف برابر تکے جا رہی تھی اور اس کی نظریں جو کچھ دیکھ رہی تھیں وہ من و عن اپنے دادا کو بتا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولی:

''دادا ابا! دکھائی ایسا دے رہا ہے کہ یہ لشکر چار حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔''

لڑکی نے بالکل صحیح دیکھا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے لشکر کے شہر میں داخل ہونے سے قبل اس کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ آگے جو جرنیل تھا وہ زبیر بن العوامؓ تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ کے حواری اور آپ کے پھوپھی زاد بھائی۔ ان کے پیچھے مہاجرین اور انصار کی فوج۔ مہاجرین کی کمان اس امت کے امین سیدنا ابوعبیدہ بن الجراحؓ کے ہاتھ میں تھی اور انصار کے علمبردار سیدنا قیسؓ، انصار کے سردار سیدنا سعد بن عبادہؓ کے فرزند ارجمند۔ نہایت زیرک و فہیم۔ یہ دونوں کدی کے راستے کی طرف جا رہے تھے اور ادھر سے مکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ پوتی اپنے دادا ابا کو یہ سب کچھ بتا رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد پوتی نے اپنے دادا کو یہ بتایا کہ اب تیسرا حصہ اپنی جگہ سے آگے بڑھا ہے۔ اس کا رخ لیط کی طرف ہے۔ اس کے علمبردار سیدنا خالد بن ولیدؓ ہیں جو کسی زمانہ میں اہل مکہ کی آنکھوں کا تارا تھے۔ اپنے حسب ونسب کے لحاظ سے بھی اور اپنی حربی کارکردگی کی وجہ سے بھی۔ ان کے دستہ کو مکہ کی جنوبی سمت سے شہر میں داخل ہونے کو کہا گیا تھا۔

اب لڑکی نے اپنے دادا ابا کو بتایا کہ فوج کا چوتھا حصہ بھی اذاخر (۔ مکہ کے بالائی حصہ کی گھاٹی کا نام) کی طرف چل پڑا ہے۔

اب وہ مرد بزرگ سر کی آنکھوں سے نہیں دل کی آنکھوں سے دیکھ کر اپنی پوتی سے پوچھ رہا تھا۔

''غالباً فوج کی زیادہ تعداد اسی حصہ میں ہے؟''

''ہاں دادا ابا'' اس لڑکی نے جواب دیا۔

''اور یہ لوگ ہماری طرف آ رہے ہیں؟'' یہ بڑے میاں کا دوسرا سوال تھا۔

''کچھ پہچان سکتی ہو کہ اس حصہ لشکر کے سالار کون ہیں؟''

لڑکی نے بغور دیکھنے کے بعد کہا: ''نہیں۔''

''بیٹی! سن لو، اسی حصہ میں ابوبکرؓ بھی ہوگا۔''

''سچ دادا ابا!'' لڑکی نے بڑی خوشی سے پوچھا اور پھر اس متجسانہ نگاہیں ابوبکرؓ کو ڈھونڈنے لگیں، لیکن فاصلہ دور اور آدمیوں کا انبوہ کثیر ہونے کی وجہ سے وہ ابوبکرؓ کو نہ ڈھونڈ سکیں۔ دادا کی بوڑھی آنکھوں نے بہت سے نشیب وفراز دیکھے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد پتہ نہیں بڑے میاں کے دل میں کیا آیا۔ اپنی نوعمر پوتی سے کہنے لگے:

''اس حصہ لشکر کی کمان ایک ایسی ہستی کے ہاتھ میں ہے جس کی قدر و قیمت ہم لوگوں نے ابھی تک نہیں پہچانی۔'' آؤ جلدی کرو ہم یہاں سے اتر چلیں۔ یہ لوگ کسی وقت بھی شہر میں داخل ہو جائیں گے۔''

پوتی اور دادا جلدی جلدی گھر پہنچنے کی فکر میں لگ گئے۔ وہ جلدی جلدی قدم

اٹھاتے ہوئے پہاڑ سے اترے اور گھر کی طرف چل دیے، لیکن راستے میں ابو قحافہ سوچتے جا رہے تھے:

"ابرہہ اشرم ہاتھیوں کی فوج لے کر اس شہر کو تاراج اور اس گھر کو مسمار کرنے آیا تھا، یہ ان کی جوانی کے دنوں کی بات تھی، لیکن اس کی فوج روئی کے دھنے ہوئے گالوں کی طرح اڑ گئی۔ کعبے کی سرزمین مقدس سرزمین ہے۔ تین سو ساٹھ بت اس شہر اور گھر کی رکھوالی کرتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ یہاں کوئی قوت سر نہیں اٹھا سکتی۔ اب یہ انسانی سروں کا سیلاب جو امنڈ آیا ہے تو کیا ہمارے دیوی دیوتا کا ہاتھ انہیں روک نہ دے گا، جن کی طاقت اور قوت کے سامنے ہاتھیوں کی قوت ہار مان گئی۔ ان کے لیے تو انسانی فوج کوئی چیز نہیں۔"

جونہی یہ مرد بزرگ گھر کے قریب پہنچے تو ان کا دل یہ کہہ رہا تھا:

"اس مرتبہ بات کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے بتوں کی کیا مجال کہ اس سیلاب کے آڑے آئیں۔"

ابو قحافہ کی بات سچ ثابت ہوئی۔ کوئی بت بھی قدوسیوں کے اس لشکر کے آڑے نہ آیا اور یہ فاتحانہ شہر میں داخل ہو گئے۔

……

شہادت کی تمنا

۸ ھ میں سرکار دو عالم ﷺ نے مکہ کو فتح کیا۔ وہ مکہ جہاں آپ پیدا ہوئے۔ آپ ﷺ کا بچپن گذرا، آپ ﷺ کا لڑکپن گذرا، جوانی گذری اور اب آپ ﷺ بڑھاپے کی منزلوں میں تھے کہ آپ فاتحانہ طور پر اس شہر میں تشریف لائے۔ خون کے پیاسوں نے آپ کی مہربانیاں دیکھیں۔ راستہ میں کانٹے بچھانے والوں نے آپ ﷺ کا خلق عظیم ملاحظہ کیا۔ مکہ کے رہنے والوں کو اپنے تمام ظلم وستم یاد تھے جو انہوں نے پیغمبر اسلام، اور آپ ﷺ کے صحابہؓ پر توڑے تھے، لیکن آپ ﷺ نے اپنے عفو وکرم سے ان سب کو حرف غلط کی طرح صفحۂ دل سے مٹا دیا اور خون کے پیاسوں پر "لا تثریب علیکم الیوم" کے جام لنڈھائے۔ کئی لوگ اسی عفو وکرم اور خلق عظیم کو دیکھ کر بادۂ اسلام سے سرشار ہو گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے دل میں یہ چنگاری تو اسی وقت سلگ اٹھی مگر کچھ مصلحتیں تھیں کہ انتظار کی گھڑیاں گنتے رہے۔ انہی میں ایک شخص تھا جس کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ نام ہی سے ظاہر تھا کہ باپ کفر وشرک کی تاریکیوں میں غلطاں تھا، لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں تھا۔ اس کا بیٹا عبدالعزیٰ اب یتیم تھا۔

باپ بچے کو کفیل بنا کر اگلی دنیا میں چلا گیا تھا۔ چچا نے یتیم بھتیجے کی پرورش کی۔ بڑے ہوئے تو چچا نے ایک غلام، کچھ بکریاں اور کچھ اونٹ دیئے تا کہ وہ خود کفیل ہو جائے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ بھتیجا ہوشیار بھی تھا اور محنتی بھی۔ اس نے محنت سے اپنے کاروبار کو خوب چمکایا اور اپنے قبیلہ حزینہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ یوں عبدالعزیٰ کی دنیا تو سنبھل گئی لیکن آخرت کے سنورنے کا کوئی سامان پیدا نہ ہوا۔

چچا بڑا پکا بت پرست تھا۔ حد تو یہ ہے کہ فتح مکہ کے دن بڑے بڑے کافروں کا دل کفر سے پھر گیا، لیکن چچا کا دل نہ پھرا۔ عبدالعزیٰ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر ایک دن دل کڑا کر کے وہ چچا کے پاس پہنچا اور بولا:

’’چچا! مدتوں اس انتظار میں گذر گئے کہ کبھی تو آپ ان بتوں کی پرستش سے توبہ کریں گے۔ لیکن ابھی تک وہ وقت نہیں آیا۔‘‘

چچا اس بات سے چونکا اور کہا:

’’تو پھر‘‘

بھتیجے نے جواب دیا:

’’پھر کیا، پھر یہ کہ آپ مجھے اجازت دیجئے۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ آج ہے کل نہیں۔ میں تو اب اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔‘‘

یہ سن کر چچا کے تیور بگڑے اور غصہ بھڑکا اور بولا:

’’برخوردار! یہ تیرے کپڑے، تیرے رہنے کا مکان، تیرا سب سازوسامان میرا ہے۔ تیرا کچھ بھی نہیں۔ ایک ایک شی جو تیرے پاس ہے وہ میری دی ہوئی ہے۔ باپ دادا کے دین کو چھوڑنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر اگلا قدم اٹھانا۔‘‘

ایمان کی شمع عبدالعزیٰ کے دل میں روشن ہو چکی تھی۔ دنیوی لالچ کی ہوائیں اس کو نہ بجھا سکتی تھیں۔ چنانچہ اس نے جواب دیا:

’’چچا! واقعی ہر شی آپ کی ہے۔ یہ سب چیزیں آپ کی نذر ہیں۔ مجھے ان میں سے کچھ نہیں چاہیے۔‘‘

اب جو یہ اللہ کا بندہ چچا کے پاس سے اٹھا تو اس کی ایک ایک چیز لوٹا دی حتیٰ کہ جسم کے کپڑے بھی۔ ماں کے پاس اس حال میں آیا کہ ماں نے دیکھا تو چونکیں۔ ماں نے حیرت سے پوچھا:

’’بیٹا! کیا بات ہے؟‘‘

لڑکا بولا:

’’اماں! اب بت پرستی نہیں ہوتی۔ میرا دل پلٹ گیا ہے۔ زندگی کے اتنے دن اور اتنی راتیں کفر کے اندھیارے میں گذری ہیں۔ اب ایمان دل میں گھر کر گیا ہے۔ اب سب بتوں سے نفرت ہوگئی ہے۔‘‘

ماں نے ترس کھا کر ایک کمبل دے دیا۔ انہوں نے اس کمبل کو دو ٹکڑے کیے۔ ایک کا تہ بند باندھ لیا اور ایک جسم پر ڈال لیا اور کوئے حبیب یعنی مدینہ کی راہ لی۔

مدینہ طیبہ میں ایسے وقت پہنچے کہ رات کی سیاہی چھٹ اور پو پھٹ رہی تھی۔ سیدھے مسجد نبویؐ میں گئے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

سرورِ کائنات ﷺ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر صحابہ کرامؓ کی مجلس میں جلوہ افروز ہوئے۔ دیکھا کہ ایک اجنبی کمبل کے دو ٹکڑوں سے جسم کو ڈھانپے بیٹھا ہوا ہے۔ نگاہِ نبوتؐ نے غور سے اجنبی کو دیکھا، پوچھا:

"کون ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا:

"مسافر ہوں۔ سینکڑوں میلوں کا سفر کاٹ کر حاضر خدمت ہوا ہوں۔
نام عبدالعزیٰ ہے اسلام کی نیت سے حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ آپ کو
دیکھنے اور نماز پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی ہے۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس اجنبی کی حالت زار کو دیکھ کر افسوس بھی ہوا۔ ارشاد فرمایا:

"آج سے تمہارا نام عبدالعزیٰ کے بجائے عبداللہ ہے۔ اور
ذوالبجادین لقب یعنی دو کپڑوں والا۔"

حضور اکرم ﷺ نے انہیں اصحاب صفہ میں شامل فرما لیا۔ عبداللہؓ کی زندگی کے دن بڑے ذوق و شوق اور جذب و مستی کے دن تھے۔ گاہے گاہے آپ ﷺ سے شہادت کی تمنا کا اظہار کرتے رہتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تسلی کے الفاظ فرما کر خاموش کر دیتے۔

تھوڑے عرصے بعد جنگ تبوک کی تیاریاں ہونے لگیں۔ انہوں نے سنا تو یہ بھی خدمت نبویؐ میں پہنچے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! دعا فرمایئے کہ میں راہِ خدا میں شہید ہو جاؤں۔"

عبداللہ کے اس جذبۂ سرفروشی کو دیکھ کر سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

"جاؤ کسی درخت سے تھوڑی سی چھال اتار لاؤ۔"

عبداللہ دوڑے دوڑے گئے اور چھال کا ایک ٹکڑا لے آئے۔ آپ نے وہ ٹکڑا ان کے بازو پر باندھ دیا اور فرمایا:

"خداوندا! میں کافروں پر اس کا خون حرام کرتا ہوں۔"

عبداللہ نے یہ سنا تو اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگے اور بولے:

"افسوس کہ دل کی تمنا دل ہی میں رہی جاتی ہے۔"

بارگاہ نبویؐ سے ارشاد ہوا۔

"عبداللہ! فکر نہ کرو۔ مسلمان جہاد کی نیت سے نکلے اور بیماری سے مرجائے تو ایسے میں بھی اللہ اسے شہادت کا مرتبہ عطا فرمائے گا۔"

غرض کہ یہ لشکر تبوک پہنچا۔ وہاں پر لڑائی کے کوئی آثار نہ تھے۔ مجاہدین کے دل میں شہادت کی حسرتیں رہ گئیں۔ چند روز وہاں قیام کے بعد مسلمان واپس لوٹے۔ عبداللہ راستہ میں یکایک بیمار ہو گئے۔

ایسے بیمار ہوئے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ ایمان لانے کے بعد جہاد میں شرکت کا یہ پہلا موقع تھا اور اللہ تعالیٰ نے بغیر لڑے انہیں شہادت کا درجہ عطا فرما دیا۔

بلال بن الحارث المزنی نے ذوالبجادین کے دفن کا حال دیکھا تھا۔ وہ بیان فرماتے ہیں:

"رات کا وقت تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ اپنے بھائی کے لیے قبر کھودو۔ قبر کھودی گئی۔ پہلے سرکار دو عالم ﷺ خود اس قبر میں اترے اور اس میں لیٹ کر دیکھا کہ عبداللہ کے لیے یہ قبر چھوٹی تو نہیں۔ پھر ابوبکرؓ اور عمرؓ سے فرمایا کہ پورے احترام کے ساتھ اپنے بھائی کو قبر میں اتار دو۔"

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ

"رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے انہیں قبر میں رکھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کا منہ قبلہ کی طرف کیا۔ پھر باہر نکل کر فرمایا:

''اے اللہ! آج کی شام تک میں اس سے خوش تھا۔ اے اللہ! تو بھی اس سے راضی ہو جا۔''

راوی کا بیان ہے کہ

''مسعود کے بیٹے عبد اللہؓ اور خطاب کے بیٹے عمرؓ نے حسرت بھرے انداز میں کہا کہ کاش اس کی جگہ ہم ہوتے اور حضور ﷺ اس طرح ہمیں قبر میں اتارتے۔''

بچہ ناز رفتہ باشد زیں جہاں نیاز مندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

……

﴿حاضر دماغی﴾

سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی تھے ۵ ھ میں مشرف باسلام ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے۔ نہایت تجربہ کار اور زمانے کے پیچ و خم سے بخوبی آشنا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی آپ کی ان خوبیوں سے فائدہ اٹھایا اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا فاروق اعظمؓ بھی ان کی ان خوبیوں سے کاروبار خلافت میں بہرہ ور ہوتے رہے۔ عقل و دانش اور تدبیر و سیاست کے لحاظ سے وہ عرب کے ممتاز مدبرین میں سے تھے اور اپنے غیر معمولی دل و دماغ کی وجہ سے ”مغیرۃ الرائے“ کہلاتے تھے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں انہیں بحرین کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ یہاں کے کچھ لوگوں نے دربار خلافت میں ان کی شکایت کی۔ سیدنا عمرؓ نے انہیں معزول فرما دیا۔ صحابہ کرامؓ ایسے لوگ تھے جن کو یہ مختلف عہدے ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکے۔ گورنر تھے تو تب بھی مزاج میں کوئی عجب نہیں، نہ تھے تو تب بھی کوئی احساس کمتری نہیں۔ وہ سب کچھ اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے کرتے تھے۔

سیدنا مغیرہؓ اپنے عہدے کا چارج دے کر واپس جا رہے تھے کہ بعض شرپسند لوگوں نے چلتے چلتے انہیں ایک اور چوٹ لگائی اور آئندہ واپسی کے خطرہ کو روکنے کے لیے یہاں کے ایک زمیندار نے ایک لاکھ کی رقم جمع کر کے دربار خلافت میں پیش کی اور بتایا کہ مغیرہؓ نے سرکاری محاصل میں خیانت اور بددیانتی کر کے ہمارے پاس جمع کروائی تھی۔

سیدنا عمرؓ اس معاملہ میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ خیانت اور بددیانتی کو تو وہ بالکل برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے نہایت سختی سے باز پرس کی۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ رقم موجود تھی۔ سینکڑوں گواہ بنائے گئے تھے، لیکن سیدنا مغیرہؓ بالکل بے قصور تھے۔ الزام بہت بڑا تھا، لیکن سیدنا مغیرہؓ نے دماغی توازن قائم رکھا۔ وہ اس غلط

الزام سے بالکل پریشان نہیں ہوئے بلکہ نہایت اطمینان سے فرمایا:

"میں نے دو لاکھ جمع کیے تھے۔ ایک لاکھ اس نے دبا لیا ہے۔"

آپ کا یہ جواب سن کر وہ زمیندار سخت پریشان ہوا اور حلف وغیرہ لے کر اپنی صفائی پیش کی لیکن سیدنا مغیرہؓ کو جو سزا ہوتی وہ تو ہوتی، لیکن فی الحال اس زمیندار کو پورے دو لاکھ دینے پڑتے۔ سیدنا عمرؓ نے تحواری کروائی۔ معاملہ غلط ثابت ہوا۔ مغیرہؓ الزام سے بری ہو گئے لیکن سیدنا عمرؓ نے پوچھا "تم نے دو لاکھ کا کیوں اقرار کیا؟"

جواب دیا:

"انہوں نے تہمت لگائی تھی اور اس کے سوا بدلہ لینے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔"

◆

راہِ خدا میں انوکھی ہجرت

مکہ مکرمہ میں سب سے زیادہ امیر، متمول اور لوگوں میں ذی وجاہت خاندان بنو مخزوم سمجھا جاتا تھا۔ اس خاندان نے اسلام کی مخالفت بھی بہت کی کیونکہ ابوجہل کا تعلق اسی خاندان سے تھا، لیکن اس خاندان کی اسلام کے لیے قربانیاں بھی بے مثال اور ناقابل فراموش ہیں کیونکہ سیدنا خالدؓ بن الولید کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا جنہوں نے اس زمانہ کی سپر پاور بازنطینی حکومت کے در و دیوار کو پاش پاش کر کے دنیا کی تاریخ کے بہترین جرنیلوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوایا۔

اسی خاندان کی ایک عورت کا نام ہند تھا لیکن کنیت ام سلمہ تھی۔ ان کے والد ابوامیہ مکہ مکرمہ کے مشہور، مخیر اور فیاض آدمی تھے۔ سفر میں جاتے تو تمام قافلے والوں کی اکیلے کفالت کرتے تھے۔ اسی لیے "زاد الراکب" کے لقب سے مشہور تھے۔

عبداللہ بن عبدالاسد مکہ ہی کے ایک شخص تھے۔ ام سلمہؓ کے رشتہ میں چچازاد بھائی اور سرکار دو عالم ﷺ کے رضاعی بھائی۔ زیادہ تر وہ ابوسلمہؓ کے نام سے مشہور تھے۔ ان سے ان کا نکاح ہوا۔ ہجرت حبشہ سے پہلے ام سلمہؓ ایمان لائی تھیں۔ پھر حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ میاں بیوی آپس میں شیر و شکر تھے۔ کبھی کوئی جھگڑا نہیں بلکہ دونوں مل کر اسلام کی ترقی کے لیے دن رات کوشش کرتے۔

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمانے کا حکم فرمایا۔ ام سلمہؓ بھی اپنے شوہر ابوسلمہؓ اور اپنے دودھ پیتے بچے سلمہؓ کے ساتھ عازم ہجرت ہونی لگیں تو قبیلہ والوں کو پتہ چل گیا۔ چنانچہ ام سلمہؓ پر ایمان کی محبت کا اس قدر غلبہ تھا کہ بیوی کو اس کے خاندان والوں کی مزاحمت کی وجہ سے چھوڑ کر مدینہ طیبہ چلے گئے۔ یہ بیچاری ہجرت کی حسرت دل میں لیے واپس اپنے گھر آ گئیں۔

ابوسلمہؓ کا مدینہ طیبہ جانا تھا کہ اس کے گھر والے ام سلمہؓ کی گود سے اس کا بچہ سلمہؓ

چھین کر لے گئے انہوں نے ام سلمہؓ کے خاندان والوں سے کہا:

"جب تم نے اپنی لڑکی کو ہمارے لڑکے ساتھ مدینہ نہیں جانے دیا تو ہمارا بچہ سلمہؓ تمہیں اپنے پاس رکھنے کا کیا حق ہے؟ لہٰذا یہ بچہ ہمارے حوالے کر دو۔"

چنانچہ وہ سلمہؓ کو ام سلمہؓ سے چھین کر لے گئے اور ام سلمہؓ اکیلی رہ گئیں۔ ایک سرکارِ دو عالم ﷺ کا غم، دوسرے خاوند کی فرقت اور اب سلمہؓ کے چھینے جانے کی تکلیف۔ اب نہ انہیں رات کو نیند اور نہ دن کو چین۔

اب حالت یہ تھی کہ وہ روزانہ گھبرا کر گھر سے نکل جاتیں اور ابطح میں بیٹھ کر رویا کرتی تھیں۔ کئی روز تک یہی حالت رہی اور خاندان کے لوگوں کو احساس تک نہ ہوا۔ ایک دن ابطح سے ان کے خاندان کا ایک شخص نکلا اور ام سلمہؓ کو روتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا۔ گھر آ کر اس نے لوگوں سے کہا:

"اس غریب پر کیوں ظلم کرتے ہو۔ اس کو جانے دو اور اس کا بچہ اس کے حوالے کر دو۔"

خاندان والوں کو بھی اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ چنانچہ انہوں نے بچہ بھی دے دیا اور روانگی کی اجازت بھی دے دی۔

روانگی کی اجازت ملی تو بچے کو گود میں لے کر مدینہ طیبہ کا راستہ لیا۔ منزل دور، کوئی مرد ساتھ نہیں، راستہ سنگلاخ، گود میں بچہ، بالکل تن تنہا۔ گویا کہ

شب تاریک و بیم موج، گردابے چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

سواری بھی پاس نہیں، لیکن جذبۂ شوق منزل کی طرف کھینچ رہا ہے۔ تنعیم تک پہنچیں تو کلید بردار کعبہ عثمان بن طلحہؓ نے دور سے دیکھ کر پہچان لیا۔ عثمان ان کے خاوند ابو سلمہؓ کے دوست تھے۔ اگرچہ ابھی تک کافر تھے لیکن شرافت و نجابت کا مجسمہ۔ اونٹ پاس لائے۔ پوچھا: "تم ام سلمہؓ ہو؟!"

کہا: "ہاں۔"

”کہاں کا قصد ہے؟“ عثمان بن طلحہ نے پوچھا

”ہجرت کر کے مدینہ جا رہی ہوں۔“ اُمّ سلمہؓ نے جواب دیا۔

عثمان بن طلحہ نے انہیں اپنے اونٹ پر بٹھایا۔ اونٹ کی مہار پکڑی اور مدینہ طیبہ کی طرف چل پڑے۔ جہاں کہیں راستہ میں ٹھیرنا پڑتا تو عثمان اونٹ کو بٹھا کر کسی درخت کے نیچے چلے جاتے اور روانگی کا وقت آتا تو اونٹ پر کجاوہ رکھ کر ہٹ جاتے اور امّ سلمہؓ سے کہتے:

”بہن سوار ہو جاؤ۔“

سیدہ امّ سلمہ فرماتی ہیں:

”میں نے اپنی زندگی میں عثمانؓ بن طلحہ سے زیادہ شریف آدمی نہیں دیکھا۔“

غرض مختلف منزلوں پر قیام کرتے ہوئے یہ دونوں قبا پہنچے۔ قبا کی آبادی نظر پڑی تو عثمان نے کہا:

”میری بہن! اب تم اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ۔ میں آگے نہیں جا سکتا۔“ مسلمانوں کا علاقہ آ گیا ہے۔ اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔“

چنانچہ سیدہ امّ سلمہؓ مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں اور عثمانؓ نے مکہ کا راستہ لیا۔“

* * *

جنت میں داخلہ کی خواہش

جنگ بدر ہو چکی تھی اور اس میں شریک صحابہ کرامؓ کو اللہ کی رضا کا سرٹیفکیٹ مل چکا تھا۔ سیدنا عمرو بن الجموح ایک انصاری صحابی تھے۔ لنگڑے تھے اس وجہ سے جہاد میں شرکت سے معذور تھے۔ ایک سال کے بعد احد کی جنگ ہوئی، اس جنگ میں شرکت کے لیے یہ بے تاب تھے۔

ان کے شیر جیسے جوان چار بیٹے تھے جو غزوۂ بدر میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ جب احد کی لڑائی ہوئی تو سیدنا عمرو بن الجموح نے اپنے بیٹوں کو بلا کر کہا:

> "میرے بیٹو! میں جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہوں، لہٰذا مجھے کوئی نہ روکے۔"

بیٹوں نے کہا:

> "ابا جان! اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرکت سے محروم رکھا ہے، اس لیے آپ شرکت کا ارادہ نہ فرمائیں۔ ہم جو ہیں آپ کی طرف سے شرکت کرنے والے۔"

لیکن عمروؓ راضی نہ ہوئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس بارگاہ میں جا کر عرض کیا:

> "یا رسول اللہ! میرے بیٹے مجھے آپ کے ساتھ اس لڑائی میں شرکت سے روکتے ہیں۔ بخدا! میں یہ امید لگائے ہوئے ہوں کہ اسی لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں پھروں۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

> "عمرو! تم لنگڑے ہو، اور لنگڑوں اور اندھوں کو اللہ تعالیٰ نے لڑائی

> میں شرکت سے معذور رکھا ہے۔ تم پر جہاد فرض نہیں لہٰذا تم شرکت نہ کرو۔"

لیکن یہاں تو شہادت کی تمنا بے تاب کیے ہوئے تھی، کہا، "اللہ کے رسول! میں ضرور شرکت کروں گا۔"

ان کا عزم صمیم دیکھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کے بیٹوں سے فرمایا:

> "ان کو مت روکو۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ نے ان کے مقدر میں شہادت لکھی ہو۔"

حضور نبی اکرم ﷺ کی خواہش اور حکم کا احترام کرتے ہوئے بیٹوں نے انہیں جنگ میں جانے سے نہ روکا۔ اور وہ آپ ﷺ کے ساتھ غزوہ احد میں شریک ہو گئے۔

اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کا جب ان کی لاش پر سے گزر ہوا تو فرمایا:

> "میں ان کی طرف دیکھ رہا ہوں کہ ان کا یہ پاؤں ٹھیک ہے اور جنت میں ٹہل رہے ہیں۔"

……◆……

سیدنا عمرؓ کی کفر میں نرم دلی

حافظ ابن کثیرؒ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے خاص شاگرد ہیں۔ تاریخ میں ایک ضخیم کتاب لکھی۔ تفسیر، حدیث اور تاریخ تینوں میں امام اور ماہر۔ انہوں نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ مکہ مکرمہ کی ایک عورت لیلیٰ تھی۔ کنیت ام عبداللہ۔ بڑی نیک خاتون۔ ہجرت حبشہ سے قبل وہ اور ان کے خاوند حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے لیکن قریش مکہ نے جن میں ابوجہل اور عمر بن الخطاب بھی شامل تھے، مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ کیا ہوا تھا۔ ام عبداللہ اور ان کے شوہر عامرؓ دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کا مصمم ارادہ فرما لیا تھا۔”

ام عبداللہؓ بنت حثمہ کا اپنا بیان ہے کہ جب ہم دونوں میاں بیوی نے ہجرت حبشہ کا ارادہ کیا تو میں اپنے مکان کے باہر کھڑی اپنے شوہر عامرؓ کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ وہ اپنی بعض ضروریات کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اچانک سامنے سے خطاب کا بیٹا عمر آ گیا۔ یہ ابھی تک اسلام نہیں لایا تھا۔ عمرؓ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں کچھ ڈری سی گئی کیونکہ عمرؓ سے ہم لوگوں کو بڑی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچی تھیں۔ عمرؓ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا:

“ام عبداللہ! یہ کوچ ہو رہا ہے؟”

میں نے کہا:

> “ہاں، ہم لوگ مکہ کی زمین سے کسی اور زمین میں چلے جائیں گے، اس لیے کہ تم لوگ ہمیں بہت ستاتے ہو۔ ہم پر بے جا سختیاں کرتے ہو۔ تم لوگوں نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہوا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کوئی نجات کی صورت پیدا کر دے گا۔”

سیدہ ام عبداللہ فرماتی ہیں:

> “میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر عمر نے کہا: “ام عبداللہ! اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور اس پر کچھ رقت سی طاری ہو گئی جو اس میں

میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔"

یہ الفاظ کہہ کر عمر واپس چلا گیا۔ عمر کا لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے ہم لوگوں کے ملک سے جانے کا بہت ملال اور صدمہ ہوا ہے۔

ام عبداللہ کا کہنا ہے کہ جب میرے شوہر عامر اپنی ضرورت پوری کر کے واپس آئے تو میں نے انہیں کہا:

"ابو عبداللہ! کاش کہ تم عمر کو ابھی دیکھتے کہ وہ کتنے نرم دل اور ہم لوگوں کے ملک چھوڑنے سے کس قدر رنجیدہ اور ملول ہیں۔"

عامر بولے:

"کیا تمہیں اس کے اسلام لانے کی کچھ امید ہوئی ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

عامرؓ نے میری ہاں کے جواب میں کہا:

"ام عبداللہ! خطاب کا یہ بیٹا عمر اسلام نہیں لائے گا اگرچہ خطاب کا گدھا اسلام لے آئے۔"

لیکن جب خطاب کا یہ بیٹا اسلام لایا تو پھر ایسا اسلام لایا کہ بس پھر وہ اسلام ہی کا ہو کر رہ گیا۔ اور وہ جو پہلے اسلام لانے والوں پر سختیاں کیا کرتا تھا اب اسلام کے خلاف بات کرنے والوں کے لیے تیغ براں بن گیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بالکل سچ فرمایا:

﴿واشدھم فی امر اللہ عمر﴾

"اور اب عمرؓ عمر نہ رہا بلکہ "فاروق اعظم" ہو گیا۔

* * *

﴿اللہ کی رضا کے لیے اسلام﴾

فاتح مصر سیدنا عمرو بن العاصؓ سنہ ۸ھ میں دولت ایمان سے مالا مال ہوئے۔ اپنے ایمان لانے کا واقعہ خود بیان فرماتے ہیں کہ

> ”میں ایمان لانے کی غرض سے مدینہ طیبہ جاتے ہوئے ھدہ پہنچا تو راستہ میں دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی میں نے دیکھا کہ ان میں ایک خالد بن ولیدؓ تھے۔“ دونوں میں گفتگو ہوئی۔

بیہقی نے واقدی کی روایت سے ان کی جو گفتگو نقل کی ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ

> ”عمرو بن العاصؓ نے خالدؓ سے پوچھا: ”کہاں کا ارادہ ہے؟“ خالدؓ نے جواب دیا کہ ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا رہا ہوں۔“

کیوں جا رہا ہوں؟ اس کو سیدنا خالدؓ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا:

> ﴿دخل الناس فی الاسلام فلم یبق احد بہ طعم﴾
>
> ”لوگ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں اور کوئی صاحب ذوق باقی نہیں رہا۔

”ذو طعم“ کا مفہوم عربی زبان میں ”صاحب ذوق“ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں تمام بڑے بڑے کارنامے انہیں لوگوں نے انجام دیے ہیں جن کے اندر کسی شی کو ردّ و قبول کرنے کا مزاج ”ذوق“ کی حیثیت اختیار کر گیا ہو۔ وہ ذاتی فائدوں اور مصلحتوں کے تحت نہ کسی شی کو ردّ کریں اور نہ قبول۔

سیدنا عمرو بن العاصؓ نے بھی صاحب ذوق ہونے کی حیثیت سے اسلام کو قبول کیا تھا۔ اور پھر اپنا تن، من اور دھن اس پر صرف کر دیا۔ خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ نے مجھے کہلا بھیجا کہ

”اپنے کپڑے پہنو، ہتھیار لو اور میرے پاس آ جاؤ۔“

سیدنا عمرو بن العاصؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم کی تعمیل کی بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو گئے۔ آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا:

”عمرو! میں تمہیں ایک لشکر پر امیر بنا کر بھیج رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دشمن سے محفوظ بھی رکھے گا اور بہت سامان غنیمت بھی عطا فرمائے گا۔ اور میں تمہیں مال کی اچھی رغبت دلا رہا ہوں۔“

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ بات سن کر عمروؓ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، بارگاہِ نبوت میں عرض کی۔

”یا رسول اللہ! میں مال کی وجہ سے اسلام نہیں لایا، میں تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اسلام لایا ہوں۔“

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا اور کہا:

”عمرو! اچھے اور صالح آدمی کے لیے بھلا مال بہترین شی ہے۔“

……❀……

جنت کی خوشبو

احد کی جنگ قریباً ختم ہو چکی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی زخمی تھے اور دوسرے کئی اور صحابہ کرامؓ بھی شدید زخمی ہو چکے تھے۔ مسلمانوں میں سے قریباً ستر آدمی جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ اچانک مسلمانوں کی فوج کے سپہ سالار اعظم ﷺ نے پاس کھڑے صحابی سیدنا زیدؓ بن ثابت سے فرمایا کہ سعد بن ربیع انصاریؓ کا پتہ کرو کہ وہ کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں؟ اگر وہ زخمی حالت میں ملیں تو انہیں میرا سلام کہنا اور انہیں میری طرف سے حال پوچھنا۔

سیدنا زید بن ثابتؓ اسی وقت میدان کارزار میں گئے اور زخمیوں اور مقتولین میں انہیں تلاش کرنا شروع کیا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد آخر انہیں پالیا۔ دیکھا کہ انہیں ستر زخم آئے ہوئے ہیں اور وہ اپنی آخری سانسوں پر ہے۔ زخم کچھ تلواروں کے تھے، کچھ نیزوں کے اور کچھ تیروں کے تھے۔

سیدنا زید بن ثابتؓ ان کے سرہانے بیٹھ گئے اور کہا:

> ”سعد! رسول اللہ ﷺ نے تمہیں سلام کہا بھیجا ہے اور دریافت فرمایا ہے کہ تمہارا کیا حال ہے؟“

سعدؓ نے آنکھیں کھولیں۔ رسول اللہ ﷺ کا سلام سن کر خوشی سے آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی۔ فرمایا:

> ”زید! حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور تم پر بھی میرا سلام۔ میری طرف سے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کر دینا کہ میں اپنے آپ کو اس حال میں پا رہا ہوں کہ مجھے جنت کی خوشبوئیں آ رہی

ہیں، اور میری قوم انصار سے کہہ دینا کہ تم لوگوں کا اب کوئی عذر اللہ تعالیٰ کے ہاں مسموع نہیں ہوگا، اگر کسی کافر نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک رسائی پالی اور میری آنکھوں کا کنارا تم ہی لوگوں کی طرف لگا ہوا ہے۔"

بس اتنا کہا اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

بچہ ناز رفتہ باشد زیں جہاں نیاز مندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

……

مشرکین مکہ سے آخری جنگ

ابوسفیان اسلامی لشکر کا جاہ و جلال دیکھ چکے تھے۔ انہیں اپنی عمر بھر کی غلطیوں کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ [illegible] اسلام کا مقابلہ کر کے ساری عمر جھک ماری [illegible] میں منصب ہی ایسا تھا کہ انہیں مقابلہ کرنا ہی پڑتا تھا۔ سوائے جنگ بدر کے جبکہ ابوسفیان مکہ میں موجود نہ تھے، ہر جنگ میں کفر کے لشکر کی قیادت انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ مسلمانوں سے لڑے اور خوب لڑے لیکن ہر جنگ میں منہ کی کھائی۔ پہلے یہ حملہ آور ہوتے تھے لیکن اب اسلامی لشکر مکہ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ مکہ جو ان کی پناہ گاہ تھا اب وہ اس میں محصور تھے۔

ابوسفیان اب تھک چکے تھے۔ اسلام کی حقانیت اور صداقت اب ان کے دل میں جگہ پکڑ چکی تھی۔ وہ اب اسلامی لشکر سے نہ لڑنا چاہتے تھے اور نہ مزاحمت کرنا چاہتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے لشکر کے مکہ مکرمہ میں داخلہ سے ایک روز قبل حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے مگر اپنے ساتھیوں میں ابھی اس کا اعلان نہیں کیا تھا۔ صرف سرکار دو عالم ﷺ اور سیدنا عباسؓ کو اس بات کا علم تھا۔

لیکن مقیس، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو (جس نے قریش کی طرف سے صلح حدیبیہ کے معاہدہ پر دستخط کیے تھے) اور عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ جمع تھے، اور قریش کے سر پھروں کی ایک چھوٹی سی جماعت کی تنظیم کر رہے تھے۔ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ حویرث بن نقیل بھی ان کے ساتھ اس معاملہ میں شریک تھا۔ ان لوگوں کو ابوسفیان کے اس رویہ سے سخت اختلاف تھا۔ یہ لوگ ہر قیمت پر مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنا چاہتے تھے۔

مکہ پر ان کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا سرور کائنات ﷺ اور آپ کے ساتھی مہاجرین کا کیونکہ وہ بھی اسی مکہ میں پیدا ہوئے۔ یہیں ان کا بچپن اور لڑکپن گذرا اور اسی

سرزمین میں انہوں نے اپنی جوانی کے ایام گذارے، لیکن اب انہوں نے ان کی اذیتوں سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مکہ کو چھوڑ دیا تھا، لہٰذا اب یہ کفر کے اساطین مکہ کو بلاشرکت غیرے اپنا سمجھتے تھے۔

فتوح البلدان میں بلاذری نے لکھا ہے کہ حماش بن قیس بن خالد بھی اس گروہ کے سرغنوں میں تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے مکہ مکرمہ پہنچنے سے قبل ہی ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ڈھیر سارے ہتھیار دیکھ کر اس کی بیوی نے پوچھا:

''تم اتنے سارے ہتھیار کیوں جمع کر رہے ہو؟''

''نیک بخت! تجھے نہیں معلوم کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھی ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔''

اس نے اپنی بیوی کو جواب دیا۔

''ان کا حملہ ہوگا تو پھر تمہارے ہتھیار تو کسی کام نہ آئیں گے؟''

بیوی نے پوچھا:

کیونکہ وہ احد اور خندق کے معرکوں کا حال جان چکی تھی کہ کس طرح یہ لوگ مسلمانوں کی فوج کے ہاتھوں پٹے تھے۔ حماش نے سمجھ لیا کہ بیوی طنز کر رہی ہے، بولا:

''نیک بخت! ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے لیے بہت سے غلام پکڑ کر لائیں گے۔''

شرپسندوں میں حُبشی نامی پہاڑی کے دامن میں رہنے والے تیراندازوں کے علاوہ بنوبکر اور قبیلہ حارث کے لوگ بھی شریک تھے۔

یہ لوگ اپنی تیاریوں میں مصروف تھے کہ مسلمانوں میں سے دو شخص ان کے قریب سے گزرے بخاری میں ان کے نام کرز بن جابر الفہری اور حبیش ابن اشعرؓ مذکور ہیں۔ یہ کرز بن جابر الفہریؓ قریش کے بڑے دلیر آدمیوں میں سے تھے۔ مسلمانوں کے مدینہ طیبہ ہجرت کر جانے کے بعد قریش کے جس آدمی نے پہلی مرتبہ مدینہ کے قریب آ کر دھاوا بولا تھا، وہ یہی کرزؓ تھے۔ انہوں نے مدینہ کی مشہور چراگاہ شرج کو تاراج کر دیا تھا۔ یہ سنہ ۲ھ کا واقعہ ہے۔ یہی کرزؓ آج مسلمانوں کی طرف سے مکہ میں مقابلہ کرنے

کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔

کرزؓ اور حبیشؓ اپنی جمعیت کے ساتھ آگے آگے آ رہے تھے بلکہ اس حد تک آ رہے تھے کہ ان سے بچھڑ گئے۔ جب یہ لوگ عکرمہ اور اس کی جماعت کے قریب پہنچے تو ان لوگوں نے بڑھ کر ان پر حملہ کر دیا۔ حبیشؓ ان کی زد میں تھے، لہٰذا شہید ہو گئے، لیکن کرزؓ سینہ تان کر ڈٹ گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ انجام کیا ہو گا۔ حبیشؓ کی لاش کو گھسیٹ کر انہوں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے پیروں میں کر لیا تا کہ دشمن اس پر قبضہ نہ کر لیں، اور اس کی توہین اور بے حرمتی نہ کریں۔ اتنی دیر میں سیدنا خالد بن ولیدؓ وہاں پہنچ گئے۔ کرزؓ مردانہ وار لڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

جونہی خالدؓ وہاں پہنچے تو قریش کے تیر اندازوں نے ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ خالدؓ اللہ کی تلوار تھے۔ وہ ان تیروں سے کب ڈرنے والے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کا حکم تھا کہ لڑائی میں پہل نہیں کرنی۔ دشمن کی طرف سے اگر پہل ہو تو پھر ضرور مقابلہ کیا جائے۔ یہ سب کچھ مکہ اور بیت اللہ کے احترام کے لیے تھا۔

خالدؓ نے جب دشمن کی طرف سے پہل دیکھی اور انہیں پتہ چلا کہ کرزؓ اور حبیشؓ دونوں کو شہید کر دیا گیا ہے اور اب مجھ پر بھی انہوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی ہے تو خالدؓ نے انہیں تلوار کی نوک پر دھر لیا۔ خالدؓ ایک مشہور سپہ سالار اور اللہ کی تلوار، اور یہ اٹھائی گیرے۔ دونوں میں کیا مقابلہ۔ دیکھتے دیکھتے بدبخت پٹ کر ایسے بھاگے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بھاگنے والوں میں آگے آگے وہی تھے جو لڑنے میں بھی پیش پیش تھے۔ ان میں عکرمہ، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو تو ایسے بھاگے کہ محاذِ جنگ تو کیا شہر مکہ ہی چھوڑ کر چلے گئے اور جدہ پہنچ کر راہِ فرار اختیار کرنے کی فکر میں لگ گئے۔

جماش جو کئی دنوں سے اسلحہ جمع کر رہا تھا، منہ کی کھا کر گھر بھاگا ہوا آیا۔ بیوی نے دیکھا کہ منہ لٹکائے ہوئے آ رہا ہے، تو پوچھا

> ''جانِ من! آپ اکیلے آ رہے ہیں۔ میرے غلام کہاں ہیں؟ سنتی ہوں کہ مسلمان یہاں بھی آ گئے اور شہر مکہ میں داخل بھی ہو گئے؟''

جماش نے اب جو کچھ اپنی بیوی سے کہا وہ سننے کے قابل ہے، بولا:

> "اگر تو خندمہ کی جنگ میں ہوتی تو دیکھتی کہ صفوان بھاگا تو عکرمہ بھی بھاگا، اور ابو یزید (سہیل بن عمرو) ایسے کھڑا تھا جیسے کوئی بیوہ ہو۔ مسلمان تلواریں لیے آ رہے تھے اور کھوپڑیاں کاٹتے جا رہے تھے۔ اگر تو وہاں ہوتی تو تجھے اس وقت سوائے ان کی گرج کڑک کے کچھ سنائی نہ دیتا۔ ان کے دھاڑنے اور للکارنے کی آوازیں تو سنتی تو اس وقت یہ طنز مجھ پر نہ کرتی۔"

یہ مشرکین مکہ کے ساتھ مسلمانوں کی آخری جھڑپ تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ مشرکین کے اس جھڑپ میں تیرہ آدمی مارے گئے۔ بعض حضرات اٹھائیس کہتے ہیں۔ باقی لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی رحمت عالم ﷺ نے انہیں پھر بھی معاف کر دیا۔

◆

﴿عقیدت﴾

سہیل بن عمروؓ حدیبیہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے آئے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دشمن بلکہ اسلام کے دشمن۔ رویہ میں خاصی سختی تھی۔ معاہدہ جب لکھا جانے لگا تو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پر جھگڑا کھڑا کر دیا۔ پھر ''محمد رسول اللہ'' لکھنے پر جھگڑا۔ پھر اپنے لڑکے ابو جندلؓ کے واپس لوٹانے پر تنازعہ کھڑا کر دیا۔ سرکار دو عالم ﷺ اس کی ہر بات مانتے رہے یہاں تک کہ صحابہ کرامؓ زچ ہو گئے کہ آپ اتنے جھک کر ان لوگوں کی شرائط کیوں مان رہے ہیں، لیکن نگاہ نبوت بڑی دور رس تھی۔ صحابہ کرامؓ کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔

سیدنا صدیق اکبرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام میں کوئی فتح حدیبیہ کی فتح سے بڑھ کر نہیں ہوئی۔ لوگ جلد بازی کرتے ہیں لیکن اللہ بندوں کی طرح جلد بازی نہیں کرتا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حجۃ الوداع میں آپ سے قربانی کے اونٹ یکے بعد دیگرے خود آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر ایک اونٹ یہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھے قربان کیا جائے۔ گویا کہ

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود بکف نہادہ
بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

سہیل بن عمروؓ بھی یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اونٹوں کی قربانی کے بعد سرکار دو عالم ﷺ نے حجام کو بلایا اور اپنا سر منڈایا۔

سیدنا ابوبکرؓ فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ سہیل آپ کا ایک ایک بال چنتے ہیں اور اس کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ سہیلؓ کے دل میں اس منظر کو دیکھ کر کہ اونٹ آپ کی چھری کے سامنے سر جھکا رہے ہیں، آپ سے ایک خاص عقیدت ہو گئی۔ اسلام کی محبت دل کی اتھاہ گہرائیوں میں گھر کر گئی۔ قلب و ذہن بدل گیا۔ دشمنی محبت میں تبدیل ہو

گئی۔ اس کا اثر تھا کہ اب ایک ایک بال کو چن چن کر آنکھوں سے لگایا جا رہا تھا۔ جس کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے، اب اس کے بالوں کو آنکھوں سے لگایا جا رہا ہے۔

سیدنا صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں کہ میں سہیلؓ کی اس عقیدت کو دیکھ کر سوچتا جاتا تھا کہ یہ وہی سہیلؓ ہیں جو حدیبیہ کی صلح کے موقع پر اس قدر بگڑے تھے کہ ''بسم اللہ'' نہ لکھا جائے، ''محمد بن عبداللہ'' لکھا جائے ''محمد رسول اللہ'' نہ لکھا جائے۔ اس وقت اپنے بیٹے ابو جندلؓ کو زنجیروں میں جکڑا کیونکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شیدا تھا۔ اب خود اس کے اسیر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر فرمایا: ''تعریف اس خدا کی جس نے سہیل بن عمروؓ کو اسلام کی ہدایت دی۔''

◆

﴿حیرہ کی فتح﴾

حیرہ عراق کا ایک شہر ہے بلکہ مورخین اسے باب العراق یعنی عراق کا دروازہ کہتے ہیں۔ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے جب اس شہر کا محاصرہ کیا تو اہل حیرہ نے صلح کے لیے عمرو بن عبد المسیح کو سپہ سالار لشکر سیدنا خالد بن ولیدؓ کی خدمت میں بھیجا۔ اس کی عمر اس وقت تین سو سال تھی اور اس کا لقب "ابن بقیلہ" تھا۔ ابن عبد المسیح ایک مرتبہ سبز چادریں اوڑھے ہوئے آیا تھا اس وجہ سے لوگ اسے ابن بقیلہ کے نام سے یاد کرنے لگے۔

عمرو بن المسیح اپنے ہاتھ میں ایک شیشی لایا تھا جس میں "سم ساعۃ" (ایسا زہر جو فوری طور پر آدمی کو ہلاک کر دے) تھا۔ یہ اس لیے کہ اگر کوئی صلح کی بات نہ بنے تو زہر کھا کر فوری طور پر مر جائے۔ اس نے سیدنا خالدؓ کو وہ شیشی دکھائی۔ سیدنا خالدؓ نے زہر کو ہتھیلی پر رکھ کر فرمایا

"کوئی شخص اجل معین سے قبل نہیں مرتا۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔"

یہ کہہ کر آپ نے یہ دعا پڑھی:

﴿باسم اللّٰہ خیر الاسماء ورب الارض والسماء الذی لا یضرہ مع اسمہ شئی﴾

اور وہ زہر نگل گئے۔ ابن بقیلہ یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور سیدنا خالدؓ سے کہا

﴿واللّٰہ لتبلغن ما اردتم مادام احد منکم ھکذا﴾

……

زاہدانہ زندگی

عمیر بن سعدؓ انصاری رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے۔ قبیلہ اوس سے تعلق تھا۔ ملک شام میں بازنطینی حکومت کے ساتھ قریباً سب لڑائیوں میں شریک رہے۔ سیدنا عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں انہیں حمص کا گورنر مقرر فرمایا۔ آپ اس قدر عابد و زاہد تھے کہ ان کی عبادت و ریاضت اور ان کا زہد و تقویٰ حدِ کرامت کو پہنچا ہوا تھا۔

کنز العمال وغیرہ میں ہے کہ جن دنوں یہ حمص کے گورنر تھے، ان کے پاس امیر المؤمنین سیدنا عمرؓ کا ایک خط پہنچا جس میں لکھا تھا:

> ”اے عمیر! ہم نے تم کو ایک اہم عہدہ سپرد کر کے حمص بھیجا تھا مگر کچھ پتہ نہیں کہ تم اپنا یہ عہدہ خوش اسلوبی سے چلا رہے ہو کہ نہیں؟ لہٰذا جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے، فوراً جس قدر مال غنیمت تمہارے بیت المال میں جمع ہے، سب کو اونٹوں پر لدوا کر اپنے ساتھ لے کر مدینہ طیبہ میرے سامنے حاضر ہو۔“

دربارِ خلافت کا یہ فرمان پڑھ کر اسی وقت کھڑے ہو گئے اور اپنی لاٹھی میں اپنی چھوٹی سی پانی کی مشک اور خوراک کی تھیلی اور ایک بڑا سا پیالہ لٹکا کر لاٹھی کندھے پر رکھی اور ملک شام سے پیدل مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب دربارِ خلافت میں پہنچے تو امیر المؤمنین ان کی خستہ حالی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ فرمایا

> ”کیوں اے عمیر! تمہارا حال اتنا خراب کیوں ہے؟ کیا تم بیمار ہو گئے تھے؟ یا تمہارا شہر بدترین شہر ہے؟ یا تم نے مجھے دھوکہ دینے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے؟

امیر المؤمنین کے ان سوالوں کو سن کر سیدنا عمیرؓ نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا:

"امیر المومنین! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی جاسوسی سے منع نہیں فرمایا؟ آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ میرا حال خراب ہے؟ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں بالکل تندرست و توانا ہوں اور اپنی پوری دنیا کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے آپ کے سامنے حاضر ہوں۔"

امیر المومنین نے فرمایا:

"عمیر! تو دنیا کا کون سا سامان لے کر آئے ہو؟ میں تو تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا۔"

سیدنا عمیرؓ نے عرض کی:

"امیر المومنین! دیکھئے، یہ میری خوراک کی تھیلی ہے۔ یہ میری مشک ہے جس سے میں وضو کرتا ہوں اور اسی میں اپنے پینے کا پانی رکھتا ہوں۔ اور یہ میرا پیالہ ہے اور یہ میری لاٹھی ہے جس سے میں اپنے دشمنوں سے بوقت ضرورت جنگ بھی کرتا ہوں اور سانپ وغیرہ زہریلے جانوروں کو بھی مارتا ہوں۔ یہ سارا سامان میری دنیا نہیں تو اور کیا ہے؟"

یہ سن کر امیر المومنین نے فرمایا "عمیر! اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ تم تو عجیب آدمی ہو۔"

پھر امیر المومنین نے ان سے رعایا کا حال دریافت کیا اور مسلمانوں کی دینی زندگی اور ذمیوں کے بارہ میں پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا:

"الحمدللہ! میری حکومت کا ہر مسلمان ارکان اسلام کا پورا پورا پابند اور اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور میں ذمیوں سے جزیہ لے کر ان کی پوری پوری حفاظت کرتا ہوں۔ اور میں اپنے عہدہ کی ذمہ داریوں کو نبھانے کی بھرپور کوشش کرتا رہا ہوں۔

پھر امیر المومنین نے خزانے کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں لائے۔ میں

نے تو تمہیں اس کے لانے کے لیے بھی کہا تھا۔ اس صحابی رسول نے جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے عرض کی:

> ''امیر المومنین! خزانہ کیسا؟ میں ہمیشہ مالدار مسلمانوں سے زکوٰۃ و صدقات وصول کر کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیا کرتا ہوں۔ اگر میرے پاس فاضل مال بچتا تو میں ضرور اس کو آپ کے پاس بھیج دیتا۔''

کیسا ذمہ دارانہ جواب دیا سیدنا عمیرؓ نے۔ یہ نہیں کہا کہ میں زکوٰۃ و صدقات اور ملکی ٹیکسوں کو ہارس ٹریڈنگ یا غیر ملکی دوروں یا اپنی پارٹی اور چہیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے یا اگلے الیکشن کی تیاری کے لیے یا پھر اپنے عیش یا عیاشی پر خرچ کرتا ہوں بلکہ یہ جواب دیا کہ فقراء اور مساکین کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا ہوں۔ ان کی محتاجی کو دور کرنے پر خرچ کرتا ہوں۔

پھر امیر المومنینؓ نے پوچھا:

> ''عمیر! تم حمص (شام) سے مدینہ طیبہ تک پیدل سفر کر کے آئے ہو کیا تمہارے پاس سواری نہیں تھی؟ اور اگر سواری نہیں تھی تو کیا تمہاری سلطنت کی حدود میں مسلمانوں اور ذمیوں میں کوئی آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو تمہیں سواری کا ایک جانور دے دیتا؟''

عرض کی:

> ''امیر المومنین! میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ میری امت میں کچھ ایسے حاکم ہوں گے کہ اگر رعایا خاموش رہے گی تو یہ حکام انہیں برباد کر دیں گے اور اگر رعایا فریاد کرے گی تو یہ حکام ان کی گردنیں اڑا دیں گے۔ اور میں نے سرکار دو عالم ﷺ سے یہ بھی سنا ہے کہ تم لوگ اچھی باتوں کا حکم دیتے رہو اور بری باتوں سے منع کرتے رہو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط فرما دے گا جو بدترین انسان ہوں گے۔ اس وقت نیکوں کی دعائیں بھی

> قبول نہ ہوں گی۔ اے امیر المومنین! میں ان برے حاکموں میں سے ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے میں پیدل چلنا گوارا ہے لیکن اپنی رعایا سے کچھ طلب کرنا یا ان کے [illegible] لینا یا ان کو قبول کرنا ہرگز پسند نہیں ہے۔"

سیدنا عمیرؓ کا یہ جواب سن کر امیر المومنین نے فرمایا:

> "عمیر! میں تمہاری کارگزاریوں سے بہت خوش ہوا ہوں۔ لہٰذا تم واپس اپنی حمص جا کر گورنری کے فرائض انجام دیتے رہو۔"

آج کل تو سفارشیں کروا کر اور رشوتیں دے کر عہدے حاصل کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے دولت اکٹھی کی جائے۔ یہ جمہوریت اور عوامی نمائندگی تو نرا فراڈ اور دھوکہ ہے۔ یہ امیروں نے غریبوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے نظام بنایا ہوا ہے۔ اس میں تو عوام کو صدائے احتجاج بلند کرنے کا بھی موقع نہیں دیا جاتا۔ عوام جب کبھی کسی بات پر احتجاج کرتے ہیں تو انہیں یہ کہہ کر سلا دیا جاتا ہے کہ یہ حکومت تو تمہاری ہے۔ ہم تو تمہارے خادم ہیں۔ تم ہی نے تو ہمیں ووٹ دے کر آگے بھیجا تھا۔ اقبال نے سچ کہا تھا

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اسلامی حکومت میں حال یہ ہے کہ عہدے دیے جاتے ہیں لیکن انہیں کوئی قبول نہیں کرتا۔ سیدنا عمرؓ کی اس پیش کش پر سیدنا عمیرؓ نے نہایت لجاجت سے گڑگڑا کر کہا:

> "امیر المومنین! میں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر اس عہدہ کو قبول کرنے سے معافی کا طلبگار ہوں اور اب میں کبھی بھی اس اہم عہدہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آپ مجھے اس سے معاف فرما دیجیے۔"

آج کل اگر کسی کو کوئی عہدہ مل جائے تو پھر وہ اس سے ایسا چمٹتا ہے کہ اس کو چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بلکہ اپنی قیمت ڈلواتے ہیں۔ اسی لیے ان کا نام لوٹے رکھا گیا ہے۔

یہ لوٹے یہ تیرے پراسرار بندے   جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ تباہی
پوشاک ان کی اجلی ضمیر ان کے کالے   مزاج ان کے شہدے، دماغ ان کے شاہی
تکبر، تنفر، رعونت، خصومت   جو دیکھے پکارے دہائی دہائی
دعا کر رہے ہیں یہاں لوگ کب سے
یہ لوٹے ڈریں کچھ خدا کے غضب سے

اسلام لوٹے پیدا نہیں کرتا بلکہ عمیر بن سعدؓ جیسے لوگ پیدا کرتا ہے۔ سیدنا عمیرؓ کے جواب نے امیر المومنینؓ کو لاجواب کر دیا۔ لہٰذا فرمایا: ''اگر تم اس عہدہ کو قبول نہیں کر سکتے تو پھر میری طرف سے اجازت ہے کہ تم اپنے گھر والوں کے ساتھ رہو۔ چنانچہ یہ مدینہ طیبہ سے تین دن کی مسافت کی دوری پر ایک بستی میں جہاں ان کے اہل وعیال رہتے تھے، جا کر مقیم ہو گئے۔

کچھ دنوں کے بعد امیر المومنینؓ نے ایک سو اشرفی ایک تھیلی میں بند کر کے اپنے ایک ساتھی حبیب کو یہ کہہ کر دی کہ تم عمیرؓ کے مکان پر تین دن تک مہمان بن کر رہو، پھر تیسرے دن یہ تھیلی میری طرف سے ان کی خدمت میں پیش کر کے کہہ دینا کہ وہ ان اشرفیوں کو اپنی ضروریات میں خرچ کریں۔

حبیب امیر المومنین کی ہدایت کے مطابق ان اشرفیوں کی تھیلی کو لے کر سیدنا عمیرؓ کے مکان پر پہنچے اور امیر المومنین کا سلام عرض کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دینے کے بعد امیر المومنین کی خیریت پوچھی اور ان کی حکمرانی کے بارہ میں دریافت کیا اور پھر امیر المومنین کے لیے دعائیں کیں۔

سیدنا حبیبؓ تین روز تک ان کے مکان پر بطور مہمان مقیم رہے اور ہر روز کھانے میں دونوں وقت ایک روٹی اور زیتون کا تیل انہیں ملتا رہا۔ تیسرے روز سیدنا عمیرؓ نے انہیں فرمایا:

''حبیب! اب تمہاری مہمانی کی مدت ختم ہو گئی، لہٰذا آج تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔ ہمارے گھر میں اتنا ہی خوراک کا سامان تھا جو ہم نے خود بھوکے رہ کر آپ کو کھلا دیا۔''

یہ سن کر حبیبؓ نے سیدنا عمر فاروقؓ کی ہدایت کے مطابق اشرفیوں کی تھیلی انہیں پیش کر دی اور کہا: امیر المومنین نے آپ کے اخراجات کے لیے یہ تھوڑی سی رقم بھیجی ہے۔ آپ نے تھیلی ہاتھ میں لے کر ارشاد فرمایا:

> ''حبیب! میں سرکارِ دو عالم کی صحبت سے سرفراز ہوا، لیکن اس وقت دنیا کی دولت سے میرا دامن کبھی داغدار نہیں ہوا۔ پھر میں نے امیر المومنین سیدنا ابوبکرؓ کی صحبت اٹھائی لیکن ان کے عہد میں بھی دولتِ دنیا کی آلودگیوں سے محفوظ رہا، لیکن یہ زمانہ میرے لیے بدترین دور ثابت ہوا کہ میں امیر المومنین کے حکم سے مجبور ہو کر بادلِ نخواستہ حمص کا گورنر بنا اور اب امیر المومنین نے یہ دنیا کی دولت میرے گھر میں بھیج دی ہے۔''

ابھی اتنے الفاظ ہی کہے تھے کہ ان کی آواز بھرا گئی اور پھر زار و قطار رونے لگے۔ ان کے آنسوؤں کی دھار ان کے رخساروں پر بہنے لگی اور انہوں نے اشرفیوں کی تھیلی حبیبؓ کو واپس کر دی۔ یہ دیکھ کر ان کی اہلیہ نے آواز دی کہ اس تھیلی کو واپس نہ کیجیے کیونکہ یہ خلیفۂ رسول عمرؓ کا عطیہ ہے۔ اس کو رد کر دینے سے امیر المومنین کی دل شکنی ہو گی اور یہ آپ کی شان کے لائق نہیں ہے کہ آپ امیر المومنین کے لیے دلی صدمہ کا باعث بنیں۔ اس لیے آپ اس تھیلی کو لے کر حاجت مندوں کو دے دیجیے۔ اہلیہ کے مخلصانہ مشورہ کو قبول فرماتے ہوئے آپ نے تھیلی اپنے پاس رکھ لی اور فوراً ہی فقراء و مساکین کو بلا کر تمام اشرفیاں تقسیم کر دیں اور ان میں سے ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا حالانکہ خود سب سے زیادہ محتاج تھے۔

سیدنا حبیبؓ اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور مدینہ طیبہ پہنچ کر جب امیر المومنین کو یہ سارا واقعہ سنایا تو امیر المومنین پر بھی رقت طاری ہو گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور دیر تک روتے رہے۔ پھر جب آنسو تھمے تو فوراً سیدنا عمیرؓ کی طلبی کے لیے ایک فرمان لکھا اور ایک قاصد کے ذریعہ یہ فرمان ان کے گھر بھیجا۔

فرمانِ خلافت پڑھ کر فرمایا کہ امیر المومنین کے حکم کی تعمیل مجھ پر واجب ہے۔ اور

اسی وقت پیدل مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے۔ تین روز کا سفر کر کے دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔ امیر المومنین نے پوچھا: عمیرؓ! جو اشرفیاں میں نے تمہیں بھیجی تھیں، ان کا کیا ہوا؟“ عرض کی: ”امیر المومنین! میں نے اسی وقت سب اشرفیاں اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیں۔“

امیر المومنین حیرت سے ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر اپنے بیٹے عبداللہؓ سے فرمایا کہ تم بیت المال سے دو کپڑے لا کر عمیرؓ کو پہنا دو اور ایک اونٹ پر کھجوریں لاد کر ان کو دے دو۔ آپ نے عرض کی:

> ”امیر المومنین! کپڑوں کو تو میں قبول کر لیتا ہوں کیونکہ کپڑے میرے پاس نہیں ہیں، لیکن کھجوریں میں ہرگز نہیں لوں گا کیونکہ میں ایک صاع کھجوریں اپنے مکان پر رکھ آیا ہوں جو میری واپسی تک میرے اہل و عیال کے لیے کافی ہیں۔“

پھر عمیرؓ واپس آ گئے اور چند ہی روز کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

جب امیر المومنین کو ان کے انتقال کی خبر ملی تو بہت روئے اور فرمایا: ”کاش عمیر بن سعدؓ جیسے صاف باطن و پاکباز اور پیکر اخلاص چند مسلمان مجھے مل جاتے تو ان سے مسلمانوں کے کاموں میں مدد لیتا۔“

* * *

﴿جہاں بانی کا ایک بہترین اصول﴾

اسلام دوسرے مذاہب وادیان کی طرح صرف عبادت گاہ کا دین نہیں بلکہ اس نے ایک انسان کو دنیا میں رہنے کے لیے زندگی کے ہر شعبہ کے بارہ میں اصول فراہم کیے۔ چنانچہ حکمرانی اور جہانبانی کے اصول بھی حکمرانوں کو بتائے اور اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ حکمرانوں نے جب تک ان اصولوں پر عمل کیا، راعی اور رعایا دونوں پر امن اور خوشحال رہے لیکن جونہی حکمرانوں نے ان اصولوں کو خیر باد کہہ کر اپنی مرضی کے اصول یا مغرب سے درآمدہ اصولوں پر حکمرانی کو استوار کیا، خود بھی پریشان اور رعایا کو بھی پریشان اور مفلوک الحال بنا رکھا ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے اور اس ارشاد میں آپ نے ایک سیاسی اصول کی تعلیم فرمائی

﴿ان الامیر اذا ابتغی الریبة فی الناس افسدھم﴾

(ابوداؤد)

"جو حکمران لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ اس کو برباد کر دے گا۔"

اور عمال سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ سیدنا معاویہؓ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات علیہ افضل الصلوات والتحیات نے ارشاد فرمایا

﴿انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم او کدت ان تفسدھم﴾ (ابوداؤد)

"اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا عنقریب برباد کر دو گے۔"

چنانچہ جب تک صحابہ کرامؓ کا دور قائم رہا تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل

ہوتا رہا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے نہیں دیکھا تھا، اس لیے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے اور تجسس کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ علامہ ابن خلدونؒ نے اس پر مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوتؐ میں ملتا ہے۔ اس لیے اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی ہے۔

علامہ ابن خلدون اندلسیؒ لکھتے ہیں:

> ”جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول، وسعت علم، حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور وہ دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے۔ سلطان کی حقیقت، صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے، اس لیے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی حکمران ہو۔ اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے اسی کا نام بادشاہی اور حکومت ہے۔ پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم درست اور ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد پورے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر اور ان کی ہلاکت کا

سبب ہے۔ سلطنت کی خوبیوں کا تمام تر دارومدار نرمی پر ہے کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معایب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے، اور لوگ اس سے بچنے کے لیے جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظامِ اخلاق برباد ہو جاتا ہے۔ وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی برتے اور ان کی غلطیوں اور گناہوں سے درگذر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں۔ پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام درست اور ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم اور توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں، مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کے معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے۔ اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے۔ جاننا چاہیے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے۔ نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دوررس ہوتی ہے اور وہ ابتداء ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لیے لوگوں کو تکلیف مالایطاق دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کمزور لوگوں کی روش

اختیار کرو۔ اور حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی کہ وہ بہت چالاک نہ ہو۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے جب زیاد بن ابی سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے عرض کی، امیر المومنین! کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ سیدنا عمرؓ نے جواب دیا کہ ”یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔“

موجودہ مسلمان حاکموں کو حضور ﷺ کے اس اصول کو اپنانا چاہیے۔

* * *

کردار

سرکار دو عالم ﷺ کے صحابی سیدنا ابو ہریرہؓ مدنی زندگی کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے نجد کے لوگوں کی طرف چند سوار بھیجے جو آپ کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ وہ شہر یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال کو راستہ میں پا گئے اور اس کو گرفتار کر کے پکڑ لائے۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر انہوں نے اس کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ سرکار دو عالم ﷺ اس کے پاس تشریف لائے اور اس کا حال پوچھا۔ ثمامہ نے جواب دیا:

> ”اگر آپ نے مجھ کو قتل کر دیا تو میری قوم آپ سے میرے خون کا بدلہ لے گی۔ اور اگر آپ مجھ کو چھوڑ دیں گے تو میں عمر بھر آپ کا احسان مانوں گا، اور اگر مال کی خواہش ہے تو جتنا مال چاہو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“

رسول اللہ ﷺ نے اس کی رہائی کا حکم دے دیا۔ یہ واقعہ اس وقت کی دنیا میں بہت عجیب تھا کیونکہ قبائلی زندگی میں کسی دشمن کے ہاتھ آ جانے کے بعد اس کا ایک ہی انجام تھا اور وہ یہ کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ سرور دو عالم ﷺ نے اس کے جسم کو تو قتل نہیں کیا، لیکن اپنے اخلاقی سلوک سے اس کی روح کو قتل کر دیا۔

چنانچہ قید سے چھوٹنے کے بعد ثمامہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجد نبوی میں آیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ دوبارہ کس لیے یہاں آیا ہے، مگر جب اس نے بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو چھوڑ کر دراصل ہمیشہ کے لیے اس کو گرفتار کر لیا تھا۔

اس کے بعد ثمامہ عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ گیا۔ جب وہ حرم میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ثمامہ کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ ”تم بے دین ہو گئے۔“

ثمامہ نے جواب دیا کہ میں بے دین نہیں ہوا بلکہ میں نے خدا کے رسولؐ کے دین کو اختیار کر لیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ ثمامہ اسلام کی قوت کا ذریعہ بن گیا۔ اس زمانہ میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی ان میں یمامہ ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ ثمامہ نے مکہ والوں سے کہا کہ

> "سن لو! محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی تمہارے یہاں نہیں آئے گا۔"

کردار بظاہر ایک بے قیمت شے ہے لیکن اس کو دے کر آدمی ہر شی خرید سکتا ہے۔

……

ایک مستجاب الدعوات بزرگ

سرزمین اندلس جس کو آج کل اسپین کہتے ہیں، کسی زمانہ میں علم و عمل کا گہوارہ تھی۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے محدث، مفسر، فقیہ، مؤرخ اور فلسفی اور سائنس دان پیدا کیے۔ تیسری صدی ہجری میں ایک بہت بڑے محدث بقی بن مخلد گذرے ہیں جن کا شمار مشہور محدثین میں سے ہے۔ یہ صرف محدث ہی نہیں بلکہ زاہد شب زندہ دار اور نہایت مستجاب الدعوات بھی تھے۔ ان کی استجابت دعا کے بہت سے واقعات مختلف کتابوں میں منقول ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ان کا ایک واقعہ اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ میرے بیٹے کو فرنگیوں نے قید کر رکھا ہے اور فدیہ کے بغیر وہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس کی جدائی سے میں رات بھر جاگتی رہتی ہوں اور میرا دن کا سکون اور رات کا آرام غارت ہو چکا۔ میں ایک غریب عورت ہوں۔ میرے پاس ایک چھوٹے سے مکان کے سوا اور کچھ نہیں۔ اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے وہ مکان فروخت کر دینا چاہتی ہوں تا کہ میں اپنے بیٹے کا فدیہ ادا کر سکوں اور اسے فرنگیوں کی قید سے چھڑا سکوں۔ آپ ایک بزرگ ہیں۔ آپ کسی سے فرما دیجیے کہ وہ میرا مکان خرید لے۔

حضرت بقی بن مخلدؒ نے اس عورت کی یہ آہ و زاری اور فریاد سنی اور فرمایا: ”تم جاؤ، میں اس بارہ میں غور و خوض کروں گا۔“ اس کے ساتھ ہی وہ مراقبہ میں بیٹھ گئے اور اس عورت کے بیٹے کی رہائی کے لیے بارگاہِ الوہیت میں دعا گو ہوئے۔ اس واقعہ کو کوئی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ وہ عورت پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، لیکن اس دفعہ وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کا بیٹا بھی اس کے ساتھ تھا۔

وہ آتے ہی حضرت بقی بن مخلدؒ سے کہنے لگی: ”حضرت! میرا بیٹا فرنگیوں کی قید سے رہا ہو کر آ گیا ہے، لیکن اس سے سنیے کہ اس کے ساتھ کیسا عجیب واقعہ پیش آیا۔“
حضرت بقی بن مخلدؒ نے اس لڑکے سے واقعہ پوچھا۔ وہ کہنے لگا:

”مجھے گرفتاری کے بعد بادشاہ کے ان قیدیوں میں شامل کر دیا گیا

> تھا جو پابہ زنجیر بادشاہ افرنگ کی خدمت کرتے تھے۔ ایک روز میں اپنی بیگار کی خدمت انجام دینے کے لیے جا رہا تھا کہ چلتے چلتے میرے پاؤں کی زنجیر اچانک ٹوٹ کر گر پڑی۔ میری نگرانی پر جو سپاہی متعین تھے، وہ مجھے گالیاں دینے لگے کہ تم نے اپنے پاؤں سے زنجیر کیوں نکالی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ زنجیر اپنے پاؤں سے میں نے خود نکالی ہے۔ میں نے کہا: ''خدا کی قسم! مجھے کوئی علم نہیں کہ یہ زنجیر میرے پاؤں سے کیسے نکلی؟'' چنانچہ انہوں نے لوہار کو بلا کر وہ زنجیر دوبارہ میرے پاؤں میں پہنا دی، اور اب کی دفعہ پہلے سے مضبوط روٹس (Rivets) لگائیں۔ لیکن جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو وہ زنجیر پھر خود بخود گر پڑی۔ انہوں نے پھر وہ زنجیر لگائی لیکن جونہی میں اٹھ کر چلنے لگا تو وہ پھر ٹوٹ کر گر گئی۔
>
> نگران بہت حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ چنانچہ بات بڑے افسروں تک پہنچی۔ ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے راہبوں اور پادریوں سے رابطہ کیا اور ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اس کی ماں زندہ ہے؟ میں نے کہا: 'ہاں۔'' انہوں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ماں نے اس کے لیے دعا کی ہے اور اس کی دعا کی قبولیت کی وجہ سے یہ زنجیر اس کے پاؤں سے گرتی ہے۔''

راہبوں نے متعلقہ لوگوں کو مشورہ دیا کہ اب اسے چھوڑ دیا جائے۔ کارکنان حکومت نے ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے مجھے چھوڑ دیا۔ چنانچہ میں وہاں سے پا پیادہ اسلامی مملکت میں داخل ہو کر گھر آ گیا۔''

حضرت بقی بن مخلدؒ نے اس لڑکے سے زنجیر گرنے کا دن اور وقت پوچھا تو یہ وہی دن اور وقت تھا جب وہ اس کی رہائی کے لیے بارگاہ الوہیت میں دعا کر رہے تھے۔

(البدایہ والنہایہ: جلد ۱۱ ص ۵۷)

﴿ایک عجیب واقعہ﴾

حافظ ابن کثیرؒ نے ہی اپنی تاریخ میں ایک شخص ابن بن طولون کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ یہ بزرگ معتز باللہ کے زمانے میں مصر کے حاکم تھے۔ قبل ازیں وہ مشہور ترکی بادشاہ طولون کے پاس رہتے تھے اور طولون نے ان کی وفاداری، بہادری اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ جب یہ طولون کے پاس رہائش پذیر تھے تو اس دوران انہیں یہ واقعہ پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ طولون نے انہیں کسی کام کے سلسلہ میں دارالامارۃ بھیجا۔ وہاں انہوں نے بادشاہ کی ایک کنیز کو محل کے ایک خادم کے ساتھ بے حیائی اور فحاشی میں مبتلا دیکھا۔ احمد بن طولون جس کام کے لیے گئے تھے اس سے فراغت کے بعد بادشاہ کے حضور پہنچے لیکن اس کنیز اور خادم کے بارہ میں اس سے کوئی ذکر نہ کیا۔

دوسری طرف کنیز کو یہ یقین ہو گیا کہ ابن طولون بادشاہ سے میری شکایت ضرور کر دیں گے اس لیے اس نے اپنے جرم کو چھپانے کے لیے یہ حرکت کی کہ طولون کے پاس جا کر احمد بن طولونؒ کی شکایت کر دی کہ وہ ابھی میرے پاس آئے تھے اور مجھے بے حیائی اور فحاشی پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ کنیز نے شکایت کچھ اس انداز سے کی کہ طولون کو یقین آ گیا کہ واقعی احمد نے یہ حرکت کی ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً احمد بن طولون کو بلوایا اور کنیز کی شکایت کا تو زبانی اس سے کچھ ذکر نہ کیا البتہ ایک مہر شدہ خط اس کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ یہ فلاں امیر کے پاس پہنچا دو۔ اس خط میں طولون نے لکھا تھا کہ ”حامل مکتوب ہذا کو فوراً گرفتار کر کے قتل کر دیں اور اس کا سر میرے پاس بھیج دیں۔“

احمد بن طولون کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس خط میں میرے قتل کی سازش کی گئی ہے۔ وہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں خط لے کر روانہ ہوئے۔ راستہ میں اسی کنیز سے ملاقات ہو گئی۔ کنیز کی خواہش تھی کہ کسی طرح بادشاہ احمد بن طولون کو مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھ لے تاکہ اسے میری شکایت کے درست ہونے کا پورا پورا یقین ہو جائے۔

چنانچہ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے احمدؒ کو باتوں میں الجھانے کی کوشش کی۔ اس سے کہا کہ میں نے ایک ضروری خط لکھوانا ہے۔ آپ مجھے خط لکھ دیں، اور بادشاہ طولون کا جو خط لے کر آپ جا رہے ہیں وہ میں کسی دوسرے خادم کے ہاتھ بھجوا دیتی ہوں۔ احمد بن طولونؒ اس کی ان باتوں میں آ گئے اور وہ خط اس کنیز کے حوالے کر دیا۔ کنیز نے اسی وقت وہ خط اسی خادم کے حوالے کر دیا جس کے ساتھ وہ بے حیائی میں مبتلا ہوئی تھی۔ وہ خادم خط لے کر اسی امیر کے پاس پہنچا۔ امیر نے خط پڑھتے ہی جلاد کو بلا کر اسے قتل کروا دیا اور اس کا سر طولون کے پاس بھیج دیا۔ بادشاہ وہ سر دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ اس نے تو احمد کے قتل کا حکم دیا تھا نہ کہ اس خادم کے قتل کا۔ چنانچہ اس نے احمد بن طولون کو بلوایا اور اس سے حقیقت حال دریافت کی۔ احمد نے وہ سارا ماجرا بادشاہ کے گوش گذار کر دیا۔ کنیز نے بھی اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ بادشاہ احمد بن طولون سے بہت خوش ہوا اور اس روز کے بعد اس کی نظروں میں احمد کی وقعت اور قدر پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی، اور اس نے وصیت کی کہ میرے بعد احمد کو تخت شاہی پر بٹھایا جائے۔” (البدایہ والنہایہ: جلد ۱۱ ص ۴۶)

◆

تو قلق خان کا قبول اسلام

آٹھویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل چنگیز خان کی زیر قیادت ملکوں اور شہروں کو زیر وزبر کرتے ہوئے اسلامی دنیا میں داخل ہوئے اور بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا چنگیز خان وسط ایشیا سے ۱۲۱۹ء میں ساٹھ ہزار وحشی انسانوں کو لے کر نکلا۔ یہ لوگ گھوڑوں پہ سوار ہو کر اور تیر و تلوار لیے ہوئے آبادیوں پہ ٹوٹ پڑے اور تمام تمدنی نشانات کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ عراق، ایران اور ترکستان ان کے قدموں کے نیچے زیر و زبر ہو گئے جہاں اس وقت کی طاقتور ترین سلطنت قائم تھی۔ سارے عالم اسلام پر دہشت و وحشت کا سناٹا چھا گیا۔ ۱۲۵۳ء میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کی سرکردگی میں یہ طوفان دوبارہ اٹھا اور ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی تہس نہس کر ڈالا جو عظیم مسلم خلافت کی بربادی کے بعد ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم عصر مؤرخ علامہ ابن اثیر (۶۳۸ھ) کے الفاظ میں:

> ”اگر کوئی شخص کہے کہ آدم سے لے کر اب تک کوئی ایسا حادثہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو اس کا کہنا غلط نہ ہوگا۔“

ایک مغربی مؤرخ کے نزدیک یہ واقعہ اس قدر ہولناک تھا کہ اس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے:

> ”آسمان نے زمین پر گر کر تمام چیزوں کو مٹا دیا۔“

(Chunghiz Khan By Harld Lamhn P 266)

اس نازک وقت میں اسلام کی وعوتی قوت ہی تھی جس نے تاتاریوں کے نہ رکنے والے سیلاب سے اسلام کو بچایا۔ تاتاری اپنی مفتوح رعایا کے ذریعہ اسلام سے متعارف ہونا شروع ہوئے یہاں تک کہ اسلام نے انہیں فتح کر لیا اور ان کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام کے دشمن اسلام کے پاسبان بن گئے۔ گویا ع

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چنانچہ ایک عیسائی مؤرخ فلپ کے ہٹی نے لکھا ہے:

”مشرق میں وحشی منگولوں کے تیر اندازوں کی یلغار اور مغرب میں زرہ پوش صلیبی سرداروں کے درمیان تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا، مگر اسی صدی کے آخری حصہ میں صورت حال کس قدر مختلف ہو چکی تھی۔ آخری صلیبی اس وقت سمندر میں دھکیلا جا چکا تھا۔ گیارہ تاتاری خانوں میں سے ساتویں خان نے، جن میں سے اکثر و بیشتر (کے یہاں عیسائی بیویاں تھیں اور) وہ عیسائیت کی طرف مائل تھے، بالآخر اسلام کو سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کر لیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب کی یہ کیسی شاندار فتح تھی؛ بالکل سلجوقوں کے معاملہ کی طرح۔ مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔ ہلاکو کے ہاتھوں اسلامی تہذیب کی بے رحمانہ تباہی کے بعد نصف صدی سے بھی کم مدت میں اس کا پوتا غازان مسلمان ہو کر اسی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اور قوت خرچ کر رہا تھا۔“ (History of the Arabs, Hitti, P.488)

ایسا ہی مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کی عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی قوت کم ہو گئی لیکن اس کی روحانی فتوحات بغیر وقفہ کے جاری رہیں۔ اور پھر آخر میں لکھا

The Conquerers have accepted the religion of the Conquered. (T.W. Arnold, The Preaching of Islam, P.2)

تاتاریوں کا یہ قیامت خیز واقعہ امام تقی الدین ابن تیمیہؒ کے زمانہ میں ہوا۔

اسلام کی عظمت کو تباہ و برباد ہوتا دیکھ کر انہیں جوش آیا، اور وہ ایک مجاہدانہ جذبہ کے ساتھ اٹھے اور شام و مصر کے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا کہ جنگ کا علاج جنگ ہے (الحرب انقی للحرب) لیکن وہ اس نعرہ سے تاتاریوں کی فوجی قوت کو ختم نہ کر سکے۔ اس وقت اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہوئی اور اس نے تاتاریوں کے مسئلہ کو نہ صرف ختم کیا بلکہ ان کو اسی اسلام کا خادم بنا دیا جس کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے وہ قسمیں کھا چکے تھے۔

چغتائی مملکت کے زوال کے بعد کاشغر کے جس پہلے مسلمان حکمران نے ایک الگ مملکت قائم کی، تاریخ میں اس کا نام تو تغلق تیمور خان ہے۔ اس نے بخارا کے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کی دعوت و تبلیغ سے اسلام قبول کیا تھا۔ روایت میں ہے کہ یہ شیخ چند مسافروں کے ساتھ نادانستہ طور پر تو تغلق تیمور کی چراگاہ میں داخل ہو گیا اور خان نے حکم دیا کہ اس کی مشکیں باندھ کر اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ جب انہیں حاضر کیا گیا تو تو تغلق خان نے ان سے غضبناک ہو کر پوچھا کہ تم لوگوں نے ہمارے شکار میں خلل ڈالنے کی کیسے جرأت کی؟ شیخ جمال الدین نے جواب دیا کہ ہم بالکل اجنبی ہیں اور اس بات سے مطلق ناآشنا ہیں کہ ہم ایک ممنوعہ قطعۂ زمین میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب تو تغلق خان کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایک ایرانی سے تو ایک کتا بھی بہتر ہوتا ہے۔ شیخ جمال الدین نے جواب دیا کہ ہاں یہ سچ ہے، اگر ہم دین برحق پر نہ ہوتے تو اس صورت میں ہم یقینا کتوں سے بھی بدتر تھے۔ شیخ کے اس جواب سے خان بہت متاثر ہوا اور اس نے حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو اس جرأت مند ایرانی کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ خان نے شیخ کو الگ لے جا کر پوچھا کہ دین برحق کیا شئی ہے؟ اور اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ یہ سن کر شیخ نے اسلام کے عقائد ایسے دینی ولولے سے بیان کیے کہ تو تغلق خان کا دل جو پتھر کی طرح سخت تھا، موم کی مانند پگھل گیا۔ پھر شیخ نے حالت کفر کا ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا کہ خان کو اپنے گمراہ اور بے بصیرت ہونے کا مکمل یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر میں اس وقت دین اسلام کا اظہار کروں تو اپنی رعایا کو راہِ راست پر نہ لا سکوں گا، لہٰذا تم ابھی صبر و تحمل سے کام لو۔ جب میں اپنے باپ دادا کی سلطنت کا مالک بنوں تو اس وقت میرے پاس پھر آنا۔ اسی

زمانہ میں چغتائی سلطنت پارہ پارہ ہو کر چند چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور کئی برسوں کے بعد توقلق خان تمام سلطنت کو اکٹھا کرنے اور اس پر اپنی حکمرانی قائم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اسی اثناء میں شیخ جمال الدین اپنے ملک کو واپس جا چکے تھے۔ وطن پہنچ کر وہ سخت بیمار ہو گئے، اور جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے رشید الدین کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا: ''توقلق تیمور ایک روز بڑا بادشاہ بننے والا ہے۔ اس وقت اس کے پاس ضرور جانا اور اس کو میرا سلام پہنچانا اور اسے بے خوف و خطر وہ وعدہ یاد دلانا جو اس نے مجھ سے کیا تھا۔

چند سالوں کے بعد جب توقلق تیمور اپنے باپ دادا کے تخت و تاج کا وارث بنا تو رشید الدین اپنے باپ شیخ جمال الدین کی وصیت کے مطابق توقلق خان کے لشکر میں جا پہنچا، لیکن اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ خان کے دربار میں باریاب نہ ہو سکا۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے یہ تدبیر کی کہ ایک روز صبح سویرے اس نے خان کے خیمے کے پاس اذان کہنی شروع کر دی۔ جب اس طرح توقلق خان کی نیند خراب ہوئی تو اس نے غضب ناک ہو کر رشید الدین کو اپنے پاس بلایا۔ رشید الدین نے خان کے سامنے حاضر ہو کر اسے اپنے باپ کا پیغام پہنچایا۔ توقلق خان شیخ جمال الدین سے اپنا وعدہ بھولا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ جب سے میں تخت پر بیٹھا ہوں جو وعدہ میں نے کیا تھا وہ میرے ذہن میں محفوظ تھا، لیکن جس شخص سے میں یہ نے وعدہ کیا تھا وہ میرے ذہن میں نہیں تھا کیونکہ وہ پھر کبھی نہ آیا۔ بہرحال اب میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس کے بعد توقلق خان نے کلمۂ شہادت پڑھا اور مشرف باسلام ہوا، اور بقول ابو الغازی ''اس صبح آفتاب اقبال نے توفیق الٰہی کے افق سے طلوع کیا، اور کفر کی شب دیجور کافور ہو گئی...'' اس کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ تبلیغ اسلام کے لیے مغل شہزادوں سے فرداً فرداً گفتگو کرنی چاہیے۔ جو لوگ اسلام قبول کریں تو یہ بات ان کے حق میں اچھی ہوگی۔

جس شخص سے سب سے پہلے پوچھا گیا وہ امیر تولک تھا۔ خان نے اس سے پوچھا: ''کیا تم اسلام قبول کرو گے؟'' اس پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا کہ تین سال ہوئے جب کاشغر کے چند مقدس لوگوں نے میرے سامنے اسلام کی تبلیغ کی تھی

اور اس سے متاثر ہو کر میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا، لیکن آپ کے خوف سے میں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ سن کر توقلق خان اٹھا اور اس کو گلے لگا لیا اور پھر تینوں اکٹھے بیٹھ گئے۔ اسی طرح سے انہوں نے سب شہزادوں سے یکے بعد دیگرے گفتگو کی اور سب نے اسلام قبول کر لیا سوائے ایک شخص کے جس کا نام ''جراس'' تھا۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ شیخ اور اس کے ملازمین کے مابین زور آزمائی کا مقابلہ ہونا چاہیے۔ اس کا ملازم ایک بڑا قد آور کافر تھا۔ وہ اس قدر طاقت ور تھا کہ دو سال کے اونٹ کو اٹھا سکتا تھا۔ شیخ رشید الدین نے اس مقابلہ کو منظور کر لیا اور اس سے کہا کہ اگر میں تمہارے ملازم کو گرا نہ سکا تو میں تمہیں مسلمان ہونے کے لیے نہیں کہوں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہے کہ مغل لوگ مشرف باسلام ہوں تو وہ مجھے بے شک اس آدمی کو مغلوب کرنے کے لیے کافی طاقت بخشے گا۔ توقلق خان اور دوسرے مسلمانوں نے شیخ رشید الدین کو سمجھانے اور باز رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن شیخ اپنے ارادے میں پختہ رہے۔ اس مقابلہ کو دیکھنے کے لیے ایک انبوہ کثیر اکٹھا ہو گیا اور اس کافر ملازم کو مقابلہ کے لیے اندر لے آئے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ ملازم جسے اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا، بڑے پُرغرور انداز میں آگے بڑھا۔ شیخ اس کے سامنے بہت چھوٹا اور کمزور دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ ایک دوسرے کو گھونسے مارنے لگے تو شیخ نے اس ملازم کے سینہ پر اس زور سے ضرب لگائی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو وہ اٹھا اور شیخ رشید الدین کے قدموں میں گر کر کلمۂ شہادت پڑھنے لگا۔ لوگوں نے آفرین اور ستائش کے نعرے بلند کیے اور اس روز ایک لاکھ ساٹھ ہزار تاتاریوں نے اپنے سروں کی بودیاں کٹوا دیں اور مسلمان ہو گئے۔ خان کا ختنہ ہوا اور نور اسلام کی برکت سے تاریکیاں دور ہو گئیں۔ اس وقت سے اسلام ان تمام شہروں میں مضبوطی سے قائم ہو گیا جو چغتائی خان کے جانشینوں کے زیر نگین تھے۔ (اسلام کی دعوتی قوت، حکیم محمود احمد ظفر، ص ۲۴۷، ۲۵۰)

* * *

﴿غازی انور پاشا کا خط اپنی اہلیہ کے نام﴾

غازی انور پاشا ترکی کے جلیل القدر مجاہدین میں سے ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی اسلام کے دشمنوں سے جہاد کیا اور آخر کار روسی بالشویکوں سے لڑتے ہوئے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔ آج جس جہاد کو پاکستان اور ترکی میں دہشت گردی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور صاحبان اقتدار کی طرف سے ہر روز امریکہ کے کہنے پر اس جہاد کو دہشت گردی پر ختم کیا جا رہا ہے، کسی زمانے میں یہی جہاد مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ بالشیکوں، کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں کے خلاف اگر جہاد کیا جائے تو وہ جہاد ہوتا ہے اور جہاد کرنے والا مجاہد کہلاتا ہے لیکن یہی جہاد اگر سرمایہ دارانہ نظام اور امریکہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے خلاف کیا جائے تو پھر یہ دہشت گردی ہے، کیونکہ امریکہ ایسا کہتا ہے۔ اس کے باوجود کہ جہاد کو دہشت گردی کہنے والے اپنے آپ کو سچا پکا مسلمان کہتے ہیں اور مجاہدین کو دہشت گرد ؎

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروز عید قربان
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

آج پاکستان کو روشن خیال پاکستان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جیسے مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی کو روشن خیال بنایا تھا۔ اور روشن خیالی اور ماڈریٹ اسلام کا مطلب ہے کہ غیر اسلامی چیز کو اسلام کا نام دے دیا جائے۔ کمال اتاترک (۱۸۸۱۔۱۹۳۸) کا ترکی میں مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ اس عنوان سے ہوتا ہے جو اس مہم کو وہاں دیا گیا۔ کمال اتاترک اور اس کے ساتھیوں کے نزدیک یہ ''غرب دوغرو'' تھا جس کے معنی ترکی زبان میں ''سمت مغرب میں سفر'' کے ہیں۔ سمت مغرب میں سفر کا یہ کام اس درجہ اہم تھا کہ صرف رومن رسم الخط جاری کرنے اور ترکی باشندوں کو ہیٹ پہنانے کے لیے ہزاروں آدمی اس طرح ہلاک کر دیئے گئے گویا کہ وہ ریاست سے بغاوت کے مجرم ہیں۔

اسی تقلیدی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ان مصلحین کی ساری توجہ بس یورپ کی تہذیب اور یورپ کے زبان و ادب کے حصول پر لگی رہی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جو مغربی قوموں کی ترقی کا اصل راز ہے، اس کو مسلمانوں کے اندر رائج کرنے کی انہوں نے زیادہ کوشش نہیں کی بلکہ ان کی ساری توجہ صرف اس پر تھی کہ ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو مغربی تمدن و تہذیب اور اس کے لباس اور طرز زندگی میں کمال حاصل کیے ہوئے ہو۔ کمال اتاترک کا نام نہاد انقلاب اور روس کے اشتراکی انقلاب میں صرف چند سال کا فرق ہے، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ روس آج خلائی دور میں داخل ہو چکا ہے اور چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے اور ترکی ابھی تک زمین پر بھی مستحکم مقام حاصل نہیں کر سکا۔

مصطفےٰ کمال پاشا کی تحریک کا آخری نشانہ یہ تھا کہ ترک قوم ہیٹ اور پتلون پہننے لگے۔ اور اس نے تقلید مغرب میں نہایت غلو سے کام لیا لیکن وہ علوم جن کی وجہ سے یورپ نے صنعتی انقلاب برپا کیا، ان علوم سے قوم کو بالکل ناآشنا رکھا۔ یورپ نے مسلمانوں سے ان علوم کو حاصل کر کے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کر لی اور دنیا کے سامنے اس نئے انقلاب کا تاریخی نام نشاۃ ثانیہ (Renaissance) رکھا جس کا مطلب ہے نیا جنم۔ گویا دنیا کو یہ بتایا کہ یہ کوئی غیر سے حاصل کی ہوئی چیز نہیں بلکہ یہ یورپ کی متاع گم گشتہ تھی جو اس نے دوبارہ پائی ہے حالانکہ یہ سب کچھ یورپ نے مسلمانوں ہی سے لیا تھا۔ اس کے برعکس ہم نے جو کچھ یورپ سے لینا تھا وہ اضافہ شدہ حالت میں وہی سرمایہ تھا جو یورپ کو ہم نے عطا کیا تھا۔ لیکن چونکہ ذہن مختلف تھا اس وجہ سے اس ذہنی اختلاف کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ یورپ ہمارے علوم کو سیکھ کر ہمیں شکست دے اور ہم مغرب کے علوم کو سیکھ کر صرف مغرب کے بھونڈے نقال بن کر رہ گئے، اور صرف کوٹ پتلون اور انگریزی تہذیب و تمدن تک ہماری نقالی رہی۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہ کر سکے۔

یہ تو اب کے ترکی کا حال ہے جب کہ اس کو ہماری طرح روشن خیال اسلام اور "مغرب زدہ گروہ" کا جنون تھا جیسا کہ آج کل ہمیں اسلام کو ماڈریٹ کرنے اور مغرب کی تہذیب کو اپنانے اور لڑکیوں کو نیکریں پہنانے کا جنون ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کہ

ترکی بھی بہت مذہبی تھا اور ریاست کا ہر صاحب اقتدار شخص دین کو دنیا پر ترجیح دیتا تھا اور جہاد کو اسلام کا ایک جزو لاینفک سمجھتا تھا بلکہ "ذروۃ سنامہ الجہاد" کا قائل تھا۔ اس زمانہ میں غازی انور پاشا نے اپنی شہادت سے صرف ایک روز قبل اپنی بیوی شہزادی نجیہ سلطانہ کو ایک خط روانہ کیا تھا جو ان کی شہادت کے بعد ان کی اہلیہ نے اخبارات میں شائع کرا دیا اور پھر وہیں سے ترجمہ ہو کر ۲۲ اپریل ۱۹۲۳ء میں ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوا۔ یہ خط پڑھنے کے قابل ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کے ترکی صاحب اقتدار دین اور اس کے اعمال سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ یہ خط مختلف کتابوں میں مرقوم ہے اور نوجوانوں کے لیے ولولہ انگیز ہے۔ خط کے ایک ایک لفظ سے جہاد کی خوشبو آ رہی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی محبت میں غازی انور پاشا نے محبوب تر از جان کی جدائی کیسے قبول کی۔

> میری رفیقۂ حیات اور سرمایۂ عیش و سرور پیاری نجیہ
> خدائے بزرگ و برتر تمہارا نگہبان ہو۔
>
> تمہارا آخری خط اس وقت میرے سامنے ہے۔ یقین رکھو تمہارا یہ خط ہمیشہ میرے سینے سے لگا رہے گا۔ تمہاری صورت تو دیکھ نہیں سکتا مگر خط کی سطروں اور حرفوں میں تمہاری انگلیاں حرکت کرتے نظر آ رہی ہیں جو کبھی میرے بالوں سے کھیلا کرتی تھیں۔ خیمے کے اس دھندلکے میں کبھی کبھی تمہاری صورت بھی نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ آہ! تم لکھتی ہو کہ میں تمہیں بھول بیٹھا ہوں اور تمہاری محبت کی کچھ پروا نہیں کی۔ تم کہتی ہو کہ میں تمہارا محبت بھرا دل توڑ کر اس دور افتادہ مقام پر آگ اور خون سے کھیل رہا ہوں، اور ذرا پروا نہیں کرتا کہ ایک عورت میرے فراق میں رات بھر تارے گنتی رہتی ہے۔ تم کہتی ہو کہ مجھے جنگ سے محبت ہے اور تلوار سے عشق، لیکن یہ لکھتے وقت تم نے بالکل نہ سوچا کہ تمہارے یہ لفظ جو یقیناً سچی محبت نے لکھوائے ہیں، میرے دل کا کس طرح خون کر ڈالیں گے۔ میں

تمہیں کس طرح یقین دلا سکتا ہوں کہ دنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی محبوب نہیں، تم ہی میری تمام محبتوں کا منتہیٰ ہو۔ میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی لیکن ایک تم ہی ہو جس نے میرا دل مجھ سے چھین لیا ہے۔

پھر میں تم سے جدا کیوں ہوں؟ راحت جان! یہ سوال تم بجا طور پر کر سکتی ہو، سنو! میں تم سے اس لیے جدا نہیں ہوں کہ مال و دولت کا طالب ہوں، اس لیے بھی جدا نہیں ہوں کہ اپنے لیے ایک تخت شاہی قائم کر رہا ہوں جیسا کہ میرے دشمنوں نے مشہور کر رکھا ہے۔ میں تم سے صرف اس لیے جدا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرض مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی فرض نہیں۔ یہی وہ فرض ہے جس کی ادائیگی کی نیت ہی انسان کو فردوس بریں کا مستحق بنا دیتی ہے۔ الحمدللہ کہ میں فرض کی محض نیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اسے عملاً انجام دے رہا ہوں۔ تمہاری جدائی ہر وقت میرے دل پر آرے چلایا کرتی ہے، لیکن میں اس جدائی سے بے حد خوش ہوں کیونکہ تمہاری محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو میرے عزم و ارادہ کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں اس آزمائش میں پورا اترا اور اللہ کی محبت اور حکم کو اپنی محبت اور نفس پر مقدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمہیں بھی خوش ہونا اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہارا شوہر اتنا مضبوط ایمان رکھتا ہے کہ خود تمہاری محبت کو بھی اللہ کی محبت پر قربان کر سکتا ہے۔

تم پر تلوار سے جہاد فرض نہیں لیکن تم بھی فرض جہاد سے مستثنیٰ نہیں ہو۔ کوئی مسلمان مرد یا عورت جہاد سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ تمہارا جہاد یہ ہے کہ تم بھی اپنے نفس و محبت پر محبت خدا کو مقدم رکھو۔ اپنے شوہر کے ساتھ حقیقی محبت کے رشتے کو اور بھی مضبوط کرو۔ دیکھو! یہ

دعا ہرگز نہ مانگنا کہ تمہارا شوہر میدان جہاد سے کسی طرح صحیح و سلامت تمہاری آغوش محبت میں واپس آ جائے۔ یہ دعا خود غرضی کی دعا ہوگی اور خدا کو پسند نہ آئے گی۔ البتہ یہ دعا کرتی رہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے شوہر کا جہاد قبول فرمائے، اسے کامیابی کے ساتھ واپس لائے، ورنہ جام شہادت اس کے لبوں سے لگائے، وہ لب جو تم جانتی ہو کہ شراب سے کبھی ناپاک نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ تلاوت و ذکر الٰہی سے سرشار رہے ہیں۔

پیاری نجمہ! آہ وہ ساعت کیسی مبارک ہوگی جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں یہ سر جسے تم خوبصورت بنایا کرتی تھیں، تن سے جدا ہوگا۔ وہ تن جو تمہاری محبت کی نگاہوں میں سپاہیوں کا نہیں نازنینوں کا سا ہے۔ انور کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ شہید ہو جائے اور حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ اس کا حشر ہو۔ دنیا چند روزہ ہے، موت یقینی ہے، پھر موت سے ڈرنا کیسا؟ جب موت آنے ہی والی ہے تو پھر آدمی بستر پر پڑے پڑے کیوں مرے؟ شہادت کی موت، موت نہیں زندگی ہے۔ لازوال زندگی!

نجمہ! میری وصیت سن لو۔ اگر میں شہید ہو جاؤں تو تم اپنے دیور نوری پاشا سے شادی کر لینا۔ تمہارے بعد مجھے سب سے زیادہ عزیز نوری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے سفر آخرت کے بعد وہ زندگی بھر وفاداری سے تمہاری خدمت کرتا رہے۔

میری دوسری وصیت یہ ہے کہ تمہاری جتنی بھی اولاد ہو، سب کو میری زندگی کے حالات سنانا اور سب کو میدان جہاد میں اسلام اور وطن کی خدمت کے لیے بھیج دینا۔ اگر تم نے یہ نہ کیا تو یاد رکھو میں جنت میں تم سے روٹھ جاؤں گا۔

اچھا پیاری رخصت! نہیں معلوم کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اس خط کے

بعد تمہیں پھر بھی خط نہ لکھ سکوں گا۔ کیا عجب ہے کہ کل ہی شہید ہو جاؤں۔ دیکھو صبر کرنا۔ میری شہادت پر غم کھانے کے بجائے خوشی کرنا کہ میرا اللہ کی راہ میں کام آ جانا تمہارے لیے باعث فخر ہے۔

بچیو! اب رخصت ہوتا ہوں اور اپنے عالم خیال میں تمہیں گلے لگاتا ہوں۔ انشاء اللہ جنت میں ملیں گے اور پھر کبھی جدا نہ ہوں گے۔

تمہارا: انور

(منقول از ارکانِ احرار، عبد المجید سالکؒ)

* * *

وسعت ظرف اور تحمل و برداشت

طبقۂ تابعین میں دو بزرگ ایسے ہیں جو معاصر تھے اور ایک ہی سال ان کا انتقال ہوا یعنی ۱۱۰ھ میں۔ دونوں جلیل القدر محدثین میں سے تھے۔ امام حسن بصریؒ کو تو وعظ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا جب کہ امام محمد بن سیرینؒ کو تعبیر خواب میں وہ ملکہ حاصل تھا کہ اس زمانہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ دونوں بزرگ چونکہ ایک ہی زمانہ میں ہوئے اس لیے کچھ معاصرانہ چشمک بھی تھی کیونکہ مشہور مقولہ ہے "المعاصرة اصل المنافرة۔"

دونوں بزرگوں میں کچھ مسائل میں اختلاف بھی تھا اور اختلاف ہو بھی جاتا ہے کیونکہ علم ہی سے اختلاف ہوتا ہے جہالت سے نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود دونوں بزرگوں میں وسعت ظرف بھی تھی اور تحمل و برداشت بھی۔ مزاج اور مسائل میں اختلاف ہونے کے باوجود دونوں حضرات کے تعلقات کشیدہ نہیں ہوئے۔ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی قدس سرہ نے ان دونوں بزرگوں کے اختلافات کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی نقل فرمایا ہے جو ہم لوگوں کے لیے مشعل راہ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ ہم آج کل باہمی چھوٹے چھوٹے اختلافات پر جو دست و گریبان ہوتے رہتے ہیں ہمیں ان بزرگوں کے اس قسم کے واقعات سے سبق حاصل کر کے اپنے اندر وسعت قلبی پیدا کرنی چاہیے، اور اختلافات کے باوجود ایک راہِ اعتدال نکالنی چاہیے تاکہ تشتت و افتراق کے باعث شیرازۂ امت منتشر نہ ہونے پائے کیونکہ اسلام میں باہمی افتراق کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اسلام کسی صورت امت میں اس انتشار کو پسند نہیں کرتا۔ نیک نیتی کی بنا پر امت کے اختلاف کو اگرچہ رحمت کہا گیا ہے (اختلاف امتی رحمة) لیکن آج کل کا خودغرضانہ اختلاف امت کے لیے زحمت کا باعث بن چکا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اپنے زمانے کے اختلافات پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”کاش اپنے اسلاف کے نقش قدم کی جستجو ان میں پیدا ہوتی، مگر اس سے ان میں لا پروائی پیدا ہوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافات کی برداشت اور تحمل کا جو سلیقہ اپنی امت میں پیدا کیا تھا، عمومیت کے اس موروثی اور قیمتی سلیقہ کی بربادی میں ان کے طرز عمل سے کافی نقصان پہنچا۔ اگرچہ بحمداللہ مسلمان بالکلیہ اپنے پیغمبر کی عطا فرمودہ اس نعمت سے ابھی محروم نہیں ہوئے ہیں۔ کاش ان کے خواص اب بھی بزرگوں کے نشان راہ دیکھنے کی زحمت گوارا فرماتے۔ یہی خواجہ حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ کے اس اختلافی قصہ کو ملاحظہ فرمائیے۔

عام مسلمانوں کے جس طرز عمل کا نمونہ آپ کے سامنے گذرا، جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کارفرما طاقت کون سی تھی۔

”بڑا دلچسپ لطیفہ ہے جسے ابن سعد نے نقل کیا ہے۔ حاصل جس کا یہ ہے کہ خواجہ حسن بصریؒ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد یوں تو بے شمار تھی لیکن سب میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحبؒ کو امتیاز خصوصی خواجہ صاحب کی ذات سے حاصل ہوا، وہ اسی بصرے کے مشہور عالم و محدث درویش ثابت البنانیؒ تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور وعظ و نصیحت میں جتنا انہماک خواجہ صاحبؒ کو تھا، ثابت البنانیؒ خود کہتے ہیں کہ اتنی محنت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ طبقات ابن سعد ہی میں ان کا یہ فقرہ منقول ہے یعنی کہا کرتے تھے:

لولا تصنعوا بی ماصنعتم بالحسن لحدثتكم احاديث مونقه، ثم قال منعوه القائلة منعوه النوم۔

(طبقات ابن سعد جلد ۲۳۴/۷)

اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ جو کچھ تم لوگوں نے حسن کے ساتھ کیا وہی میرے ساتھ بھی کرنے لگو گے تو میں بڑی ستھری حدیثیں تمہیں سناتا، پھر کہتے کہ حسن کو تو لوگوں نے دوپہر کے لوٹ پوٹ سے بھی

روک دیا، سونے تک سے بھی روک دیا۔

بہرحال قصہ یہ پیش آیا کہ جس زمانے میں بنی امیہ کا طاغیہ حجاج ثقفی مسلمانوں کی امتیازی ہستیوں کے درپے آزار تھا، خواجہ حسن بصریؒ بھی لوگوں کے مشورہ سے کچھ دن کے لیے روپوش ہو گئے تھے۔ اتفاق کی بات اسی روپوشی کے زمانہ میں جب خواجہؒ اپنے کسی عقیدت مند کے گھر چھپے ہوئے تھے، ان کی صاحبزادی کا انتقال ہوگیا۔ ثابت البنانیؒ نے اس حادثہ کی خبر وہیں جا کر خواجہؒ کو سنائی۔ سننے کی بات یہی ہے کہ ثابت البنانیؒ کو جس قسم کی خصوصیت خواجہ سے تھی، خود ان کا بیان ہے کہ اسی بنیاد پر خیال کیے ہوئے تھے کہ جنازہ کی نماز پڑھانے کا حکم مجھ ہی کو دیں گے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ

﴿رجوت ان یامرنی ان اصلی علیھا﴾

(طبقات ابن سعد ص ۱۲۸ جلد ۱/ ۷)

"مجھے امید تھی کہ اس بچی کے جنازہ کی نماز پڑھانے کا حکم حسنؒ مجھے دیں گے۔

لیکن ثابت البنانیؒ کو حیرت ہوئی۔ خود کہتے تھے کہ بچی کی وفات کی خبر سن کر کچھ ہدایتیں دیتے رہے یعنی یہ کرنا وہ کرنا، مگر ہدایتوں کا قصہ جب ختم ہوگیا تو خلاف توقع ثابتؒ کہتے ہیں کہ حسنؒ کہنے لگے

﴿اذا اخرجتموھا فمروا محمد بن سیرین لیصل علیھا﴾

(ایضاً)

"جب جنازے کو گھر سے باہر نکال کر لے آؤ تو محمد بن سیرینؒ سے کہنا کہ نماز وہی پڑھا جائیں۔

یہ واقعہ ذکر کرنے کے بعد مولانا گیلانیؒ فرماتے ہیں:

"دیکھو آپ نے اپنے بزرگوں کے اس طرز عمل کو، اختلاف ایسا کہ ایک طرف حسن بصریؒ کا فیصلہ تھا کہ "تعمیل حکم یا دوزخ کی

> آگ۔" دوسری طرف ابن سیرینؒ کے حلقہ سے آواز آتی تھی "رحمت الٰہی یا دوزخ کی آگ۔" یہ آمین اور رفع الیدین وغیرہ والی خلاف اولیٰ کے فروعی مسائل کا اختلاف نہ تھا، عقائد کا اختلاف تھا، مگر جب وقت آیا تو بصرے کے سب سے بڑے نمازی بلکہ شاید تاریخ اسلام کے سب سے بڑے مصلی یا عاشق نماز ثابت البنانیؒ کی نماز پر بھی اس شخص کی نماز کو خواجہ حسن بصریؒ نے ترجیح دی جس سے ان کو اور جس کو ان سے اتنا شدید اختلاف تھا۔
>
> "میرے نزدیک تو مسلمانوں کے عوام کے مذہبی جھگڑوں کی ذمہ داری بجائے عوام کے زیادہ تر خواص ہی پر عائد ہوتی ہے۔ ان ہی کے طرز عمل کو دیکھ کر ان کے زیر اثر عوام بے چارے وہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر خواص ہی اپنے اختلافات میں اتنی گنجائش رکھیں جتنی گنجائش خواجہ حسن بصریؒ کے قلب میں ابن سیرینؒ کے متعلق تھی تو یقین مانیے کہ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات میں وہ کیفیت کبھی پیدا نہ ہوتی جس کا رنگ دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے مذہبی اختلافات کے لحاظ سے خواہ جتنا ہی ہلکا اور پھیکا ہو، لیکن بجائے خود جو ناگواریاں باہم مسلمانوں میں بھی ان ہی مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے جو پیدا ہوئیں وہ بھی نہ ہوتیں۔ یالیت قومی یعلمون۔ (مقالات احسانی ص ۲۳۱_۲۳۵)

اس وسعت ظرفی اور باہمی رواداری کی مثالیں امت میں بہت ملتی ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اس زمانہ میں یہ رواداری یا تو جہالت کی وجہ سے یا پھر مذہبی تعصب کی وجہ سے ختم ہو گئی ہے اور اب تو معمولی معمولی مسائل پر کفر کے فتوے لگ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ طحطاویؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک حنفی عالم تھے جن کا نام قاضی ابو عاصم عامریؒ تھا۔ یہ نہایت عالم تھے اور فروعات میں امام ابو حنیفہؒ کے مقلد تھے۔ یہ ایک مرتبہ مشہور شافعی عالم علامہ قفالؒ کی مسجد میں نماز مغرب پڑھنے گئے۔ علامہ قفالؒ نے جب

انہیں دیکھا تو نہایت خوش ہوئے۔ شافعی مسلک میں تکبیر کہتے وقت شہادتیں اور حیعلتین (حی علی الصلوۃ، حی علی الفلاح) صرف ایک ایک مرتبہ کہے جاتے ہیں جب کہ مسلک حنفی میں یہ کلمات دو دو مرتبہ کہے جاتے ہیں۔ علامہ قفالؒ نے قاضی ابو عاصمؒ کے احترام میں مؤذن کو حکم دیا کہ وہ آج تکبیر میں یہ کلمات ایک ایک مرتبہ کے بجائے دو دو مرتبہ کہے۔ جونہی جماعت کا وقت ہوا علامہ قفالؒ نے خود مصلی پر کھڑا ہونے کے قاضی ابو عاصمؒ کو امامت کے لیے مصلی پر کھڑا کر دیا۔ قاضی صاحبؒ نے نماز پڑھاتے وقت سورۃ فاتحہ سے قبل بسم اللہ جہراً پڑھی اور دوران نماز کئی دوسرے افعال بھی شافعی مسلک کے مطابق ادا کیے۔ (طحطاوی جلد ۱ ص ۵۰)

آج ایسی رواداری قریباً قریباً مفقود ہو گئی ہے اور معمولی معمولی مسائل میں بھی سنت و بدعت کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔ دین کے بارہ میں یہ سب باتیں کتابوں سے نہیں بلکہ بزرگوں کے پاس بیٹھنے سے آتی ہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ میں شاہ اسماعیل شہیدؒ نے رفع الیدین کے اثبات میں ایک رسالہ لکھا اور خود بھی رفع الیدین کرنا شروع کر دی۔ کسی شخص نے ان کے چچا شاہ عبدالقادرؒ سے اس بات کا ذکر کیا۔ ایک روز شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے شاہ اسماعیل سے پوچھا: ’’مولوی اسماعیل! میں نے سنا ہے کہ تم نے رفع الیدین کرنی شروع کر دی ہے اور اس کے اثبات میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے؟ مولوی اسماعیل نے کہا: ’’ہاں چچا! آپ نے صحیح سنا ہے۔‘‘ پوچھا: ’’یہ کیوں؟‘‘ عرض کیا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جو میری مردہ سنت کو زندہ کرے اس کو سو شہید کا ثواب ملے گا۔‘‘ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے یہ سن کر فرمایا: ’’مولوی اسماعیل! میں سمجھتا تھا کہ تمہیں حدیث آتی ہے لیکن آج پتہ چلا کہ تمہیں حدیث نہیں آتی۔ مولوی اسماعیل! یہ حدیث جو تم نے پڑھی ہے یہ اس سنت کے لیے ہے جو بدعت کے مقابلہ میں ہو۔ یعنی بدعت پھیل گئی ہو اور سنت مردہ ہو چکی ہو۔ سنت کے مقابلہ میں اگر دوسری سنت کو زندہ کیا جائے تو یہ اس حدیث کے زمرہ میں نہیں آتا۔ حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ذہن میں یہ بات آ گئی، چنانچہ رفع الیدین کرنے سے رجوع فرمایا۔

* * *

﴿سیدہ خنساءؓ اور جنگ قادسیہ﴾

جنگ قادسیہ میں ایک جانب رستم ایرانی اور دوسری جانب سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ رستم کی فوج لاکھوں میں تھی لیکن پھر بھی وہ لڑنے سے بچی جاتا تھا۔ اس نے سیدنا سعدؓ سے صلح کرنا چاہی لیکن اس کی ہر کوشش ناکام ہوئی اور بالآخر نوبت جنگ تک پہنچ گئی۔

ایرانی سپاہی جو مسلمانوں کے مقابلہ میں تھے وہ سپاہی نہیں تھے، لوہے اور فولاد کی چٹانیں کھڑی تھیں۔ ادھر مسلمان عزم وہمت کے دھنی، زبان پر قرآن، دل میں نور ایمان، ہاتھ میں تلواریں اور نیزے بادلوں کی طرح برستے اور بجلی کی طرح کڑکتے اور سب کی تمنا راہ خدا میں شہادت

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اس میدان کارزار میں ایک طرف سے جوش وجذبے سے بھری ہوئی آواز گونجی۔ یہ سیدہ خنساءؓ کی آواز تھی۔ ہتھیار سجائے گھوڑوں کی باگ پکڑے چار بیٹے خیمے کے آگے ماں کے حضور کھڑے تھے۔ میدان جنگ میں جاتے ہوئے یہ جانباز اپنی اماں کو خدا حافظ کہنے کے لیے رکے ہوئے تھے۔ ماں نے میدان جنگ پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا کہ کل تو ہاتھیوں نے مسلمان جانبازوں کو کچل کر رکھ دیا تھا آج بھی ایرانی بڑی سج دھج سے آئے ہیں۔ ماں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو رخصت کرتے وقت جو کچھ کہا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

> ”میرے بیٹو! قسم ہے اس خدائے لازوال کی جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! تمہاری رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے۔ تمہارا حسب ونسب بے داغ ہے۔ میرا سر فخر سے بلند ہے اور تمہارے ماموں اپنی عزت پر جس قدر ناز کریں کم ہے۔ یاد رکھو کہ میدان کارزار گرم ہو گیا ہے تو دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑنا۔ اس پر

> ایسا حملہ کرنا کہ اس کے ہوش اڑ جائیں اور اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تمہیں ضرور شہادت کی دولت نصیب فرمائے گا۔“ (اسد الغابہ: جلد ۵ ص ۳۳۲)

اس بڑھیا کے بڑھاپے کا سہارا اور عصائے پیری یہی بیٹے تھے۔ خاوند کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن کیسی شیر دل ماں تھی کہ اپنے جگر پاروں کو اسلام پر قربان کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں سجا کر بھیج رہی تھی اور پھر ان کی شہادت کی دعائیں بھی مانگ رہی تھی۔

گھوڑوں کی باگیں اٹھائے یہ سرفروش میدان کارزار میں پہنچے۔ یہ سینہ تانے بے درنگ بڑھ رہے تھے۔ کون ان جانبازوں کے سامنے ٹھہر سکتا تھا۔ ایک صحابیہؓ ماں کی دعائیں ان کے ساتھ تھیں۔ ماں نے دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑنے کے لیے کہا تھا۔ ماں نے کہا تھا تمہارا حسب ونسب بے داغ ہے۔ اس کے جگر پاروں نے میدان جنگ میں بے داغ کردار ادا کیا۔

اس روز مجاہدین اسلام نے میدان جنگ میں بہادری اور شجاعت کے وہ کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ عالم میں وہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں، سورج حجلۂ مغرب میں چھپا، دن ختم ہوا، رات آئی لیکن لڑائی جاری تھی۔ اس روز لڑائی آدھی رات تک جاری رہی اور مسلمانوں کا پلہ اس روز بھاری تھا۔ انہیں فتح کے آثار واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ سیدنا قعقاعؓ نے اس روز تیس ایرانیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس روز ایک مجاہد نے یہاں تک جرأت کی کہ رستم کو قتل کرنے کے ارادے سے وہ ایرانی صفوں میں گھس گیا اور انہیں چیرتا ہوا رستم کے قریب جا پہنچا۔ وہ رستم کا کام تمام کرنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ایک ایرانی نے اسے شہید کر دیا۔ مسلمانوں نے آج کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ مسلمان چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ایرانیوں کو ان کے مورچوں سے پیچھے دھکیل دیا جائے لیکن ایرانیوں کی تعداد بے شمار تھی۔ ایک مرتا تو دس اس کی جگہ آ جاتے۔ ان کی قوت مدافعت بے حد شدید تھی۔ آدھی رات گذرنے کے بعد فریقین کے لیے لڑائی بند کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا، لہٰذا لڑائی بند ہو گئی۔ اس روز مسلمانوں کے ہاتھوں دس ہزار ایرانی قتل ہوئے جب مسلمان شہداء کی تعداد دو ہزار تھی۔

آج اسلامی لشکر کے سپہ سالار سیدنا سعدؓ کچھ زیادہ ہی خوش تھے اور قلب میں

اطمینان بھی انگڑائیاں لے رہا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک سپاہی کو بلوایا اور کہا:

> ”ہر ایک خیمے میں جاؤ، دیکھو کہ مجاہد کیا کر رہے ہیں؟ اگر وہ ایک دوسرے کی تعریف کر کے خوش ہو رہے ہیں تو ٹھیک ہے، اور اگر کچھ لوگ خاموش ہیں تو پھر بھی کوئی بات نہیں، لیکن اگر کسی خیمہ میں ضرورت سے زیادہ ایک دوسرے کی تعریفیں ہو رہی ہیں تو مجھے جگا دینا۔ یہ باتیں غرور و حماقت کی ہوں گی جو ملت کے لیے خطرناک ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں۔“

سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کے آدمی نے حسب ہدایت سارے لشکر کو گھوم پھر کر دیکھا۔ ہر طرف شجاعت اور بہادری کے تذکرے تھے۔ ہر طرف خوشی اور مسرت دلوں سے اچھل رہی تھی۔ ہر دل میں کامیابی اور فتح کی امید تھی لیکن ایک خیمے کے آگے اندھیرا تھا۔ چار جانبازوں اور بہادروں کی لاشیں یہاں دفن کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ خیمے میں ایک بوڑھی خاتون بیٹھی تھیں جس کے چہرے پر غم و اندوہ کے بجائے اطمینان اور شکر کی جھلک ٹپک رہی تھی۔ یہ سیدہ خنساءؓ تھیں اور وہ لاشے اس کے جگر پاروں کے تھے جن کو اس نے آج اپنے ہاتھوں سے سجا کر میدان جنگ میں بھیجا تھا۔ اس نیک بخت اور شیر دل خاتون کی زبان پر یہ کلمہ تھا:

> ”یہ حق تعالیٰ شانہ کی کیسی عنایت اور مہربانی ہے کہ مجھے چار شہیدوں کی ماں ہونے کا شرف عطا فرمایا۔ اب میں اس کے سایۂ رحمت میں اپنے بچوں سے ملوں گی۔“

یہ وہی خنساءؓ تھیں جن کا مرثیہ گوئی میں کوئی نظیر نہیں تھا۔ سوق عکاظ میں ان کے خیمے کے دروازہ پر ایک علم نصب کیا جاتا تھا جس پر لکھا ہوتا تھا ”ارثی العرب“ یعنی تمام عرب میں سب سے بڑھ کر مرثیہ گو۔ انہوں نے اپنے بھائی صخر کی موت پر وہ مرثیہ لکھا تھا کہ پتھر کے سینے پانی ہو گئے تھے۔ سوق عکاظ کی فضائیں سوگوار ہو گئی تھیں، لیکن آج اس کے لبوں پر مرثیہ نہیں بلکہ شکر کے کلمات تھے۔ علامہ اصفہانی نے کتاب الاغانی میں ان کے عجیب و غریب واقعات زندگی لکھے ہیں۔ وہ اسلام لائیں اور سیدنا عمرؓ کے دربار خلافت میں حاضر ہوئیں، لیکن اسلام لانے کے بعد زندگی کی اقدار ہی تبدیل ہو گئیں۔ (سیرت سیدنا عمر فاروقؓ، حکیم محمود احمد ظفر، ص ۲۰۱)

﴿نعمت کی ناشکری کرنا﴾

قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے کہ ''اگر تم میری نعمتوں کا شکر کرو گے تو میں ان نعمتوں میں زیادتی عطا فرماؤں گا اور اگر تم کفران نعمت کرو گے تو سمجھ لو کہ میرا عذاب بڑا سخت ہے۔'' اس آیت کریمہ کا عملی مظاہرہ ہم ہر روز دیکھتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں عبرت حاصل نہیں ہوتی کہ ہم کیا کر رہے ہیں کیونکہ ہمارا عمل اس آیت قرآنی کے سراسر خلاف ہوتا ہے۔ اس بارہ میں ہمارا یہ معاملہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے ہر روز لوگوں کو قبر کے گڑھے میں دباتے ہیں لیکن خود اپنی موت سے نہ صرف بے خبر بلکہ ہم یہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ ساری دنیا نے مرنا ہے لیکن ہم نے نہیں مرنا، حالانکہ زندگی کیا ہے؟ موت کی طرف ایک سفر۔ ہر شخص دوسروں کو اپنے سامنے مرتا دیکھتا ہے مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔

تاریخ نے اپنے سینہ میں جعفر برمکی کی والدہ کا ایک واقعہ محفوظ رکھا ہوا ہے جو صاحبان اقتدار اور مال دار لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔ جعفر برمکی خلیفہ ہارون الرشید کا وزیر اعظم اور اس کے لڑکے مامون کا اتالیق تھا۔ یہ جعفر ہی تھا جس کی وجہ سے برامکہ کو یہ اقبال اور ترقی حاصل ہوئی کہ بڑے بڑے عمائدین سلطنت اور امرائے مملکت ان کی آستان بوسی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ برامکہ کی زرپاشیوں نے دجلہ و فرات کی طرح سونے اور چاندی کا دریا بہا دیا اور ان کی مسرفانہ اور مترفانہ زندگی کے واقعات سے تواریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان کے محلات میں امیروں اور مسکینوں کے ڈیرے ہوتے تھے۔ شعراء، ادباء، علماء اور دوسرے ارباب علم و دانش ان کی فیاضیوں سے مالا مال تھے۔ یہ ان کے اقبال و ترقی کا زمانہ تھا لیکن پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا جو ان کے ادبار و تنزل کا زمانہ تھا کیونکہ ''ہر کمالے را زوالے'' کا اصول ایک مسلمہ اصول ہے۔ چشم آفتاب نے پھر یہ وقت بھی دیکھا اسی جعفر برمکی کی ماں، جو جعفر ہارون الرشید کا

وزیر اعظم اور مامون الرشید کا اتالیق تھا جس کی داد و دہش کے ہر جگہ چرچے تھے، اس کی والدہ عبادہ جس کی خدمت میں ہر وقت چار سو کنیزیں رہا کرتی تھیں عین عید کے دن جب کہ غریب سے غریب آدمی بھی نئے کپڑے پہنتا ہے، پھٹے پرانے کپڑوں میں محمد بن عبدالرحمٰن امام مسجد کوفہ کے گھر معمولی امداد کے لیے نظر آتی ہے۔ چنانچہ محمد بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں

> ''میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنی والدہ سے ملنے گیا تو دیکھا کہ ایک شریف عورت پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس میری والدہ سے مصروف گفتگو ہے۔ والدہ نے مجھے کہا: ''محمد! اس عورت کو جانتے ہو؟'' میں نے عرض کیا: ''نہیں۔'' میری والدہ نے کہا کہ جعفر بن یحییٰ برمکی کی والدہ عبادہ ہے۔ میں نے اس کی تعظیم کی وجہ سے اور اس سے گفتگو کرنے کے خیال سے اپنا چہرہ اس کی طرف کر لیا، اور نہایت مودبانہ انداز میں پوچھا: ''اماں جی! آپ کا یہ عجیب و غریب حال میں کیا دیکھ رہا ہوں، کیونکہ میرے ذہن میں ان کے اس وقت کے لمحات فلم کی طرح گھومنے لگے جب ملک کے بڑے بڑے دانشور، علماء، امراء اور عمائدین سلطنت ان کی ایک نظر التفات کے لیے ترس جاتے تھے۔ اس کا بیٹا جعفر برمکی اتنی بڑی سلطنت کے امیر المومنین کا وزیر اعظم تھا جس نے ایک روز لکۂ ابر سے کہا تھا: ''جہاں مرضی جا کر برس، تیرا خراج مجھے ہی ملے گا۔'' آج اس شخص کی والدہ کو اس قدر خستہ حال اور بدحال دیکھ کر میرے دل کو ٹھیس سی لگی اور زمانہ کے نشیب و فراز میرے کوزۂ ذہن میں گھومنے لگے اور قرآن حکیم کے اس فرمان ''وتعز من تشاء و تذل من تشاء'' کی عملی تفسیر کو اپنے سامنے دیکھ کر میں نے بڑی بی سے یہ سوال کیا تھا کہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟''
>
> ''وہ بولی! ''بیٹا! ایک وقت وہ تھا کہ عید آئی تھی تو چار چار سو کنیزیں

> میرے سرہانے کھڑی رہتی تھیں، میں پھر بھی اپنے بیٹے کو اپنا نافرمان اور نا خدمت گزار سمجھتی تھی۔ اور ایک اب یہ عید ہے جس میں میری تمنا اور خواہش صرف یہ ہے کہ قربانی کی دو بکروں کی کھالیں مل جائیں تو میں ان میں سے ایک کو نیچے بچھانے کا گدا اور دوسری کو اوپر اوڑھنے کی رضائی بنا لوں۔"

محمد بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے اس بڑی بی کو پانچ سو روپے دیئے۔ وہ اتنی خوش ہوئی کہ قریب تھا کہ وہ خوشی کی زیادتی کی وجہ سے مر جاتی۔ پھر وہ ہمارے ہاں آتی جاتی رہتی حتیٰ کہ اس کی موت نے ہمارے مابین جدائی ڈال دی۔

اس وجہ سے شریعت کا حکم ہے کہ کسی شی پر نہ تو مغرور ہونا چاہیے اور نہ ہی کسی نعمت کی ناشکری کرنی چاہیے۔ ناشکری سے نعمت چھن جاتی ہے، اور نہ ہی کسی غریب و بے نوا کو مال و دولت کے نشہ میں جھڑکنا چاہیے کیونکہ قرآن حکیم میں ہے "واما السائل فلا تنهر."

……

گورنر ایک مزدور کی حیثیت سے

سیدنا سلمان فارسیؓ صحابہ کرامؓ میں سب سے معمر تھے۔ ایک قول کے مطابق ان کی عمر اڑھائی سو سال اور دوسرے قول کے مطابق ساڑھے تین سو سال تھی۔ یہ فارس کے شہر رام ہرمز کے مضافات میں سے قصبہ جیّ کے رہنے والے تھے۔ آپ کا تعلق شاہان فارس کے خاندان سے تھا۔ نام سلمان تھا کنیت ابو عبداللہ اور اپنے آپ کو ''ابن الاسلام'' کہتے تھے۔ (الاستیعاب: جلد ۲ ص ۵۶) آپ اپنی نیک طبیعت کی وجہ سے ''سلمان الخیر'' کے لقب سے مشہور تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں فارس سے نکلا کئی تکالیف برداشت کیں۔ دس مرتبہ سے زیادہ فروخت ہوا۔ آخر بنو قریظہ کے ایک یہودی کے ہاتھ آیا اور اس کے درختوں کی دیکھ بھال کی ڈیوٹی میرے سپرد ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر قبا میں بنی عمرو بن عوف کے یہاں قیام پذیر تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت ایک کھجور کے درخت پر چڑھ کر کام کر رہا تھا اور میرا آقا درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ ایک یہودی آیا جو میرے آقا کا چچازاد بھائی تھا۔ اس نے آ کر کہا: ''خدا بنی قیلہ یعنی انصار کو ہلاک کرے کہ وہ قبا میں ایک شخص کے گرد جمع ہیں جو مکہ سے آیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ نبی ہے۔ یہ سننا تھا کہ مجھے ایسی کپکپی آئی کہ میں اوپر سے نیچے اپنے آقا پر گرنے والا تھا۔ گویا آپ کی آمد نے مجھ پر ایک وجد کی کیفیت طاری کر دی۔ وہ دونوں یہودی میری یہ کیفیت دیکھ کر تعجب کرنے لگے۔ بہرحال میں درخت سے نیچے اترا اور اس یہودی سے کہا کہ مجھے بھی یہ خبر سناؤ۔ اس بات سے میرے آقا کو غصہ آ گیا اور اس نے مجھے ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔

فرماتے ہیں کہ اس وقت تو میں چپ ہو گیا لیکن رات کے وقت میں اپنا سب کچھ لے کر قبا میں آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے پاس کچھ نہیں ہے لہٰذا میں اپنی یہ ساری پونجی آپ کے رفقاء کے لیے

صدقہ کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ آپ نے خود تو صدقہ لینے سے انکار فرمایا لیکن صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ تم لے لو۔ اس کے علاوہ کچھ اور علامات ان کے ذہن میں تھیں ان کی بھی آپ ﷺ میں تصدیق کر لی اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ایمان کی محبت جاگزین ہوگئی۔ اور میں مشرف باسلام ہو گیا۔ آپ ﷺ میرے اسلام لانے سے بہت خوش ہوئے۔

سیدنا سلمان فارسیؓ نے ایمان لانے کے زندگی کے مختلف نشیب و فراز دیکھے۔ غریبی اور تونگری بھی اور سیدنا فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں مدائن کے گورنر مقرر ہوئے۔ گورنری کے اس زمانے میں جب کہ ہر قسم کے خدم و حشم آپؓ کو میسر ہو سکتے تھے، آپ نے اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کی۔ تواریخ میں ان کی زندگی کا یہ محیر العقول واقعہ منقول ہے، وہ قارئین کے باعث حیرت بھی اور موجودہ عمائدین حکومت کے لیے باعث عبرت بھی ہے۔

> ”ایک مرتبہ شام کا ایک تاجر کچھ سامان لے کر مدائن آیا۔ گورنر مدائن سیدنا سلمان فارسیؓ ایک عام آدمی کی طرح سڑک پر جا رہے تھے۔ شام کے تاجر کے پاس سامان کچھ زیادہ تھا اور اسے سامان اٹھانے کے لیے ایک مزدور کی ضرورت تھی۔ اس نے سیدنا سلمان فارسیؓ کو ایک مزدور سمجھتے تھے، ان سے کہا کہ یہ گٹھڑی اٹھا لو۔ سیدنا سلمانؓ نے بغیر کسی تامل کے وہ گٹھڑی اٹھالی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی منزل کی طرف چلنے لگے۔ راستہ میں مدائن کے لوگوں نے انہیں بوجھ اٹھائے دیکھا تو اس شامی تاجر سے کہا کہ ”یہ تو مدائن کے گورنر ہیں۔“ یہ سن کر اس تاجر کو بہت تعجب ہوا اور وہ اس بات پر شرمندہ بھی ہوا کہ اس نے گورنر مدائن کو اپنی گٹھڑی اٹھوائی ہوئی ہے۔ اس نے سیدنا سلمانؓ سے اس گستاخی کی معذرت چاہی اور درخواست کی کہ وہ بوجھ اتار دیں، لیکن سیدنا سلمانؓ راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ ”میں نے ایک نیکی کی نیت کی ہوئی ہے جب تک وہ پوری نہ ہو یہ سامان نہیں اتاروں گا۔“ چنانچہ وہ تاجر کی منزل تک وہ سامان پہنچا کر واپس آگئے۔“

(طبقات ابن سعد: جلد۴ ص۸۸، صفۃ الصفوۃ، جلد۴ ص)

﴿اسلام میں عدل کی اہمیت﴾

جبلہ بن ایہم غسانی کا تعلق قبیلہ غسان سے تھا۔ اس نے ہرقل کا انجام دیکھا کہ اتنی بڑی سلطنت کا حاکم ہونے کے باوجود اسلامی فوج سے چھپ بھاگتا پھر رہا ہے۔ اور یہ بھی اس نے دیکھا کہ شام کے اکثر قبائل دوڑ دوڑ کر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ چنانچہ اسے یقین ہوگیا کہ اب اس کی عزت و وقار اسی میں ہے کہ وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے اور بنو غسان کے قبول اسلام کی اطلاع امین الامت سیدنا ابو عبیدہ بن جراحؓ کو دی۔ سیدنا ابو عبیدہؓ کو اس کے اسلام قبول کرنے سے انتہائی خوشی اور مسرت ہوئی۔ انہوں نے یہ خبر سیدنا فاروق اعظمؓ کو بھی پہنچائی۔ آپ بھی اس خبر سے انتہائی مسرور ہوئے۔ مسلمان ہونے کے بعد جبلہ نے امیر المومنین کو مدینہ حاضر ہونے کی درخواست کی۔

سیدنا عمرؓ نے اس کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور مدینہ آنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ جبلہ اپنے پانچ سو رشتہ داروں کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوا۔ سیدنا عمرؓ نے اس کے استقبال کا حکم دیا اور مدینہ کا ہر چھوٹا بڑا شہر سے باہر نکل کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جبلہ نے اپنے دو سو ساتھیوں کو ہتھیاروں سے آراستہ ہونے اور ریشمی لباس پہننے کا حکم دیا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے جن کی دموں کو گرہیں لگی ہوئی تھیں اور گلوں میں سونے چاندی کے قلادے پڑے ہوئے تھے۔ جبلہ نے اپنا تاج پہنا جس میں اس کی دادی ماریہ (Maria) کے کانوں کی بالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اہل مدینہ نے اس سے قبل اس آن بان کا شخص نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ خود سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے امیر المومنینؓ جن کے رعب و داب سے قیصر و کسریٰ بھی لرزتے تھے نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے لہٰذا جبلہ کی آن بان اور شان و شوکت کو دیکھ کر وہ حیرت میں رہ گئے۔ جبلہ سیدنا عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امیر المومنینؓ نے اسے خوش آمدید کہا اور ازراہ لطف و مہربانی اس کو اپنے پہلو میں جگہ دی۔ جبلہ امیر المومنینؓ کی سادگی کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ

یہ اتنی بڑی مملکت کے فرماں روا ہو کر اتنے سادہ ہیں۔ وہ ان کی سادگی سے بڑا متاثر ہوا۔

جبلہ کو مدینہ آئے ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ حج کا موسم آ گیا۔ سیدنا عمرؓ حج پر تشریف لے گئے۔ جبلہ بھی ان کے ساتھ حج کے لیے گیا۔ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ اس کا تہبند بنو فزارہ کے ایک شخص کے پاؤں تلے آ کر اتر گیا۔ جبلہ نے غصہ میں اس کی ناک پر مکا مارا وہ شکایت لے کر سیدنا عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سیدنا عمرؓ نے جبلہ کو بلا کر پوچھا۔ اس نے اس واقعہ کی تصدیق کی کہ ہاں میں نے مکا مارا ہے۔ آپ نے فرمایا: ”چونکہ تم نے اقرار کر لیا ہے اس لیے یا تو اس شخص سے اپنا یہ قصور معاف کراؤ ورنہ تمہیں اس کی سزا بھگتنا ہوگی، اور وہ سزا یہ ہے کہ یہ بھی تمہاری ناک پر اتنے ہی زور سے مکا مارے گا۔ جبلہ کے لیے یہ بات نئی تھی۔ ان کے یہاں تو بڑے لوگ سزا سے مستثنیٰ ہوتے ہیں خصوصی طور پر بادشاہ تو ہر قسم کا جرم اور ظلم کرنے کے روادار ہوتے ہیں۔ اس لیے سیدنا عمرؓ کی یہ بات سن کر وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس نے ناگواری کے لہجے میں کہا کہ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایک معمولی آدمی ہے اور میں ایک بادشاہ ہوں۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ”اسلام میں قانون کی نگاہ میں تم دونوں برابر ہو، سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے تم کسی شے میں اس پر فضیلت نہیں پا سکتے۔“ جبلہ نے کہا: ”امیر المومنین! میں تو یہ سمجھتا تھا کہ مجھے اسلام میں جاہلیت سے زیادہ عزت دی جائے گی، لیکن یہاں تو وہ چیز مجھے نظر نہیں آ رہی۔“ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ”جبلہ! یہ خیال دل سے نکال دو، اگر تم اس فزاری سے اپنا قصور معاف نہیں کراؤ گے تو میں تمہیں ضرور سزا دوں گا۔“ جبلہ نے کہا کہ ”میں پھر اپنا پہلا دین عیسائیت اختیار کر لیتا ہوں۔“ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ”اگر اب تم نے عیسائیت اختیار کی تو میں تمہاری گردن مار دوں گا کیونکہ تم اسلام قبول کر چکے ہو اور اس میں مرتد کی سزا قتل ہے۔“ جبلہ سیدنا عمرؓ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر پریشان ہو گیا۔ اس نے امیر المومنین کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دے دی جائے تاکہ میں رات کو اس معاملہ میں غور و فکر کر لوں۔

جبلہ اپنی قیام گاہ پر گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو چپکے سے چل نکلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہ سب راتوں رات شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ صبح ہوئی تو نہ جبلہ تھا اور نہ

اس کے ساتھی۔ وہ مکہ سے کافی دور جا چکے تھے اور مکہ ان کے ناپاک وجود سے خالی ہو گیا تھا۔ جبلہ نے سیدھا قسطنطنیہ کا رخ کیا اور وہاں جا کر ہرقل کے پاس اپنے ساتھیوں سمیت دوبارہ عیسائی ہو گیا۔ ہرقل جبلہ کے واپس آ جانے پر بہت خوش ہوا اور اسے اپنے حق میں ایک بہت بڑی فتح تصور کرنے لگا اور اس کو جاگیر سے نوازا اور بہت سی مراعات بھی دیں۔ (الاغانی جلد ۱۵ ص ۴۴)

بعض روایات میں ہے کہ جبلہ قسطنطنیہ میں ہرقل کے پاس بڑے عیش و آرام سے رہتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی دمشق کے آس پاس والی قیام گاہ کو اکثر یاد کرتا رہتا۔ ایک مرتبہ سیدنا عمرؓ نے ایک قاصد کو خط دے کر ہرقل کے پاس بھیجا۔ جب وہ ہرقل کے پاس سے واپس آ رہا تھا تو جبلہ سے وہاں مل گیا۔ دیکھا کہ اس کی شان و شوکت ہرقل سے بھی زیادہ ہے۔ کنیزیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور سیدنا حسان بن ثابتؓ کے اشعار گا رہی ہیں۔ جبلہ نے قاصد سے سیدنا حسانؓ کی خیر و عافیت پوچھی۔ قاصد نے کہا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہی ہیں اور وہ نہایت ضعیف العمری میں زندگی کی باقی ماندہ منزلیں طے کر رہے ہیں۔ جبلہ کو سیدنا حسانؓ کی یاد بہت ستانے لگی اور اس نے ایک کنیز کو پانچ سو دینار اور پانچ ریشمی پوشاکیں لانے کا حکم دیا۔ جب وہ لے آئی تو جبلہ نے قاصد سے کہا کہ حسانؓ کو میری یہ چیزیں پہنچا دینا۔ اس کے بعد قاصد کو بھی اتنا ہی انعام دینا چاہا لیکن قاصد نے وہ انعام لینے سے انکار کر دیا۔ جبلہ زار و قطار رو پڑا اور کنیزوں سے کہا کہ مجھے اور رلاؤ۔ کنیزوں نے اپنے عود اور بربط اٹھائے اور جبلہ کے ان اشعار کو نغمے میں ڈھالنے لگیں جن کا ترجمہ یہ ہے

(۱) میں نے ایک طمانچہ کھا کر قبیلے کے سرداروں سے مدد طلب کی۔ اگر میں اس پر چپ ہو جاتا تو کوئی بڑی بات نہ ہوتی۔

(۲) لیکن مجھے غصے اور غرور نے گھیر لیا اور میں نے صحیح آنکھ کانی آنکھ کے بدلے فروخت کر ڈالی۔

(۳) کاش میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا اور کاش میں وہی بات مان لیتا جو عمرؓ نے مجھے کہی تھی۔

(۴) کاش میں ترائی ہی میں اپنا گلہ چرایا کرتا یا ربیع یا مضر کے ہاں قید کاٹ رہا ہوتا۔

(۵) اور کاش میں شام میں ادنیٰ اوقات بسر کرتا اور اپنے ہم وطن اور ہم قوم لوگوں میں بہرا اور اندھا ہو کر رہتا۔

قاصد مدینہ طیبہ واپس آیا اور امیر المومنین سیدنا عمرؓ کو جبلہ کا تمام حال سنایا اور اس انعام کا بھی ذکر کیا جو اس نے سیدنا حسان بن ثابتؓ کو بھیجا تھا۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ جبلہ اتنی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود خوش نہیں تھا اور اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہونے پر نہایت افسوس تھا لیکن اب دنیا کی عیش و عشرت اس کو اسلام کی طرف دوبارہ آنے سے روکے ہوئے تھی اور اپنے وطن شام کی محبت بھی اس کے دل و دماغ میں کروٹیں لے رہی تھی اور قسطنطنیہ میں سب کچھ ہونے کے باوجود وہ بے سکونی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

تاریخ کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک صحابیؓ قسطنطنیہ تجارت کے سفر میں تشریف لے گئے تو جبلہ ابن ایہم کو خبر ہوئی کہ ایک صحابیؓ مدینے سے آئے ہیں۔ آخر مسلمان تو ہوا تھا۔ کچھ نہ کچھ اسلام کا دھیان اس کو تھا ہی۔ ان صحابیؓ کو اس نے دعوت دی اور اپنے ہاں بلایا۔ جب یہ صحابیؓ اس کے پاس گئے تو جبلہ نے کہا: ''آپ کو معلوم ہے کہ میں اسلام لے آیا تھا لیکن وہ فزاری کے ساتھ میرا مقدمہ ہوا تو میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ ایک بادشاہ اور دیہاتی برابر نہیں ہو سکتے، لیکن آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ آج تک نہ میرے دل کو سکھ ملا نہ چین۔ سچی بات وہی تھی جو سیدنا عمرؓ نے فرمائی تھی۔ دین حق بھی وہی اور سچا ہے، اور میں اس پر نادم ہوں کہ میں نے دین اسلام کو چھوڑ دیا۔ گو مجھے ظاہری دولت بہت پھر مل گئی لیکن مجھے دلی سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ میرا اب جی چاہتا ہے کہ میں پھر اسلام میں داخل ہو جاؤں مگر چونکہ بادشاہ ہوں اس لیے میں اپنے وقار کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا حیلہ ہو جائے جو میں کہہ سکوں کہ بھئی! اگر میں نے اسلام قبول کیا تو کوئی بری بات نہیں فلاں نعمت بھی مجھے ملی۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر امیر المومنین سیدنا عمرؓ اپنی صاحبزادی سے میری شادی کر دیں اور اس کا وعدہ دے دیں تو میں اس کو

حیلہ بنا کر اسلام میں داخل ہو جاؤں، بعد میں چاہے وہ شادی کریں یا نہ کریں، یا میں ہی انکار کر دوں، مگر میرے لیے ایک حیلہ اور عذر بن جائے گا۔ میں اپنی قوم سے کہوں گا کہ امیر المومنین عمرؓ جیسا بادشاہ جس سے دنیا کے بادشاہ ڈرتے ہیں، جب وہ مجھے اپنی بیٹی دے رہا ہے تو میری اس سلطنت سے ان کی بیٹی زیادہ عزت والی ہے۔ میں پھر اسلام قبول کیے لیتا ہوں۔

ان صحابیؓ نے کہا: ''میں امیر المومنینؓ کے پاس آپ کی اس بات کا ذکر کروں گا اور اس کے بعد میں پھر آپ کے پاس آؤں گا۔

چنانچہ یہ صحابیؓ واپس آئے اور سیدنا عمرؓ سے یہ سارا واقعہ ذکر کیا۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا:

> ''تم نے کیوں نہ وہیں وعدہ دے دیا۔ عمرؓ کی بیٹی: اسلام کے مقابلہ میں کیا چیز ہے؟ اگر ایک شخص اسلام میں آئے اور عمرؓ کی بیٹی اس کے نکاح میں چلی جائے تو میری بیٹی کی اسلام کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمہیں وعدہ کر لینا چاہیے تھا کہ ٹھیک ہے۔ میرا وعدہ ہے۔''

انہوں نے کہا: ''امیر المومنین! میں تو ڈر رہا تھا کہ میں کیسے وعدہ کروں۔''

فرمایا: ''نہیں، فوراً قسطنطنیہ کا سفر کرو اور اس سے جا کر کہو کہ:

> ''عمرؓ کی بیٹی حاضر ہے تو اسلام قبول کر۔''

چنانچہ وہ صحابیؓ واپس قسطنطنیہ گئے۔ جب وہ قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تو جبلہ کا جنازہ جا رہا تھا۔ اس کی قسمت میں اسلام نہیں تھا۔ چنانچہ وہ صحابیؓ بے چارے واپس چلے آئے۔

جبلہ کے بارہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سیدنا عمرؓ نے جبلہ اور اس کے ساتھیوں کا اسلام سے پھر جانا قبول کر لیا لیکن اسلام کے قانون عدل وانصاف کو داغ دار نہ ہونے دیا، اور شاید اسی شی نے جبلہ کو پوری زندگی پریشان رکھا اور وہ اپنے کیے پر افسوس کرتا رہا۔

عدل کی پیشانی پر اگرچہ خوش نمائی کی بلندی کی جگہ تخی اور خشونت کی لکیریں ہیں لیکن دنیا کا تمام نظام صرف اسی کے دم سے ہے کیونکہ اس کارگاہِ آب وگل کا تمام نظام ہی عدل وتوازن پر ہے۔ اس دنیا میں عدل وانصاف کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ نظام شمسی کا ہر کرہ اپنی جگہ معلق ہے اور اپنے اپنے دائروں میں حرکت اور گردش کر رہا ہے، اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں ذرا بھی انحراف اور میلان واقع ہو۔ یہی عدل کا قانون ہے جس نے سب کو ایک خاص نظم میں جکڑ رکھا ہے۔ اسی عدل وانصاف ہی کا یہ کرشمہ تھا کہ ایک قوم صحرائے عرب سے اٹھی، سیلاب کی طرح بڑھی اور تمام کرۂ ارض پر پھیل گئی۔ دنیا نے اس سیلاب کی زد میں ظلم ودرندگی کی انہی لہروں کو دیکھنا چاہا جو ہمیشہ فوجوں کے طوفان میں اٹھتی رہی ہیں، لیکن دنیا نے دیکھا اور تاریخ کے صفحات اس کی چشم دید گواہی دیتے ہیں کہ وہ مختلف مادی طاقتوں سے ٹکرائی، عظیم الشان پہاڑوں کو ٹھوکر ماری اور بالآخر تمام کرۂ ارض کو اچھال کر رکھ دیا۔ تاہم نہ کسی جھونپڑی کو اجاڑا، نہ کسی گھر کو آگ لگائی، نہ کسی عظیم الشان محل کو برباد کیا، نہ تمدن کی یادگاریں مٹائیں اور نہ ہی تہذیب کے آثار قدیمہ مسمار کیے، نہ کسی ظالم کی مدد کی اور نہ کسی مظلوم کی امداد سے منہ پھیرا۔ وہ فاتحانہ جوش میں سیلاب کی طرح بڑھی لیکن جب ممالک مفتوحہ میں داخل ہوئی تو گرداب کی طرح سمٹ گئی۔

اسلام کا یہی قانون عدل وانصاف تھا جو بادشاہِ وقت کو ایک معمولی فردِ رعایا کے دعویٰ کے جواب دہی کے لیے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا تھا۔ یہ بات نہ صرف مدینہ کی اس سادہ مسجد کی عدالت ہی میں تھی بلکہ دمشق اور بغداد کی پرشوکت عدالتوں میں بھی ایسا ہی تھا کہ ہارون الرشید جیسا باجبروت خلیفہ قاضی ابو یوسفؒ کی عدالت میں مدعی کے ساتھ کٹہرے میں کھڑا ہونے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا۔

اسی قانون مساوات اور قانون عدل وانصاف کا چراغ چھٹی صدی عیسوی کی تاریک فضاؤں پر عرب کے اس امی نبی ﷺ نے روشن کیا تھا اور جس کی شعاعیں آج بھی دنیا میں اپنی روشنی پھیلا رہی ہیں۔ آج یورپ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قانون عدل و مساوات کا معلّم ہے۔ اگر یہ درست اور سچ ہے تو پھر یہ کیا ہے جو اب تک بادشاہوں کے

سروں پر نظر آتا ہے؟ یہ کس کی دولت ہے جو بادشاہوں کے تاج پر ہیروں اور ان کی انگلیوں کی انگوٹھیوں میں دفن کی جاتی ہے۔ وہ بڑے بڑے ایوان ہائے صدور، وہ سر بفلک عمارتیں اور وہ عظیم الشان محل اور وہ انسانی بہترین وسائل تعیش اور ذرائع آرام و راحت جو آج بھی یورپ کے بادشاہوں اور وزیر اعظموں کے لیے لازمی سمجھے جاتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں؟! اور کس کا خون ہے جن کے قطروں سے عظمت و کبریائی کی یہ چادر رنگی جاتی ہے؟ مدینے کا وہ قدوس شہنشاہ چٹائی پر سوتا ہے اور اس کے مبارک اور نازک جسم پر کھجور کی چٹائی کے نشان پڑ جاتے ہیں، اور اس کے جانشین عین اس وقت جب کہ وہ روم و عجم اور عراق و شام کے تخت الٹنے کے لیے حکم دینے والے تھے، پھٹے پرانے قمیصوں کو جسم پر رکھتے تھے۔ ان کے پیراہنوں کو سترہ سترہ پیوند لگے ہوتے تھے، اور پتوں کی جھونپڑی کے نیچے سوتے تھے، اور کھجور کے پتوں سے بنی چھت والی کچی مسجد کا صحن ان کا ایوان اور محل ہوتا تھا۔ قیصر و کسریٰ کے قاصد اور سفیر مسجد نبوی میں آ کر ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ اسلام کا شہنشاہ کہاں ہے حالانکہ شہنشاہ وہیں پیوند لگے لباس میں ملبوس کسی گوشہ میں بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کے گورنر اسی برابری کے القاب سے اسے خط لکھتے تھے جس طرح وہ گورنروں کو خط لکھا کرتے تھے۔

اسلام کے اسی قانون عدل و انصاف سے اگرچہ خاص خاص آدمیوں جیسے جبلہ بن ایہم جن کی ادعائی شان مجروح ہوتی تھی، کے دل مکدر ہوتے تھے؟ لیکن چونکہ ہر زمانہ میں عوام کا اصلی مذاق یہ تھا، اس لیے عوام پر اس کا نہایت اچھا اثر پڑتا تھا اور تھوڑے ہی دنوں میں عوام عادل و منصف بادشاہ کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انسانی نفسیات کا بنیادی اصول ہے۔

……

﴿اخلاص اور للّٰہیت﴾

اخلاص دین میں ایک نہایت اہم چیز ہے، اور کوئی عبادت اور کوئی نیک عمل اللہ کے ہاں شرف قبولیت حاصل نہیں کرسکتا جب تک اس میں اخلاص کی روح نہ ہو۔ اس کو قرآن حکیم میں یوں فرمایا گیا:

﴿وما امروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین حنفاء﴾

(البینۃ:)

''اور ان لوگوں کو (کتب سابقہ میں) یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اس کے لیے خالص رکھیں (ادیان باطلہ اور شرکیہ سے) یکسو ہو کر۔''

اور حدیث نبوی میں کہا گیا کہ

''حق تعالیٰ شانہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہاری نیتوں اور اعمال پر نظر فرماتے ہیں۔

اخلاص کیا ہوتا ہے اس کے بارہ میں حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے ارشاد فرمایا:

''اپنی طرف سے صرف اللہ تعالیٰ کے تقرب اور رضا کا قصد رکھنا، اور مخلوق کی خوشنودی اور رضا مندی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کی آمیزش نہ ہونے دینا، اخلاص ہے۔''

اخلاص کے وجوداً اور عدماً تین درجے ہیں۔''

(۱) ایک یہ کہ فعل کے وقت غایت صحیح کا قصد ہو۔ یہ تو غایت اخلاص ہے، اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ غایت فاسدہ کا قصد ہو، یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔

(۳) تیسرا یہ کہ کچھ بھی قصد نہ ہو، نہ تو غایت صحیح کا نہ غایت فاسدہ کا بلکہ یونہی

معمول کے موافق ایک کام کرلیا۔ یہ درجہ بین بین ہے۔ اس کو اخلاص سے اتنا بُعد نہیں جتنا دوسرے درجہ کو بُعد ہے۔

> "اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور قصد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہوں گے۔ اس کے سوا اور کوئی نیت نہ ہو۔ یہ تو اخلاص کا درجۂ کمال ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کہ دوسرے شخص کے دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص ہمارے خضوع و خشوع کو دیکھ کر ہمارا معتقد ہو جاوے گا۔ یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ ہم معمول کے مطابق نماز پڑھ لیں۔ نہ وہ خیال دل میں ہو اور نہ یہ خیال۔ یہ مرتبہ بین بین ہے۔ یہ اگر اخلاص کا درجہ کمال نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں۔ اس کو اخلاص سے قرب ضرور ہے۔"
>
> (اشرف المسائل ص ۹۱)
>
> "اپنی طرف سے صرف اللہ تعالیٰ کے تقرب اور رضا کا قصد رکھنا اور مخلوق کی خوشنودی اور رضا مندی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کو ملنے نہ دینا اخلاص ہے۔" (تعلیم الدین ص   )

اور اخلاص کی حقیقت کو مجدد تھانویؒ نے یوں بیان فرمایا:

> "اخلاص کے معنی لغت میں خالص کرنے کے ہیں اور شریعت میں اس کے معنی وہی ہیں جو ورود شرع سے پہلے تھے۔ خالص گھی وہ ہے جس میں کوئی دوسری شے نہ ملی ہو۔ اخلاص عبادت کے معنی بھی یہ ہوئے کہ عبادت کو غیر عبادت سے خالی کیا جاوے یعنی کوئی ایسی غرض اس میں نہ ملی ہو جس کا حاصل کرنا شرعاً مطلوب نہ ہو۔"
>
> (التبلیغ: جلد ۲ ص ۱۳۲)

اس اخلاص کے بارہ میں بہت سے بزرگوں کے حیرت انگیز واقعات تاریخ اپنے سینہ میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ماضی قریب میں بہت سے بزرگ

اخلاص وللّٰہیت کی گراں بہا دولت سے مالا مال تھے۔ جن میں سے ایک بزرگ کا نام شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیاں رکھی تھیں۔ شعلہ مقالی بھی تھی اور فکر غزالی بھی، اسلوب تصنیف محققانہ تھا اور زیست قلندرانہ، انداز و نگارش، حرانہ اور پیشہ زندگی مجاہدانہ تھا۔ فتویٰ سے زیادہ تقویٰ پر انحصار تھا، جزئیات وکلیات دونوں کے ماہر و آشنا، قلب میں فلوس کے بجائے خلوص سے محبت تھی۔ دینی رنگ کے ساتھ دنیوی آہنگ بھی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کے ساتھ ساتھ مالٹا کے اسیر بھی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی ایک ہی چھت کے نیچے مختلف علوم وفنون کا درس دیتے۔ ان کے تلامذہ میں سے خطیب بھی تھے اور سفیر بھی، محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، معقولی بھی تھے اور منقولی بھی، قاضی بھی تھے اور سیاست کے ماہر بھی، مفتی بھی تھے اور معلم بھی۔ انہی شیخ الہندؒ کے بارہ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

> ”ایک بار احقر کی درخواست پر مدرسہ جامع العلوم کانپور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اور احقر کے بے حد اصرار پر وعظ فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ جامع مسجد میں وعظ شروع ہوا۔ جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی بھی کانپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے عرض کرنے پر جلسہ میں تشریف لائے اور عین اثنائے وعظ میں تشریف لائے۔ اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہو رہا تھا جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا، اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں۔ مولانا کی جونہی مولانا علی گڑھی پر نظر پڑی۔ فوراً وعظ بیچ ہی میں قطع کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا فخر الحسن گنگوہی بوجہ ہم درس ہونے کے بے تکلف تھے۔ انہوں نے دوسرے وقت عرض کیا کہ یہ کیا کیا؟ کہا تو

وقت تھا بیان کا۔ فرمایا: ''یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہار علم کے لیے بیان ہوا نہ کہ اللہ کے واسطے۔''

(یہ واقعہ ذکر محمود: ص ۵ میں مرقوم ہے۔)

اسی اخلاص کے بارہ میں ایک اور واقعہ حکیم الامت تھانویؒ نے ہی بیان کیا۔ اور یہ واقعہ شیخ ابوالحسین احمد بن نوری قدس سرہ کے بارہ میں ہے۔ شیخ ابوالحسین نوریؒ اپنے زمانہ کے اولیائے کبار میں سے تھے۔ آپ حضرت سری سقطیؒ (م ۲۵۲ھ) کے مرید، حضرت شیخ احمد بن ابی الحواریؒ کے صحبت یافتہ اور حضرت جنید بغدادیؒ کے ہم عصر تھے۔ عجیب بزرگ تھے، ہر برائی کا احتساب فرماتے تھے۔ آپ کو نوری اس لیے کہتے ہیں کہ جب آپ اندھیری رات میں گفتگو فرماتے تو آپ کے منہ سے ایسا نور نکلتا جس سے سارا گھر روشن ہو جاتا، اور اس وجہ سے بھی کہ آپ اپنے نور فراست سے باطن کے اسرار بتا دیا کرتے تھے۔ بعض حضرات کے مطابق اس وجہ سے بھی کہ جنگل میں آپ نے ایک عبادت خانہ بنوایا ہوا تھا جس میں آپ ساری رات عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ جب لوگ وہاں آپ کی زیارت کے لیے جاتے تو رات کو ایک نور چمکتا ہوا دیکھتے جو گھر کے اوپر تک چھایا ہوا ہوتا تھا۔ (تذکرۃ الاولیاء، جلد ۲، ص ۳۹)

تیسری صدی ہجری میں جب معتضد باللہ عباسی سلطنت اسلامی پر حکمران تھا۔ اس خلیفہ میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں کچھ نقائص بھی تھے جو ایک اسلامی سربراہ کے لیے نقصان دہ اور ایک اسلامی ریاست کے لیے باعث زوال ہوتے ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ یہ اپنی تمام خوبیوں کے باوصف نہایت منتقم مزاج اور سخت گیر حکمران تھا۔ اگر اس کو کسی شخص پر غصہ آ جاتا ہے، تو اس شخص کا بچنا نہایت مشکل ہوتا۔ بعض دفعہ تو وہ ان لوگوں کو زندہ زمین میں گڑوا دیتا تھا۔ سلطنت کے چلانے میں رعایا پر اس قسم کی سختی اکثر و بیشتر سلطنت کی تباہی و بربادی کا باعث بن جاتی ہے۔ حکیم الامت تھانویؒ ہی کا ایک ملفوظ ہے کہ حکومت اور کفر تو جمع ہو سکتے ہیں لیکن حکومت اور ظلم جمع نہیں ہو سکتے۔ رعایا کے ساتھ انتقامی فطرت اور جذبہ رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ ایک سربراہ مملکت کو رعایا کے ساتھ باپ سے بھی زیادہ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ

خلیفہ معتضد باللہ میں یہ خرابی تھی۔ اس خرابی کی وجہ سے بہت سے بے گناہ شخص موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اس خلیفہ کے عہد حکومت میں ایک بزرگ شیخ ابوالحسن احمد نوری قدس سرہ تھے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے احتساب کا مادہ بہت زیادہ رکھا تھا۔ خلاف شریعت کوئی شی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

> ''ایک بار ایک موقع پر چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے دجلہ کے کنارے پہنچے۔ وہاں دیکھا شراب کے مٹکے کشتیوں سے اتر رہے ہیں۔ پوچھا کہ ان میں کیا ہے؟ کشتی والے نے کہا: ''شراب ہے۔'' خلیفۂ وقت معتضد باللہ کے لیے آئی ہیں۔ اور وہ دس مٹکے تھے۔ شیخ نوریؒ کو غصہ آ گیا اور کشتی والے کی لکڑی مانگ کر نو مٹکے یکے بعد دیگرے توڑ ڈالے اور ایک مٹکا چھوڑ دیا۔ چونکہ یہ شراب خلیفہ کے لیے لائی گئی تھی، اس لیے کہ براہِ راست خلیفہ کے ہاں چالان بھیج دیا گیا۔ معتضد باللہ نہایت ہیبت ناک صورت میں بیٹھ کر اجلاس کیا کرتا تھا۔ لوہے کی ٹوپی اوڑھتا تھا اور لوہے کی زرہ اور لوہے کا گرز ہاتھ میں ہوتا تھا اور لوہے کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔
>
> معتضد نے نہایت کڑک کر ہولناک آواز سے پوچھا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ حضرت شیخ نے فرمایا کہ جو کچھ میں نے کیا آپ کو بھی معلوم ہے، دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ میں یہاں تک نہ لایا جاتا۔ معتضد یہ جواب سن کر برہم ہوا اور پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ کیا تم محتسب ہو؟ شیخ نے فرمایا کہ ہاں محتسب ہوں۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تم کو کس نے محتسب بنایا ہے؟ فرمایا کہ جس نے تجھ کو خلیفہ بنایا ہے۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کوئی دلیل ہے: فرمایا کہ
>
> ﴿یا بنی اقم الصلوة وامر بالمعروف وانه عن المنکر، واصبر علیٰ ما اصابک﴾
>
> (اے میرے بیٹے! قائم کر نماز کو، حکم کر نیک باتوں کا، اور روک لوگوں

کو بری باتوں سے اور اس سے جو تجھ کو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر)

معتضد شیخ سے یہ بے باکی کی باتیں سن کر متاثر ہوا اور کہا کہ ہم نے تم کو آج سے محتسب بنایا، مگر ایک بات بتاؤ کہ ایک مٹکا تو نے کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ جب میں نے تو مٹکے توڑ ڈالے تو نفس میں خیال آیا کہ اے ابوالحسین! تو نے بڑی ہمت کا کام کیا، کہ خلیفۂ وقت سے بھی نہ ڈرا۔ میں نے اسی وقت ہاتھ روک لیا کیونکہ اس سے پہلے تو میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مٹکے توڑے تھے، اب اگر توڑ دوں گا تو وہ نفس کے لیے ہوگا، اس لیے دسواں مٹکا چھوڑ دیا۔ (وعظ ذم الہدیٰ، از حکیم الامت تھانویؒ ص ۳۰)

شیخ ابوالحسین نوری جیسے کئی اہل اللہ اس امت میں پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے اخلاص سے بڑے بڑے جابروں کو کلمۂ حق سنایا، ان میں بعض تو ان جابروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گئے اور بعض نے ان جابروں کو سیدھا راستہ دکھا دیا۔

* * *

﴿شریعت کا احترام﴾

مولانا ضیاءالدین سنامی (م ۷۰۹ھ) اپنے وقت کے ایک نہایت ثقہ، جید اور متشرع عالم دین تھے۔ حکومت وقت کی جانب سے انہیں محتسب مقرر کیا گیا۔ شریعت کے معاملہ میں وہ نہایت سخت تھے اس وجہ سے احتساب میں بھی نہایت شدت سے کام لیتے تھے۔ شریعت کے معاملہ میں وہ معمولی سی غفلت پر بھی نہایت سخت محاسبہ فرماتے تھے اور اس بارہ میں کسی بڑے سے بڑے شخص کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ آپ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (۷۲۵ھ) اور شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ (۷۲۴ھ) کے معاصرین میں سے تھے۔ اگرچہ یہ دونوں بزرگ اپنے زمانہ میں مرجع خلائق تھے۔ حضرت نظام الدین ولیاءؒ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے خلیفہ تھے۔

حضرت نظام الدین اپنے پیرومرشد سے خرقہ خلافت حاصل کرکے اور ان کی دعاؤں سے دامن بھر کے اجودھن (موجودہ پاک پٹن) سے دہلی اس شان سے روانہ ہوئے کہ اخلاص، اعتماد علی اللہ، اور استغنا عن الخلق کے سوا آپ کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ان کی اس آمد کو اپنے لفظوں میں یوں بیان فرمایا ہے:

> "ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں نیچے سے اوپر تک بے شمار جھوٹے الٰہ پرا جمائے بیٹھے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن سر سے جدا کر دیتی ہے۔ وہ بھی ہیں جن کی نیاز مندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے۔ گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے۔ مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لٹائے جا رہے ہیں، گودیں بھری ہیں اور جن جن ذرائع سے یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں، سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں۔

اجودھن جانے سے پہلے دہلی کی علمی محفلوں کی محفل شخنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے۔ کچھ نہیں تو قضا کے عہدے سے لے کر شیخ الاسلامی وصدر جہانی کی خدمات تک کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں، لیکن اب خالق کی صورت میں جو الٰہ ان کو مل چکا ہے، سینہ اسی کے وزن سے معمور ہے کہ کسی مخلوق کی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی۔ قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی۔ جس کا اظہار وہ کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے

ایمان کس تمام نشود تا ہمہ خلق
در نزدیکی اوہم چوپشک شترنہ نماید

مجلس مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لیے ساری رات نماز پڑھتا تھا۔ اپنی انہیں نمازوں کو نگاہ خلق میں حصول عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ جامع ملفوظات راوی ہیں کہ

بدیں میاں خواجہ ذکر اللہ بالخیر چشم بر آب کردہ برلب مبارک واند بسوز اول شیخ الاسلامی را، پس خانقاہ را، بعد ازاں خود را

(فوائد الفواد ص ۲۳)

یہ سن کر حضرت خواجہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا کہ پہلے شیخ الاسلامی کو جلاؤ، پھر خانقاہ کو آگ لگاؤ، پھر اپنی خودی کو جلا کر خاک کردو۔

غرض اس شان کے ساتھ سب کچھ جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے اور جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایہ تخت میں آپ پہنچ گئے۔"

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد ا ص ۱۵۰)

دہلی میں آپ وارد ہو کر کس شان سے رہے، اس کا ذکر بھی مولانا گیلانی نے کیا ہے کہ

"آج جن چیزوں پر ایوان نعمت کے قصوں کے ساتھ غریبوں کا

> دکھڑا رویا جاتا ہے، گویا یہ بھی ایک قسم کی حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیائے اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی لکڑی کا کام دیتی تھیں۔ ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے۔ خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا؟ گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خان تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا۔ علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے مال گذاری داخل کرنی پڑتی تھی۔''

(مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد ا ص ۱۵۰)

ان سب باتوں کے باوجود آپ کو سلاطین عہد سے بے تعلقی تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ سے لے کر خواجہ نظام الدین اولیاء تک یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی کہ ان کو دربار میں جانا ہے اور نہ سلاطین سے ملاقات کرنی ہے۔ اس اصول پر یہ سب حضرات سختی سے کاربند رہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ خارزار سیاست میں ان کا پاؤں کبھی نہیں الجھا اور انقلابات سلطنت کا ان روحانی مرکزوں اور ان کی سرگرمیوں پر کبھی کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کا اخلاص، ان کی بے غرضی اور بے لوثی سیاسی اختلافات کے باوجود مسلم رہی۔

سلطان علاء الدین خلجی ہندوستان کا ایک باجبروت اور اقبال مند بادشاہ تھا۔ اس نے امتحاناً ایک عریضہ آپ کی خدمت میں ولی عہد سلطنت خضر خان کے ہاتھ بھیجا جس میں انتظام سلطنت کے بارہ میں کچھ مشورے طلب کیے۔ جب خضر خان وہ خط لے کر حاضر خدمت ہوا تو آپ نے وہ خط لے کر اس کا مضمون نہیں پڑھا اور حاضرین سے کہا: ''ہم دعا کرتے ہیں۔'' پھر ارشاد فرمایا: ''درویشوں کا بادشاہوں سے کیا کام؟'' میں ایک فقیر اور درویش آدمی ہوں۔ شہر کا ایک گوشہ اختیار کر رکھا ہے۔ بادشاہ اور مسلمانوں کے لیے دعا گوئی میں مصروف ہوں۔ اگر بادشاہ کو یہ پسند نہیں تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا۔

یہ حال تو سلطان المشائخ کا تھا۔ دوسرے بزرگ اس زمانہ میں شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ جمال ہانسویؒ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ یہ پانی پت میں پیدا ہوئے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد ایک فقیر کے اثر سے درس و تدریس چھوڑ کر جنگل میں نکل گئے اور قلندروں کے آزادانہ طریقے اختیار کر لیے۔ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب (Preaching of Islam) میں لکھا ہے کہ پانی پت کے علاقہ میں جو مسلمان راجپوت ہیں وہ آپ ہی کی بدولت مسلمان ہوئے اور ان کا مورث اعلیٰ امر سنگھ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔

غرض کہ یہ دونوں حضرات کوئی معمولی قسم کے لوگ نہ تھے بلکہ بڑے بڑے صاحبان اقتدار ان کے دریوزہ گر تھے۔ مولانا ضیاء الدین سنامیؒ نے احترام شریعت میں ان حضرات کا احتساب بھی فرمایا اور جب بھی کوئی بات شریعت کے خلاف ان میں دیکھی فوراً محاسبہ کیا۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) فرماتے ہیں:

> ”مولانا ضیاء الدین سنامیؒ دیانت و تقویٰ میں مقتدائے وقت اور شریعت کے احکام پر نہایت مضبوطی سے کاربند تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ہم عصر تھے، اور آپ سے سماع کے متعلق ہمیشہ محاسبہ کرتے رہتے تھے، اور آپ (خواجہ نظام الدین اولیاءؒ) معذرت وانقیاد کے سوا آپ سے پیش نہ آتے تھے، اور مولانا کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھتے تھے۔ ”نصاب الاحتساب“ آپ کی تصنیف ہے جو احتساب کے دقائق اور قواعد کے ساتھ مختلف قسم کی بدعات اور احکام سنت کے بیان پر مشتمل ہے۔
>
> ”منقول ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت مولانا ضیاء الدین سنامیؒ کے مرض الوفات میں ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا سنامیؒ کو جب خواجہ صاحبؒ کے آنے کی اطلاع دی گئی تو اپنی دستار حضرت خواجہ صاحبؒ کے لیے راستہ میں بچھوا دی تاکہ آپ اس پر چل کر آئیں لیکن حضرت خواجہ صاحبؒ نے وہ دستار

زمین سے اٹھا کر آنکھوں سے لگائی۔ جب حضرت خواجہ صاحبؒ مولانا سنامیؒ کے پاس پہنچے تو مولانا سنامیؒ نے ندامت سے آپ سے آنکھیں نہیں ملائیں۔ حضرت خواجہ صاحبؒ اٹھ کر ابھی باہر تشریف لائے ہی تھے کہ مولانا سنامیؒ کی وفات کا شور مچ گیا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ افسردہ ہو کر رونے لگے اور فرمایا:

یک زاد بود حامی شریعت حیف کہ آں نیز نماند

ایک حامی شریعت ذات تھی، افسوس کہ وہ بھی دنیا میں نہ رہی۔

(اخبار الاخیار: ص ۲۱۰)

مولانا ضیاء الدین سنامیؒ نے، جب ایک مرتبہ شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کے لبوں کے بال بہت بڑھ گئے تھے (اور یہ بات بظاہر شریعت کے خلاف تھی کیونکہ حدیث میں لبوں کے کٹوانے کا حکم آیا ہے "قصوا الشوارب") کسی کو اتنی مجال نہ تھی کہ وہ حضرتؒ سے کترنے کو کہتا۔ مولانا سنامیؒ کو پتہ چلا تو فوراً آئے اور قینچی لے کر ان کے پاس پہنچے اور ڈاڑھی سے پکڑ کر لبوں کو تراش دیا۔"

حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ

بعد ازاں شیخ ہمیشہ محاسن خود را بوسیدے وگفتے کہ ایں در راہ شریعت محمدی گرفتہ شدہ است

اس کے بعد شیخ بوعلیؒ ہمیشہ اپنی داڑھی کو بوسہ دے کر فرماتے کہ یہ شریعت کی راہ میں پکڑی گئی ہے۔

میر عبدالواحد بلگرامی نے ایک اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ مولانا سنامیؒ جب پہلی بار احتساب کے لیے حضرت شیخ بوعلی قلندر پانی پتیؒ کے پاس گئے تو انہوں نے دو تین بار تیز نگاہ سے ان کی طرف دیکھا لیکن مولانا سنامیؒ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جب مولانا سنامیؒ چلے گئے تو لوگوں نے قلندر صاحبؒ سے کہا کہ آج تو شیخ ضیاء الدینؒ نے آپ پر بڑی سختی کی۔ فرمایا:

دو سہ بار خواستم کہ اورا بزنم، اور زرۂ شریعت پوشیدہ است، تیر من اثر نہ کرد

> دو تین بار میں نے چاہا کہ اس پر حملہ کروں لیکن اس نے شریعت کی زرہ پہن رکھی تھی اس لیے میرے تیر نے اس پر اثر نہیں کیا۔

(سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات: ص ۲۷۷)

اندازہ فرمائیں کہ حضرت مولانا ضیاء الدین سنامیؒ اس سخت احتساب کے باوجود یہ دونوں بزرگ کس طرح ان کا احترام کرتے تھے، اور مولانا سنامیؒ بھی ان دونوں بزرگوں کی روحانی عظمت کے قائل تھے کہ خواجہ صاحبؒ کی آمد پر اپنی پگڑی بچھا دی تا کہ وہ اس پر سے گزر کر تشریف لائیں۔ پہلے بزرگوں میں باہمی احترام کی یہ صفت بہت زیادہ تھی اور اس وجہ سے عوام کے دلوں میں بھی محبت و آشتی کے جذبات موجزن رہتے تھے۔ چنانچہ انہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا ایک اور واقعہ کتابوں میں مرقوم ہے کہ

> "ایک مرتبہ ایک خراسانی عالم نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے کہا کہ میں آپ کے پاس آتا ہوں تو ہر بار مجھ کو کچھ نہ کچھ کھلاتے ہیں لیکن میں شیخ رکن الدینؒ کے پاس کئی بار گیا انہوں نے مجھ کو کوئی چیز نہیں کھلائی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے جواب دیا کہ میں اس حدیث پر عمل کرتا ہوں "من زار حیاً و لم یذق منہ شیئاً فکانما زار میتاً" یعنی جو شخص زندہ کی زیارت کرے اور اس کے یہاں کچھ نہ چکھے تو گویا اس نے مردے کی زیارت کی۔ خراسانی عالم نے پوچھا: "کیا شیخ رکن الدینؒ تک یہ حدیث نہیں پہنچی؟" حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا: "شیخ رکن الدین عمل معنوی کرتے ہیں اور وہ ذوق روحانی چکھاتے ہیں"۔ خراسانی عالم نے کسی موقع پر شیخ رکن الدینؒ سے عرض کیا کہ شیخ نظام الدین کہتے ہیں کہ شیخ رکن الدین ذوق روحانی دیتے ہیں اور میں ذوق جسمانی دیتا ہوں۔" شیخ رکن الدینؒ نے فرمایا: "برادرم نظام الدین نے تواضع سے کام لیا ہے۔ ان میں دونوں وصف ہیں۔ وہ ذوق روحانی بھی عطا کرتے ہیں اور ذوق جسمانی بھی۔" (بزم صوفیہ، ص ۱۱۳)

﴿مواخذۂ آخرت﴾

مفتی عزیز الرحمٰن (م ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء) سر میں عالمانہ ذہن، سینے میں صوفیانہ دل اور ہاتھ میں مفتیانہ قلم رکھتے تھے۔ ان کی صحبت میں علم جھلکتا تھا اور نوکِ قلم سے فتویٰ۔ آپ انتہائی سادہ مزاج، انتہائی رقیق القلب تھے۔ بعض وہ عالم ہوتے ہیں جو فتویٰ پر انحصار کرتے ہیں، انتہائی سادہ تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ بعض جزئیات کے ماہر ہوتے ہیں لیکن کلیات سے قاصر رہتے ہیں۔ بعض شعلہ مقالی سے کام لیتے ہیں لیکن تلقین غزالی سے یک قلم عاری ہوتے ہیں۔ بعض دیوان و مکتب کے محض دربان ہوتے ہیں، بزم کے محرم اور راز داں نہیں ہوتے۔ بعض صوفی تسبیح کے دانے پلٹنے کے ماہر تو ہوتے ہیں، دل کی دنیا بدلنے پر قادر نہیں ہوتے۔ کچھ حلقۂ بیعت تو وسیع کر لیتے ہیں قرینۂ تربیت نہیں رکھتے۔ کچھ لمبی عباؤں میں ملبوس رہتے ہیں لیکن قلندرانہ اداؤں سے محروم ہوتے ہیں، کچھ ویرانوں کو جا کر بساتے لیکن آبادی میں انسانوں سے نباہ نہیں کر پاتے۔ مفتی عزیز الرحمٰن کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ سب پہلو رکھے تھے۔ وہ بیک وقت عالمانہ جلال، صوفیانہ جمال اور مفتیانہ کمال کے حامل و وارث تھے۔

آپ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے بڑے بھائی تھے اور طریقت میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور ۱۲۹۹ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند میں بلا تنخواہ تعلیم و تدریس کی خدمت شروع کی، اور ۱۳۱۰ھ میں جب دارالعلوم دیوبند میں "دارالافتاء" کا ایک مستقل شعبہ قائم ہوا تو آپ اس کے سب سے پہلے باقاعدہ مفتی مقرر ہوئے اور ۳۵ سال تک دارالعلوم میں فتویٰ نویسی کی اہم خدمات انجام دیتے رہے۔

اتنے بڑے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی شخصیت کا ادراک نہایت مشکل تھا۔ ان کے لباس اور طرزِ زندگی سے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم یا صاحب

کرامات صوفی اور صاحب نسبت شیخ ہیں۔ بازار سے سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ محلہ کی بیواؤں اور ضرورت مندوں اور اڑوسیوں پڑوسیوں کا بھی خود لاتے۔ پھر ہر ایک کا سودا مع حساب کے اس کے گھر پہنچاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ جب حضرت مفتی صاحبؒ کسی عورت کو اس کا سودا دینے کے لیے اس کے گھر جاتے تو وہ اپنے سودا کو دیکھ کر کہتی:

> ''مولوی صاحب! یہ تو آپ غلط لے آئے۔ میں نے یہ چیز اتی نہیں منگوائی تھی، یا میں نے یہ شی نہیں بلکہ یہ شی منگوائی تھی۔ چنانچہ یہ فرشتہ عفت بزرگ جن کے شاگردان رشید بہت بڑے مفید اور عالم تھے اور جن کے حلقۂ ارادت میں بڑے بڑے شب زندہ دار اور عابد مرتاض لوگ تھے، دوبارہ بازار جاتے اور اس عورت کی شکایت کا ازالہ فرمادیتے۔

انہی مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہ کے بارہ میں حکیم الاسلام حضرۃ مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

> ''غم آخرت کا قلب پر تسلط یہ تھا کہ ''جلالین'' شریف کے درس میں ایک دن خود ہی یہ واقعہ ارشاد فرمایا کہ ''میں ایک شب سونے کے لیے لیٹا تھا تو اچانک قلب میں یہ اشکال وارد ہوا کہ قرآن حکیم نے یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ
>
> ﴿لیس للانسان الا ما سعیٰ﴾
>
> ''انسان کے کام اسی کی سعی آئے گی۔''
>
> جس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آخرت میں کسی کے لیے غیر کی سعی کار آمد نہ ہوگی، اور حدیث نبوی میں ایصال ثواب کی ترغیب آئی ہے جس سے تخفیف عذاب، رفع عقاب اور ترقی درجات کی صورتیں ممکن بتلائی گئی ہیں۔ نیز شفاعت انبیاء و صلحاء اور شفاعت حفاظ و شہداء سے رفع عذاب اور نجات اور ترقی درجات کا وعدہ دیا گیا ہے جس سے

صاف نمایاں ہے کہ آخرت میں غیر کی سعی بھی کارآمد ہوگی۔ پس یہ آیت و روایت میں کھلا تعارض ہے۔ فرمایا کہ اس کا حل سوچتا رہا مگر ذہن میں نہ آیا۔ بالآخر سوچتے سوچتے یہ خوف قلب پر طاری ہوا کہ جب آیت و روایت میں یہ تعارض ذہن میں جاگزین ہے اور حل ذہن میں نہیں ہے تو گویا اس آیت پر میرا ایمان سست اور مضمحل ہے، اور اگر اس حالت میں موت آگئی تو میں قرآن کی ایک آیت میں خلجان اور ریب کی سی کیفیت لے کر جاؤں گا، اور ایسی حالت کے ساتھ حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گا کہ قرآن کے ایک حصہ پر میرا ایمان سست اور مضمحل ہوگا۔ تو میرا انجام کیا ہوگا؟ کیا اس خاتمہ کو حسن خاتمہ کہا جا سکے گا؟ اس ہیجان کے آتے ہی فکرِ آخرت اس شدت سے دامن گیر ہوا کہ میں اسی وقت چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھے گنگوہ کی راہ لی۔ مقصد یہ تھا کہ راتوں رات گنگوہ پہنچ کر حضرت گنگوہی قدس سرہ سے یہ اشکال حل کروں کہ میرا ایمان صحیح ہو اور حسن خاتمہ کی توقع بندھے۔

حالانکہ آپ پیدل چلنے کے عادی نہ تھے۔ اور وہ بھی گنگوہ جیسے لمبے سفر کے لیے جو دیوبند سے ۲۲ کوس کے فاصلہ پر ہے یعنی قریباً تیس میل، اور پھر وہ بھی رات کے وقت لیکن جب کہ خوف آخرت نفس کا حال بن چکا تھا تو اس میں وساوس کی کہاں گنجائش تھی۔ اس جذبہ سے عزم پیدا ہوا، اور اس عزم صادق سے اتنا لمبا سفر کرنے کے لیے اندھیری رات میں پیدل ہی چل کھڑے ہوئے۔ اور صبح صادق سے پہلے گنگوہ پہنچے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ تہجد کے لیے وضو فرما رہے تھے کہ حضرت مفتی اعظمؒ نے سلام کیا۔ فرمایا ”کون ہے؟“ عرض کیا کہ عزیز الرحمٰن، فرمایا: ”تم اس وقت کہاں؟“ عرض کیا کہ حضرت! ایک علمی اشکال لے کر حاضر ہوا

ہوں جس میں مبتلا ہوں، اور وہ یہ کہ قرآن تو نفع آخرت کو صرف اپنی ذاتی سعی میں منحصر بتلا رہا ہے جس سے غیر کی سعی کے نافع ہونے کی نفی نکل رہی ہے، اور حدیث غیر کی سعی کو نافع اور مؤثر بتلا رہی ہے جس میں نفع آخرت ذاتی سعی میں منحصر نہیں رہتا جو صراحۃً قرآن کا معارضہ ہے، تو ذہن میں اس تعارض کا حل نہیں آتا۔"

حضرتؒ نے وضو کرتے ہوئے برجستہ فرمایا کہ آیت میں سعی ایمانی مراد ہے جو آخرت میں غیر کے کارآمد نہیں ہوسکتی کہ ایمان تو کسی کا ہو اور نجات کسی کو ہو جائے، اور حدیث میں سعی عملی مراد ہے جو ایک دوسرے کے کام آسکتی ہے، اس لیے کوئی تعارض نہیں۔" فرمایا کہ ایک دم میری آنکھ ہی کھل گئی جیسے کوئی پردہ آنکھ کے سامنے سے اٹھ گیا ہو، اور علم کا ایک عظیم دروازہ کھل گیا۔

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد ۱ ص ۳۶)

* * *

﴿تین کلمات﴾

آج کل اگر دو دوست آپس میں ملتے ہیں تو سوائے مال و دولت اور کام کاج کے وہ ایک دوسرے سے اور کچھ نہیں پوچھتے۔ اس لیے کہ اس حرص و آز اور مادی دنیا میں اس کے سوا اور کچھ پوچھنے کو نہیں رہا۔ صحابہ کرامؓ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو تقویٰ اور طہارت کی تلقین کرتے۔ (اوصیکم بتقوی اللّٰہ) علامہ اسماعیل حقیؒ نے اپنی تفسیر روح البیان میں نقل کیا ہے کہ اہل خیر آپس میں تین کلمات کا تبادلہ کرتے۔ ایک دوسرے کو لکھتے وقت بھی اور ملتے وقت بھی۔ فرماتے ہیں:

﴿کان اهل الخیر یکتب بعضهم الی بعض بثلاث کلمات﴾

(۱) من عمل الا لاخرته کفاه اللّٰه من امر دنیاه

(۲) ومن اصلح سریرته اصلح اللّٰه علانیته،

(۳) ومن صلح فیما بینه وبین اللّٰه اصلح اللّٰه مابینه وبین الناس

اہل خیر یعنی صالحین امت آپس میں ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے

(۱) جو شخص امور آخرت میں معروف و مشغول ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کے دنیا کے کاموں کو درست فرما دیتے ہیں، اور اس کی ذمہ داری خود لے لیتے ہیں۔

(۲) اور یہ کہ جو شخص اپنی باطنی اور اندرونی حالت کو درست کر لیتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ اس کی ظاہری حالت کو خود بخود درست فرما دیتے ہیں۔

(۳) اور تیسرے یہ کہ جو شخص حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ اپنے معاملے کو درست کر لے، اللہ تعالیٰ اس کے اور تمام لوگوں کے درمیان جو معاملات ہوتے ہیں ان کو خود درست فرما دیتے ہیں۔

یہ باتیں اگر آج امت میں آ جائیں اور وہ اپنے معاملات کو اس طرح درست کرنا شروع کر دیں تو ان کی دنیا و آخرت اور فیما بین اللہ و بین الناس کے امور درست ہو جائیں، لیکن مادیت نے مستولی ہو کر ہمیں حق تعالیٰ شانہ اور نیکی کے امور سے غافل کر دیا ہے۔ کسی زمانہ میں لوگ ایک دوسرے کو دعا کے طور پر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تیرے ل اور تیری اولاد میں برکت عطا فرمائے آج کل یہ دعا بددعا کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مال کی زیادتی کی دعا تو دو لیکن اولاد کی زیادتی کی دعا ہرگز نہ دینا کیونکہ ”بچے دو ہی اچھے“ کا ماٹو ہمارے ذہنوں میں بٹھا دیا گیا ہے۔

◆

کھجوروں کی چپلیں پہننے والے لوگ

> ’’وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے۔ ان کے پیٹ فاقہ کشوں کی طرح دبے ہوئے تھے پیشانیوں پر سیاہ نشان پڑے رہتے تھے اور وہ کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے۔‘‘

یہ الفاظ رتبیل (زندبیل) اور اس کے عمائدین سلطنت نے یزید بن عبدالملک کے نمائندوں کو کہے جو خلافت دمشق کی طرف سے خراج طلب کرنے کے لیے آئے تھے۔

موجودہ افغانستان کو قدیم زمانہ میں ’’سجستان‘‘ کہا جاتا تھا اور اس کا دارالسلطنت کابل تھا۔ یہاں ایک ترک راجہ کی حکومت تھی جو مذہباً بدھست تھا اور اس کا خاندانی لقب رتبیل (زندبیل) تھا۔ یہ علاقہ سیدنا امیر معاویہؓ کے زمانہ میں فتح ہو کر اسلامی خلافت میں شامل ہوا اور یہاں کے بادشاہ نے دس لاکھ درہم سالانہ خراج پر معاہدہ کر کے اپنے لیے خلیفہ وقت سے امان حاصل کی۔ ہر سال خلافت دمشق سے کچھ کھجوروں کی چپلیں پہنے ہوئے لوگ آتے اور مقررہ خراج لے کر واپس چلے جاتے۔ رتبیل ایک مدت تک خراج دیتا رہا، لیکن اس کے بعد اس نے خراج دینا بند کر دیا۔ اس علاقہ میں بار بار فوجیں بھیجی گئیں لیکن راجہ نے اطاعت نہ کی۔

تواریخ میں لکھا ہے کہ یزید بن عبدالملک اموی کے زمانہ میں خلافت دمشق کی طرف سے خراج طلب کرنے کے لیے جو لوگ یہاں آئے۔ رتبیل نے ان کو مخاطب کر کے کہا:

> ’’کہاں ہیں وہ لوگ جو پہلے خراج لینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان کے پیٹ فاقہ کشوں کی طرح دبے ہوئے تھے، پیشانیوں پر سجدوں کے سیاہ نشان تھے (جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ زاہدان شب زندہ داران اور تقویٰ و اعلیٰ کردار کے مجسمہ تھے۔ وہ کھجوروں

کی چپلیں پہنا کرتے تھے (جو ان کی سادگی کی علامت تھیں)
خلافتِ دمشق کے وہ نمائندے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے جس کے نتیجے میں رتبیل نے خراج دینے سے یک قلم انکار کر دیا، اور تقریباً بیس پچیس سال وہ اسلامی حکومت سے کنارہ رہا۔

رتبیل کے خراج دینے کے اس انکار سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ کے وہ سیدھے سادے لوگ رتبیل کی نظر میں زیادہ طاقتور تھے بجائے ان شان و شوکت والے لوگوں کے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کی طاقت کا راز اس کے جسم پر دکھائی دینے والی ظاہری رونقیں اور زرق برق کا لباس نہیں ہے اور نہ ہی آج کل کے سوٹوں میں ہے۔ ہندوستان کے وزیروں کو دیکھ لیں نہایت سادہ لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اپنی سیاسی میٹنگیں زمین پر بیٹھ کر کرتے ہیں اور باون ماشے اسی تولہ کی کرتے ہیں جب کہ پاکستان کے وزیر اور عمائدین سلطنت سارا زور اپنی ظاہری اور جسمانی رونق پر دیتے ہیں، لیکن مخالف کے ہاں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

دراصل طاقتور وہ ہے جس کی ضروریات مختصر ہوں، جس کی آرزوئیں محدود ہوں اور جو لذت و جاہ کا طالب نہ ہو۔ جس کو تواضع میں تسکین ملتی ہو۔ ایسا شخص نفسیاتی پیچیدگیوں سے یک قلم خالی ہوتا ہے۔ مصلحتوں کا خیال کبھی اس کے قدموں کو آگے بڑھنے سے نہیں روکتا۔ اس کے برعکس جو لوگ مصنوعی چیزوں میں گھر کر مصنوعی زندگی گزار رہے ہیں وہ زندگی کی حقیقت سے محروم اور نا آشنا رہتے ہیں۔ غیر ضروری تکلفات اور لامحدود خواہشیں اس کے لیے زندگی میں آگے بڑھنے کا بندھن بن جاتی ہیں۔ وہ زندگی میں ذات کے لیے زیادہ اور مقصد کے لیے کم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

……

﴿دو قسم کی آوازیں﴾

علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں مسند بزاز کے حوالہ سے سیدنا انس بن مالکؓ اور سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''دو قسم کی آوازیں ایسی ہیں جن پر دنیا اور آخرت دونوں میں لعنت کی گئی ہے ایک تو خوشی کے موقع پر باجوں کی آواز، دوسرے مصیبت کے وقت آہ و بکا اور نوحہ کی آواز۔''

خوشی کے موقع پر ایک عام انسان دامن شکر کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے اور غم کے موقع پر جذبات سے مغلوب ہو کر دامن صبر کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ دونوں مواقع ہیں جب انسان کا امتحان ہوتا ہے۔ اگر ان دونوں موقعوں پر انسان اللہ کی رضا کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھے تو حق تعالیٰ اپنی رحمتیں اس پر نچھاور کرتا ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ کے صاحبزادے جب سیدنا ابراہیمؓ کا انتقال ہوا تو آپ نے اس موقع پر فرمایا:

> ﴿تدمع العين ويحزن القلب، وما نقول الا ما يرضى ربنا﴾
>
> ''(اگرچہ) آنکھیں روتی ہیں اور دل غم و حزن سے بھرا ہوا ہے لیکن (نہ تو ہم آہ و بکا کریں گے اور نہ ہی شیون و نوحہ بلکہ) زبان سے وہی کچھ کہیں گے جس سے ہمارا پروردگار راضی ہو۔''

معلوم ہوا کہ خوشی و مسرت اور مصیبت و تکلیف دونوں عارضی کیفیات ہیں اور ان دونوں مواقع پر انسان کو شکر و صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں حافظ ابن قیم قدس سرہ نے بڑی نفیس بات کہی ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ:

> ''قلب انسانی پر بالعموم دو حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ ایک غم کی حالت اور دوسری خوشی و مسرت کی حالت۔ غم کی حالت عام طور پر

> اس وقت طاری ہوتی ہے جب انسان کی کوئی متاع عزیز اور کوئی نہایت قیمتی چیز گم ہو جائے۔ اس کے برعکس خوشی کی حالت اس وقت طاری ہوتی ہے جب انسان کو کوئی اچھی اور قیمتی و نایاب شی مل جائے۔ ان دونوں حالتوں کی مناسبت سے شریعت کی طرف سے دو عبادتیں رکھی گئی ہیں۔ غم کی حالت میں صبر کرنا اور مشیت خداوندی پر راضی رہنا، اور خوشی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور انعام پر شکر بجا لانا عبادت ہے۔ اور صبر و شکر دراصل بڑی عظیم الشان عبادتیں ہیں جن کے فضائل و فوائد قرآن و سنت میں بکثرت ہیں۔
>
> ''شیطان نے کمال عیاری سے کام لے کر ان دونوں موقعوں پر عبادت الٰہی سے ہٹانے اور جزائے الٰہی سے محروم کرنے کے لیے انسان کو دو ایسے کاموں پر لگا دیا جو معصیت اور بہت بڑے گناہ ہیں، یعنی غم کے موقع پر نوحہ و بین کرنے اور جزع فزع اور گریہ و بکا میں لگا دیا اور خوشی کے موقع پر گانے بجانے اور رقص و سرور میں منہمک اور مصروف کر دیا۔'' انا للہ و انا الیہ راجعون۔
>
> (مدارج السالکین لابن قیم جلد۲ ص۲۱۰)

حافظ ابن قیم نے کیا نفیس اور پتہ کی بات کہی ہے کہ خوشی کے موقع پر شکر کرنا عبادت اور غم اور مصیبت کے موقع پر صبر کرنا عبادت ہے۔ شکر کیا ہے؟ نعمت کو منعم حقیقی کی طرف سے سمجھنا اور اس سمجھنے سے دو باتیں ضرور پیدا ہوتی ہیں: ایک منعم سے خوش ہونا اور دوسرے اس کی خدمت گزاری اور امتثال اوامر میں سرگرمی دکھانا۔ جو حالت طبیعت کے موافق ہو خواہ وہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری اس حالت کو دل سے اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھنا اور اس پر خوش ہونا اور اپنی لیاقت سے اس کو زیادہ سمجھنا اور زبان سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا اور اس نعمت کو گناہوں میں استعمال نہ کرنا، شکر ہے۔ (انفاس عیسیٰ: ص۲۱۸)

حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا کہ ”زبانی الحمد للہ کہنا محض ورد یعنی عنوان میں ہے۔ یہ چھلکا ہے جس میں گری (مغز) نہیں یعنی الفاظ شکر ہیں معنی شکر نہیں، اور جب معنی شکر نہیں تو شکر نہیں جیسے کوئی بادام خرید لے اور اس میں سے مغز نہ نکلے اور نرا چھلکا ہو، تو بادام نہ کہیں گے۔ اسی طرح ہر عمل کا ایک مغز اور روح ہے اور ایک پوست اور صورت ہے۔ پس شکر کی روح یہ ہے کہ منعم اور نعمت کی دل سے قدر کرو۔ ابتدائی درجہ تو مرتبۂ عقلی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کو منعم حقیقی جانے اور عقلاً اس کی قدر پہچانے۔ اور انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ اس کا اثر طبیعت اور جوارح اور حرکات و سکنات میں نمایاں ہو۔ یعنی تمام اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق اور معاشرت وغیرہ شریعت کے مطابق ہوں۔“ شکر کا محل نعمت ہے اور نعمت کی حقیقت یہ ہے ”النعمۃ حالۃ ملائمۃ النفس“ (نعمت وہ حالت ہے جو نفس کے لیے خوش گوار ہو) حالات جو اس کی مرضی کے موافق ہیں شکر کا موقع ہیں، یہ کہ اس نعمت کو حق تعالیٰ کی طرف سے جانے یعنی اترائے نہیں۔ اپنا کمال نہ سمجھے۔ غافل اور ناسی (بھولنے والا) نہ ہو، اور نعمت میں مشغول ہو کر رب نعمت کو نہ بھولے بلکہ یہ نعمت اس کے نیے زیادہ موجب تذکر ہو جائے۔ یہ نعمت عام ہے خواہ کھانا ہو یا پانی ہو یا کوئی کپڑا ہو یا یہ کہ کوئی ناگوار حالت نہ ہو۔“ (وعظ الشکر ص ۳۔ ۱۱)

اور صبر کیا ہے؟ انسان کے اندر دو قوتیں ہیں۔ ایک دین پر ابھارتی ہے اور دوسری ہوائے نفسانی پر۔ سو محرک دینی کو محرک ہوائی پر غالب کر دینا صبر ہے۔

اور اس کی حقیقت یہ ہے ”حبس النفس علی ما تکرہ“ یعنی ناگوار بات پر نفس کو جمانا اور مستقل رکھنا، اور وہ ناگوار امر خواہ کچھ ہو۔“

صبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) صبر علی العمل (۲) صبر فی العمل (۳) صبر عن العمل

(۱) صبر علی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اس پر جم جانا اور قائم رہنا مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلاناغہ اس کو ادا کرتے رہنا۔

(۲) صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا۔ طاعات بجالانے کے وقت ان کے حقوق و آداب کو سکون اور اطمینان سے ادا کرنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجالانا مثلاً نماز پڑھتے کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ تم اتنی دیر تک سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔ پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے۔ اتنی دیر تجھ کو نماز یا ذکر الٰہی کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔

(۳) تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو مانہی اللہ عنہ (جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ان) سے رکنا اور شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رکنا۔ اس کے علاوہ ہر ممنوع امر سے رکنے کو صبر عن کہا جائے گا۔

صبر اور شکر یہ دونوں عبادتیں ہیں اور ان دونوں عبادتوں سے مقصود رضائے الٰہی ہے۔ حدیث میں ہے کہ

﴿من سعادة ابن آدم رضاه بما قضى الله﴾ (ترمذی، مسند احمد)

"یہ بات آدمی کی سعادت میں سے ہے اس بات پر راضی رہنا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہو۔"

قضائے الٰہی پر اعتراض نہ کرنا زبان سے نہ دل سے یہ رضا ہے۔ بعض اوقات اس کا یہاں تک غلبہ رہتا ہے کہ تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی۔ پس اگر الم کا احساس ہی نہ ہو تو رضائے طبعی ہے، اور اگر الم کا احساس باقی رہے تو رضائے عقلی ہے۔ اول حال ہے جس کا بندہ مکلف نہیں اور ثانی مقام ہے جس کا بندہ مکلف ہے۔

قضا پر راضی رہنے کی وجہ یہ ہے کہ تکلیف کی صورتوں میں تکلیف تو محسوس ہو لیکن چونکہ عقل نے اس کے بہتر انجام یعنی ملنے والے ثواب پر مطلع کر دیا ہے، اس لیے طبیعت اس تکلیف کو بلا تکلف گوارا کرتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب کسی مریض کو پینے کے لیے تلخ اور کڑوی دوا بتائے یا اپریشن (Operation) کرانے کی

ہدایت کرے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس تلخ دوا کا پینا یا اپریشن کرانا تکلیف دہ باتیں ہیں لیکن چونکہ اس کے ساتھ ہی عمدہ نتیجہ یعنی صحت وتندرستی سے مریض کو آگاہی حاصل ہے، لہٰذا وہ ان تکلیف دہ باتوں کے بتانے والے طبیب سے راضی بلکہ ان کا احسان مند اور ممنون رہتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص سچے دل سے اس کا یقین کیے ہوئے ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف پر حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اجر مرحمت ہوگا، اور مصیبت وصدمہ پر اس قدر ثواب عطا ہوگا جس کے مقابلہ میں اس کی عارضی تکلیف کچھ حقیقت نہیں ہے تو وہ ضرور مسرور وشاداں ہوگا۔

شکر وصبر اور رضا کے بارہ میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ دراصل تفصیل ہے حافظ ابن قیم قدس سرہ کی اس عبارت کی جو گذشتہ سطور میں مدارج السالکین کے حوالہ سے نقل کی ہے۔

◆

عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

مولانا مناظر احسن گیلانی قدس سرہ بھی ایک عجیب شخصیت کے حامل تھے۔ ہر موضوع پر بڑی بڑی کتابیں لکھیں اور ان میں ایسے عبرت آموز واقعات لکھے جن کو پڑھ کر ایک دفعہ تو انسان کے پورے جسم میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے۔ انہیں کتابوں میں آپ کی ایک کتاب ''مقالات احسانی'' ہے جس میں ''احسان'' کی کیفیات کے تحت کچھ عبرت آموز واقعات لکھ کر ایک با اقتدار شخص کو اپنے فانی اور بے بس و بے کس ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ انسان اس دنیائے فانی میں اپنے اقتدار کے نشہ میں یوں سمجھتا ہے کہ مجھے موت آنی نہیں اور میرا یہ اقتدار ہمیشہ رہے گا۔ اور بعض دفعہ قارون کی طرح یہ بھی کہہ اٹھتا ہے کہ یہ سب مال و دولت اور غلبہ و اقتدار میری اپنی محنت و کوشش کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ (انما اوتیتہ علی علم عندی) ایسی باتیں کہتے وقت وہ اپنی موت کو یک قلم بھول جاتا ہے۔ موت نے تو بڑے بڑے جابروں اور ظالموں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ لہٰذا موت کو ہر وقت یاد رکھنے کا حکم دیا گیا (اذکروا ذکر ھاذم اللذات، الموت) چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! سب سے عقل مند شخص کون ہے؟'' فرمایا: ''جو موت کو اکثر یاد کرے اور اس کے لیے پوری تیاری کرے۔'' (ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۵۹، حلیۃ الاولیاء جلد ۱ ص ۳۱۳)

امام ترمذیؒ نے اس بارہ میں ایک اور حدیث نقل کی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد پیش آنے والے واقعات کے لیے تیاری کرے، اور عاجز اور کم عقل وہ ہے جو اپنے نفس کا اتباع کرے اور اللہ پر بڑی بڑی امیدیں باندھتا پھرے۔

(ترمذی رقم ۲۴۵۹، ابن ماجہ رقم ۴۲۶۰، مسند احمد جلد ۴ ص ۱۲۴)

امیدیں وہی شخص باندھتا ہے جس کی کتاب زندگی عمل سے خالی ہو اور پوری زندگی فسق و فجور میں گذری ہو۔ انہی لوگوں کے بارہ میں امام حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے:

> ”وہ لوگ جنہوں نے مغفرت کی خالی خولی امیدیں باندھی ہوں گی اور عمل میں پسپا ہوں گے وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے دامن میں کوئی نیکی نہیں ہوگی (وما لھم حسنۃ)

اور سعید بن جبیرؒ فرمایا کرتے تھے کہ

> ”گناہوں اور معاصی میں غلطاں ہونا اور حق تعالیٰ سے مغفرت کی امیدیں باندھنا دراصل اللہ تعالیٰ کے بارہ میں دھوکے میں مبتلا ہونے کے مترادف ہے۔“

اسی چند روزہ زندگی پر مغرور عباسی خلفاء میں سے ایک خلیفہ واثق باللہ تھا۔ لیلائے اقتدار نے اس کو موت سے فراموش کر دیا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اقتدار کا نشہ دائمی ہے، لیکن مولانا مناظر احسن گیلانی قدس سرہ نے تاریخ کے اوراق سے اس واثق باللہ عباسی کی موت کا جو واقعہ تحریر کیا ہے وہ نہ صرف سبق آموز ہے بلکہ عبرت انگیز بھی۔ مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

> ”الذہبی نے مختصر دول الاسلام میں نقل کیا ہے کہ الواثق باللہ کا جب خادم خاص جو ”الواثقی“ کے نام سے مشہور تھا، اس کا بیان ہے کہ واثق جب بیمار ہوا تو اس کی تیمارداری مجھ ہی سے متعلق تھی۔ حالت واثق کی جب خراب ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس پر غشی طاری ہو گئی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ختم ہو گیا ہے۔ پاس میں جو لوگ تھے، ان کو بلایا اور ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا کہ واثق کے قریب جا کر واقعی دیکھے کہ اس کی روح پرواز کر چکی یا کچھ زندگی کی رمق باقی ہے، لیکن کسی کو اس کے قریب جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر میں ہی دل کو مضبوط کر کے آگے بڑھا۔ میں نے آہستہ سے اس کی ناک پر سانس کا پتہ چلانے کے لیے انگلی رکھی کہ اچانک

واثق نے آنکھیں کھول دیں۔ الواثقی کہتا ہے کہ نہ پوچھو کہ اس واقعہ کا مجھ پر کیا اثر مرتب ہوا۔ اس کے الفاظ ہیں "فکدت ان اموت" (اتنا گھبرایا کہ قریب تھا کہ میں خود مر جاتا) گھبراہٹ اس بات کی تھی کہ موت کے احتساب کو واثق کی زندگی ہی میں گویا ممکن قرار دے دیا (کیونکہ بادشاہوں اور امراء کے لیے سب سے بری اور قابل نفرت شی تو موت ہے جو دنیا کے عیش و عشرت اور تمام لذتوں سے ان کے تعلق اور رشتہ کو منقطع کر دیتی ہے۔) باز پرس کے خوف نے اس پر یہ ہیبت طاری کی، لیکن خیر گذری کہ واثق کی آنکھیں آخری دفعہ کھلی تھیں اور پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

الواثقی کہتا ہے کہ ڈر کے مارے میں گر پڑا تھا، تلوار تک ٹوٹ گئی اور میرے بدن میں کچھ گھس بھی گئی۔ بہرحال الواثق واقعی اس کے بعد مر گیا۔ تب واثقی نے یہ یقین کر لینے کے بعد کہ درحقیقت اب خلیفہ کی روح پرواز کر چکی ہے، نعش پر چادر ڈال دی۔ اس عرصہ میں واثقی کو محسوس ہوا کہ آنکھوں کے سامنے کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ وہ پھر گھبرایا یا چادر اٹھائی تو دیکھتا ہے کہ ایک چوہا واثق کی آنکھیں نکالے بھاگے جاتا ہے۔ بے ساختہ زبان پر واثقی کے جاری ہو گیا: لا الٰہ الا اللہ یہی آنکھ تھی جس کی معمولی حرکت سے کچھ دیر پہلے میں مرنے کے قریب ہو گیا تھا، گر پڑا، تلوار ٹوٹی اور چند لمحوں کے بعد اسی آنکھ کو ایک چوہا نکال کر لے بھاگا۔

(مختصر دول الاسلام ذہبی: جلد ا ص ۱۰۹، مقالات احسانی: ص ۱۳۱، از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

اسی مقالات احسانی میں مولانا گیلانیؒ نے ایک اور ظالم صاحب اقتدار کا واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ حجاج بن یوسف ثقفی تھا جس کے بارہ میں بہت سی ظلم کی داستانیں کتابوں میں مرقوم ہیں۔ اس نے کچھ نیکی کے کام بھی کیے۔ قرآن حکیم پر اعراب لگوائے تا کہ غیر

عرب لوگوں کو قرآن پڑھنے میں سہولت اور آسانی ہو۔ ہندوستان کی فتح کے لیے اس نے اپنے سترہ سالہ بھتیجے اور داماد کو ہندوستان بھیجا جس نے نہ صرف راجہ داہر سے اس کے ظلم و ستم کا انتقام لیا بلکہ ملتان تک کے علاقہ کو بھی فتح کیا اور سرزمین پاک و ہند میں اسلام کی فتح کا جھنڈا گاڑا۔ دنیا میں کوئی شخص نشۂ اقتدار میں جتنا بھی اکڑ لے اور لوگوں پر ظلم وستم جس قدر بھی روا رکھ لے، انجام اس کا برا ہی ہوگا۔ حجاج سنہ ۴۵ھ میں یا اس کے کچھ بعد پیدا ہوا۔ یہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کی جانب سے عراق اور خراسان کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک لاکھ بیس ہزار لوگوں کو ظلماً قتل کیا۔ لیکن ہمارے نزدیک تاریخ کی ہر روایت قابل یقین نہیں ہے، اس لیے اس روایت میں بھی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ حجاج کے انجام کے بارہ میں فرماتے ہیں:

> ”کتابوں میں لکھا ہے کہ سیدنا سعید بن جبیر تابعیؒ کو انتہائی بے دردی کے ساتھ حجاج نے جب شہید کیا اور اس کے بعد ایک خاص قسم کے جنون میں مبتلا ہو گیا۔ سوتا تھا کہ خواب میں بھی سعید ہی نظر آتے تھے اور کہتے کہ کس جرم میں تو نے مجھے قتل کیا۔ اور آنکھ کھلتی تو اس وقت بھی حجاج کا بیان تھا کہ سعید کو سامنے کھڑا پاتا۔ اسی زمانے میں حجاج کے پیٹ میں سرطانی پھوڑا نکلا جس کی سمیت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس اندرونی گھاؤ کی وجہ سے ایک اور بیماری اس پر مسلط ہوئی جسے زمہریرہ کہتے تھے یعنی ایسی سخت سردی اس کو محسوس ہوتی تھی کہ انگیٹھی کو بدن کے قریب کرتے کرتے یہاں تک متصل کر دی جاتی کہ کھال جلنے لگتی، لیکن پھر بھی اس کی تشفی نہ ہوتی تھی۔ اطباء نے جب تجویز کیا کہ پیٹ میں پھوڑا ہے تو جانچنے کے لیے روٹی کے ٹکڑے کو تاگے میں باندھ کر حجاج کو نگلوایا۔ جب اندر چلا گیا تب جھٹکا دے کر ٹکڑا باہر نکالا تو وہ صرف کیڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ آخر مرض نا قابل علاج قرار پایا۔ خواجہ حسن بصریؒ کو اس نے بلایا تو رونے لگا اور گڑگڑا کر التجا کرنے

لگا کہ میرے لیے دعا کیجیے۔ خواجہ نے کہا کہ حجاج! دیکھ اللہ والوں سے ہمیشہ میں نے تجھ کو نصیحت کی کہ دور رہنا۔ سعید کے ساتھ تو نے جو کچھ کیا اسی کا خمیازہ ہے۔ حجاج نے کہا کہ اب صحت کی دعا نہ کیجیے تا کہ میری مشکل آسان ہو۔ حجاج مر گیا۔ خواب میں مرنے کے بعد کسی نے دیکھا۔ کہنے لگا کہ سعید کے بدلہ میں مجھے مسلسل قتل کیا جا رہا ہے۔ قتل ہوتا ہوں، پھر جلایا جاتا ہوں پھر قتل ہوتا ہوں۔"

(دیکھو: ابن عساکر اور الیافعی وغیرہ، مقالاتِ احسانی: ص ۲۳۲)

◆

انصاف کی فتح

"مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا تو برا حال ہو گیا ہے۔"

یہ الفاظ خلیفۂ راشد سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک خادم ابوامیہ کے تھے جو اس نے اپنی حالت بیان کرتے ہوئے ایک روز ان کی اہلیہ خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کی بیٹی فاطمہ سے کہے تھے۔ جس کے بارہ میں کسی شاعر نے کہا تھا

بنت الخليفة، والخليفة جدها
اخت الخلائف، والخليفة زوجها

یعنی وہ ایک خلیفہ کی بیٹی تھی اور دوسرے خلیفہ کی پوتی، وہ خلفاء کی بہن تھی اور ایک خلیفہ کی زوجہ محترمہ۔

خود خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے اور لباس اور خورد و نوش میں ان کا معیار سب لوگوں سے جداگانہ تھا۔ نہایت قیمتی لباس پہنتے تھے اور خورد و نوش میں بھی شاید ہی کوئی ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ ایک بار خلیفہ عبدالملک بن مروانؒ کے ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ساتھیوں کے سامان پیچھے رہ گئے، اس وجہ سے شاہی سواری پیچھے ٹھہر گئی۔ جن کے سامان روانہ ہو چکے تھے وہ آ رہے تھے، لیکن جن کے سامان روانہ نہیں ہوتے تھے ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات پر عمر بن عبدالعزیزؒ کو آخرت یاد آ گئی اور آپ فرط تاثر سے رو پڑے۔ خلیفہ عبدالملک نے رونے کا سبب پوچھا؟ فرمایا: "کل قیامت کے روز بھی ایسا ہو گا، جس نے یہاں سے کچھ بھیجا ہو گا اسے تو وہاں ملے گا، اور جس نے نہ بھیجا ہو گا وہ محروم رہے گا۔" بس اسی فکر نے ان کی دنیا تبدیل کر دی اور زندگی کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا۔ پھر جونہی خلافت کا بارِ گراں ان کے سر پر پڑا تو ان کی زندگی ہی بالکل بدل گئی۔ وہ عمرؒ جن کی گورنری پر تقرر کے وقت تیس اونٹ ان کا ذاتی سامان اٹھا کر لائے تھے۔ جن کی خوش لباسی اور نفاست طبعی کا یہ حال تھا کہ جس لباس پر ایک مرتبہ کسی کی نظر پڑ جاتی تھی، پھر اسے زیب تن نہ فرماتے تھے۔ خوشبویات کے شوق

میں داڑھی پر عنبر کا سفوف چھڑکتے تھے، لیکن مسند خلافت پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی سیدنا ابو ذر غفاریؓ اور سیدنا ابو ہریرہؓ اور دیگر درویش صحابہ کرامؓ کا قالب اختیار کر لیا۔ دل کی دنیا بدلنے کے ساتھ ظاہری دنیا بھی بدل گئی۔ اب نہ وہ زرق برق کا لباس تھا اور نہ وہ مشک و عنبر کی خوشبویات تھیں۔ بار خلافت نے آخری ضرب لگائی تو یکایک آنکھیں کھل گئیں اور دوسرے ہی عالم کی ہوش ربائیاں تھیں۔ نہ وہ آسمان تھا، نہ وہ زمین تھی، نہ وہ آفاق تھا نہ انفس۔ انقلاب قوموں میں ہو یا افراد میں پہلے سطح پر نہیں بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے، اور دل و دماغ میں انقلاب آنے کے بعد پھر انسان یوں سمجھتا ہے کہ زندگی کا مزہ انہی کو ملتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے گھونٹ بھی لیتے رہتے ہیں، کیونکہ یہاں پانے کا مزہ انہی کو ملتا ہے جو کھونا جانتے ہیں، جنہوں نے کچھ کھویا نہیں انہیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا اور اب حالت یہ ہے کہ ان کا خادم ان کی اہلیہ سے یہ شکایت کر رہا ہے کہ مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا برا حال ہو گیا ہے۔

خادم کی یہ شکایت سن کر خلیفہ کی اہلیہ نے جواب دیا کہ تمہارے خلیفہ کا بھی روز کا کھانا یہی ہے۔ آپ سے پہلے خلیفہ کی حفاظت کے لیے ایک سو سپاہی مقرر تھے، جب آپ خلیفہ ہوتے تو آپ نے سب کو دوسرے سرکاری کاموں میں لگا دیا اور فرمایا:

"میری حفاظت کے لیے قضا و قدر ہی کافی ہیں۔"

یہ اس شخص کا حال تھا جس کی سلطنت کے حدود سندھ سے لے کر فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

آپ کی خلافت کے زمانہ میں سمرقند کے باشندوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے ایک فوجی کمانڈر قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارہ میں یہ شکایت کی کہ اسلامی قاعدہ کے مطابق انہوں نے ہم کو پیشگی تنبیہ نہیں کی اور ہمارے شہر میں اچانک اپنی فوجیں داخل کر دیں، لہٰذا ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔

سمرقند کی فتح سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے ہوئی تھی، اور اب اس پر سات سال گزر چکے تھے، مگر آپ نے انصاف کے تقاضے کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے عراق کے حاکم کو لکھا کہ سمرقند کے لوگوں کے مقدمہ کی سماعت کے لیے

ایک خصوصی قاضی مقرر کریں۔ عراق کے حاکم نے فوری طور پر حکم کی تعمیل کی اور جمیع بن حاضر الباہلی کو اس مقدمہ کی سماعت کے لیے قاضی مقرر کیا۔ ان کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش ہوا۔ دونوں فریقوں نے آزادانہ اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ آخر میں قاضی نے سمرقند والوں کی شکایت کو درست تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ

> ”مسلمانوں کی فوج سمرقند کو چھوڑ کر باہر آ جائے اور اہل سمرقند کو ان کا قلعہ اور تمام دوسری چیزیں واپس کر دی جائیں۔ اس کے بعد اسلامی قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کا فوجی جرنیل ان کے سامنے ضروری شرطیں پیش کرے۔ اگر وہ تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو پھر ان سے جنگ کی جائے۔“

اسلامی فوج اس وقت فاتحانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے چین جیسے ملک کے بادشاہ کو بھی اپنا باجگذار بننے پر مجبور کر دیا تھا، لیکن جب قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا تو اسلامی فوج کے جرنیل نے کسی بحث کے بغیر ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پوری فوج سمرقند چھوڑ کر نکل جائے۔ تاہم اس پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی کیونکہ جب سمرقند کے لوگوں نے دیکھا کہ مسلمان اس قدر بااصول اور انصاف پسند ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے قبل انہوں نے کبھی ایسا بے لاگ اور شفاف انصاف دیکھا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مسلم فوج کا آنا ان کے لیے رحمتِ خداوندی ہے، چنانچہ انہوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے مسلمان حکومت کو قبول کر لیا۔ وہ کہہ اٹھے:

مرحبا، سمعنا واطعنا

آج ہے کوئی ایسی عدالت جو کسی فوجی جرنیل کے خلاف اس قسم کا فیصلہ دے۔ جب سے عدلیہ میں انصاف کی کمی اور گرانی ہوئی ہے، انتظامیہ نے اپنے حرص و آز کے دانت تیز کر کے لوگوں کے خون کو نچوڑنا شروع کر دیا ہے۔ افسوس کہ آج کوئی ایسا قاضی نہیں جو عوام پر ظلم کرنے والے ہاتھ کو پکڑے۔

◆

نرم بستر اور اس کی سزا

سلطان حمید الدین ابو حاکم قریشی کیچ اور مکران کے علاقہ پر حکمران تھا۔ ان سے قبل اس کے والد سلطان بہاء الدین ان علاقوں پر حکومت کرتے تھے اور ۲۱ سال تک انہوں نے نہایت شان و شوکت سے حکومت کی، لیکن آخر "کل من علیہا فان" کے تحت ایک روز انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے بعد ان کا بیٹا سلطان حمید الدین مسند حکومت پر بیٹھا، اور عام بادشاہوں کی طرح عیش و عشرت اور شان و شوکت کے ساتھ فرائض حکومت انجام دینے لگا۔

حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ ان کی زندگی میں ایک معمولی سا واقعہ پیش آیا جس نے سلطان کی زندگی کا رخ بدل دیا اور اب ان کی زندگی آخرت رخی زندگی (Akhrat Oriented Life) ہو گئی اور وہ "سلطان حمید الدین" سے "شیخ حمید الدین" ہو گئے

اعجاز الحق قدوسی نے تذکرۂ صوفیائے پنجاب میں "ذکر کرام" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شیخ حمید الدین اپنی حکومت کے زمانہ میں دوپہر کو اپنے ایک باغ میں قیلولہ کیا کرتے تھے۔ اس باغ میں ان کا ایک محل تھا۔ اس محل کی نگرانی ان کی ایک خادمہ نونیت نامی کے سپرد تھی۔ اس خادمہ کی ذمہ داری ایک تو محل کی نگرانی تھی اور دوسری ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ہر روز وقت پر بستر بچھا دے تاکہ شیخ حمید الدین دوپہر کے وقت اس پر آرام کرسکیں۔

کہتے ہیں کہ ایک روز خادمہ نے حسب معمول بستر بچھا دیا۔ بستر نہایت نرم اور گداز تھا۔ خادمہ کو بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ دیر اس پر لیٹ گئی۔ ایسے بستر تو صرف سلطانوں اور بادشاہوں کے لیے ہوتے ہیں۔ خادموں کی کیا مجال کہ وہ اس پر لیٹنے کی جرأت کر

سکیں، لیکن ایک روز اس خادمہ کی طبیعت میں معلوم نہیں کیا آیا کہ وہ اس پر لیٹ گئی اور لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ شاید اس نے ایسا نازک اور گداز بستر پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ شیخ حمید الدین جب اپنے معمول کے مطابق آرام کرنے کے لیے محل میں پہنچے تو دیکھا کہ خادمہ نوزیت بستر پر پڑی مزے سے سو رہی ہے۔ سلطان کے بستر پر خادمہ کو سوتے ہوئے دیکھ کر سلطان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور غصہ سے لال پیلا ہو گیا۔ فوراً جلاد کو بلایا اور حکم دیا کہ اس گستاخی پر خادمہ کو سو کوڑے لگائے جائیں۔

جلاد نے حکم شاہی کی فوراً تعمیل کی اور اس غریب خادمہ کو بستر شاہی پر سونے کی پاداش میں کوڑے مارے جانے لگے۔ شیخ حمید الدین کو یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ خادمہ بجائے رونے کے ہنس رہی ہے۔ سلطان نے جلاد سے کہا کہ ٹھہرو۔ جلاد کوڑے مارنے سے رک گیا۔ شیخ نے خادمہ کو بلایا اور اس سے رونے اور واویلا کرنے کے بجائے ہر کوڑے پر ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ خادمہ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا:

> ”میں ہنس اس وجہ سے رہی ہوں کہ مجھے خیال آیا کہ جب اس نرم اور گداز بستر پر چند لمحوں کی بے اختیارانہ نیند پر یہ سزا ہے تو اس بادشاہ کا انجام کیا ہوگا اور اس کو کس قدر سزا ملے گی جو کئی سالوں سے روزانہ اس بستر پر آرام کرتا ہے۔“

اس خادمہ نے بات تو بالکل درست کہی۔ لوگوں کے خون نچوڑ کر بننے والے نرم و گداز بستر قیامت کے لیے ان پر لیٹنے والوں کے لیے عقوبت الٰہی کا سبب بنیں گے۔ یہ بات خادمہ کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلی اور اس نے شیخ حمید الدین کے دل پر وہ اثر کیا کہ شیخ کی زندگی کا دھارا بدل گیا۔ وہ دنیا اور اس کی لذتوں سے بے رغبت ہو گئے۔ یہاں تک کہ تخت شاہی چھوڑ کر درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ شیخ حمید الدین لاہور آ گئے۔ یہاں حضرت شیخ احمد توختہ (جو ان کے نانا بھی تھے) کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر طریقہ شطاریہ میں بیعت کی اور پھر مختلف مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد ان سے خرقۂ

خلافت حاصل کیا۔ شیخ نے ۱۶۷ کی عمر پائی۔ ۵۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۳۷ھ میں اس فانی دنیا سے عالم باقی کو رحلت فرمائی۔ آخر عمر میں وہ اچ اور سکھر کے درمیانی علاقہ میں تبلیغ و ارشاد کا کام کرتے رہے۔ اور بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے۔

آدمی کی فطرت زندہ ہو تو ایک ہی جملہ اس کی زندگی بدلنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور اگر فطرت مردہ ہو جائے تو ہزاروں تقریریں اور لیکچر بھی اس کی زندگی کے دھارہ کو بدلنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

◆

اور بارش شروع ہو گئی

چوتھی صدی ہجری تھی اور اندلس (موجودہ اسپین) میں امیر عبدالرحمٰن الناصر کی حکومت تھی۔ اور اس کا دارالخلافہ قرطبہ تھا۔ امیر عبدالرحمٰن الداخل ۱۳۲ھ مطابق ۷۴۹ء میں عباسیوں سے اپنی جان بچا کر اندلس چلا آیا وہ اندلس کی اموی سلطنت کا بانی تھا۔

یہ مسجد عبدالرحمٰن انداخل سے اگرچہ پہلے بنی ہوئی تھی لیکن اتنی بڑی نہ تھی۔ مسجد کے ساتھ ایک کلیسا تھا، اور مسجد کی توسیع کے لیے اس کلیسا پر قبضہ کرنا عیسائیوں کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کے خلاف تھا اور عیسائیوں کا اس کو از خود دینا ممکن نہ تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل نے کلیسا کی اس زمین کی گراں قدر قیمت دینے کی بھی پیش کش کی لیکن عیسائی کسی صورت کلیسا کی زمین دینے پر راضی نہ ہوئے اور انہیں اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ مسلمان معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔ آخر کار عیسائیوں نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ اگر اس کلیسا کے عوض انہیں قرطبہ اور اس کے حوالی کے تمام مسمار شدہ کلیساؤں کو بنانے کی اجازت دے دی جائے تو وہ اس کلیسا سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے ان کی اس شرط کو قبول کر لیا، اور کلیساؤں کو دوبارہ تعمیر کی اجازت کے ساتھ ساتھ اس زمین کی قیمت ایک لاکھ دینار بھی عیسائیوں کے حوالہ کیے۔

یہ اراضی ۱۶۸ھ میں عبدالرحمٰن الداخل کو حاصل ہوئی اور اس نے اسی وقت اس کی تعمیر شروع کر دی اور دو سال کے قلیل عرصہ میں نہایت خوبصورت اور عالی شان مسجد اس حد تک تیار ہو گئی کہ اس میں نماز ادا کی جا سکے۔ اس مسجد کی تعمیر پر اس کے ہاتھوں سے اسی ہزار دینار صرف ہوئے تھے، جو کہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ جامع قرطبہ عبدالرحمٰن کی زندگی کی ایک سب سے بڑی آرزو تھی۔ اگرچہ اس کی زندگی میں پوری طرح مکمل نہ ہو سکی تاہم اس نے اس میں نماز جمعہ ادا کی اور خود اس کے منبر پر سب سے پہلا خطبہ دیا۔

جب عبدالرحمٰن کی پُرشوق نگاہیں اس خوبصورت مسجد کے میناروں پر جاتیں تو

اس کی زبان سے بے اختیار نکلا: ''یہ مسجد ایک خلیفہ چاہتی ہے۔'' یہی عبدالرحمن کا آخری مطمح نظر تھا۔ اگرچہ اس نے خود اپنے لیے صرف ''امیر'' سے زیادہ اور کوئی لقب اختیار نہیں کیا تھا، لیکن اس کے جانشینوں میں اس کے ہم نام عبدالرحمن الناصر نے اس کے دل کی آرزو بھی اپنی خلافت کا اعلان کر کے پوری کر دی، اور اس مسجد کے منبر پر سے ''امیر المومنین'' کی سلطنت کی بقا اور ترقی کی دعائیں سنی گئیں، اور اندلس میں اموی سلطنت وخلافت صدیوں تک بڑی شان سے قائم رہی۔

اس مسجد قرطبہ میں قاضی منذر بن سعید خطابت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ نہ صرف بہت اچھے خطیب تھے بلکہ ایک بہت بڑے عالم بھی تھے اور مافی الضمیر کے اظہار کی جرأت بھی تھی۔

خلیفہ عبدالرحمن بن الناصر کو عمارتیں تعمیر کرنے کا از حد شوق تھا۔ اس نے ''الزہراء'' کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں نہایت شاندار محل تعمیر کیے۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان عبدالرحمن الناصر اتنا مشغول رہا کہ تین جمعہ وہ مسجد میں نہ آ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ مسجد میں آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں سلطان کی مسجد سے مسلسل تین جمعہ کی غیر حاضری اور تعمیرات میں اس قدر مصروف ہونے کو نام لیے بغیر سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ قاضی منذر نے خطبہ میں قرآن حکیم کی ایسی آیات پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں، جیسے کہ:

> ''کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شاندار محل بناتے ہو۔ گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔'' (شعراء: ۱۲۸_۱۳۱)
>
> ''تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی، اور وہ اس کو

نے کر جہنم کی آگ میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔'' (توبہ: ۱۱۰۔۱۰۹)

اس بارہ میں قاضی منذر نے بہت سی احادیث بھی سنائیں جن سے دنیا کی بے ثباتی اور عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی اور پھر ان قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی تفسیر و تشریح بھی کی۔ اگرچہ اپنے اس خطبہ میں قاضی صاحب نے سلطان کا نام نہیں لیا تھا لیکن سلطان اور مسجد کا ہر نمازی یہ سمجھ رہا تھا کہ اس سخت تنقید کا مخاطب کون ہے۔

تنقید کو تو کوئی شخص اپنے اوپر پسند نہیں کرتا اور جب مجمع عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگوار گزرتی ہے۔ پھر بادشاہوں اور سلاطین پر تنقید اور وہ بھی ایک ماتحت کی زبان سے، وہ تو ہر صورت میں باعث ناگواری ہوتی ہے اور مزاج شاہی تو اس کو کسی صورت پسند نہیں کرتا۔ شاہی مزاج تو قصیدہ خوانی اور مدح سرائی کا عادی ہوتا ہے۔ تنقید کو تو ان کا مزاج ہضم ہی نہیں کر سکتا۔ یہ بادشاہوں کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے کانوں سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ ہم بہت اچھے ہیں۔ مولانا رومیؒ نے بالکل صحیح فرمایا ؎

جانور فربہ شود از نَو نوش
آدمی فربہ شود از راہِ گوش

یعنی جانور منہ کے راستہ سے موٹا ہوتا ہے اور انسان کان کے راستہ سے موٹا ہوتا ہے۔

جب کوئی شخص عمومی طور پر اور کوئی بادشاہ خصوصی طور پر اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے دین دار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔

قاضی منذر کی یہ تنقید سلطان عبدالرحمٰن الناصر پر بھی سخت گراں گذری لیکن اس نے بڑے ضبط سے کام لیا، اور اس تنقید سے سخت متاثر ہونے کے باوجود وہ مسجد میں کچھ

نہ بولا اور نماز جمعہ ادا کر کے خاموشی کے ساتھ اپنے محل میں چلا گیا۔

محل میں پہنچ کر سلطان نے اپنے بیٹے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو سخت تکلیف دی ہے اور میں اس کی باتوں سے سخت پریشان ہوا ہوں، لہٰذا اب میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ان کے پیچھے کبھی جمعہ کی نماز نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے اپنے ابا کی یہ بات سن کر کہا: ”قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ اس کو فوری طور پر معزول کر دیں اور اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو خطیب مقرر کر دیں۔ وہ خطیب ایسی گستاخی بالکل نہیں کرے گا۔“

بیٹے کے منہ سے یہ کلمات سن کر سلطان عبدالرحمٰن غصہ میں آ گیا۔ اس نے اپنے اس بیٹے کو ڈانٹ کر کہا: ”تمہارا برا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے، کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے شخص کو معزول کر دیا جائے۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی۔ (**هذا مالا یکون**) مجھے ان کی ان باتوں سے دل پر چوٹ لگی ہے اس لیے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھا لی۔ میری خواہش ہے کہ اس کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے اور نکل بھی آئے گی۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے۔ (**بل یصلی بالناس حیاتنا و حیاته انشاء الله تعالی**) چنانچہ قاضی منذر بدستور جامع قرطبہ میں جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔

عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نے بھی ان کو اس منصب پر باقی رکھا۔

باوجود اس تنقید کے سلطان عبدالرحمٰن ان کا قدر دان رہا، اور ان کی جرأت و ہمت کی تعریف کرتا رہا۔ سلطان عبدالرحمٰن کے زمانہ میں ایک مرتبہ قحط پڑا۔ ملک کے حالات بہت پریشان کن ہو گئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ نماز استسقاء پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے تاکہ قحط کی یہ کیفیت ختم ہو۔ جب قاصد قاضی صاحب کے پاس سلطان کا پیام لے کر گیا تو قاضی صاحب نے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے لیکن وہ خود کیا کر رہے ہیں؟

قاصد نے کہا:

> "آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ فرش خاک پر سربسجود ہیں۔ ان کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش کی طرح آنسو رواں ہیں۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے ہیں اور حق تعالیٰ شانہ سے رو رو کر کہہ رہے ہیں: "بارالٰہا! میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالانکہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

قاصد کے منہ سے یہ الفاظ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان کے آثار ظاہر ہو گئے۔ انہوں نے قاصد سے کہا:

> "اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہو گی کیونکہ زمین کا حاکم جب الحاح وزاری کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے۔ (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء)
> چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس گیا تو بارش شروع ہو گئی۔

……

﴿حقوق کی ادائیگی﴾

موجودہ زمانہ حقوق کا زمانہ ہے اور اس میں ہر شخص دوسرے سے اپنے حقوق کا خواہاں ہے اور خود اس کے ذمہ جو دوسروں کے حقوق ہیں جن کو فرائض کہا جاتا ہے، وہ ادا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مالک اپنے حقوق مانگ رہا ہے، نوکر اپنے حقوق مانگ رہا ہے، حکومت اپنے حقوق مانگ رہی ہے اور رعایا اپنے حقوق مانگ رہی ہے۔

انسان کو دنیا کی ہر شی سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے، ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے۔ اس شی سے وہ فائدہ اور نفع اٹھایا جائے جس کے لیے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے، اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے۔ اسی ذمہ داری کا نام ”حق“ ہے جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے۔

انہی حقوق کے بارہ میں علامہ ابن جوزیؒ نے بغداد میں رہنے والے ایک تاجر کی دو بیویوں کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے ایک دوسرے کے حقوق کا کچھ اس طرح خیال رکھا کہ ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اور موجودہ زمانہ میں اس کی مثال ملنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ

> ”بغداد میں ایک کپڑے کا تاجر رہتا تھا جو نہایت متمول تھا۔ ایک روز وہ اپنی دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نوجوان عورت اس کی دکان پر کوئی چیز خریدنے کے لیے آئی۔ وہ اپنی خریداری کے سلسلہ میں دکاندار سے باتیں کر رہی تھی، اسی اثنا میں اس نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا۔ دکاندار نے جونہی اس کا چہرہ دیکھا تو وہ حیرت

زدہ رہ گئے۔ اس کا چہرہ نہایت خوبصورت تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کوئی حور زمین پر اتر آئی ہے۔ دکاندار نے اس عورت کے سامنے اس کی خوبصورتی پر حیرت کا اظہار کیا۔ وہ عورت کہنے لگی کہ میں بھی یہاں کوئی شی خریدنے کے لیے نہیں آئی۔ میں تو بہت روز سے اس بازار کے چکر لگا رہی تھی کہ کوئی شریف آدمی دل کو اچھا لگے تو اس سے نکاح کے دو بول پڑھا لوں۔ تم میرے دل کو اچھے لگے ہو۔ میں کوئی غریب عورت نہیں ہوں بلکہ ایک مال دار عورت ہوں، لہٰذا میری گذارش ہے کہ کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گے؟''

دکاندار اس کے حسن کا متوالا تو ہو گیا لیکن اس کی شادی کی پیشکش کے جواب میں اس نے کہا کہ میری شادی چچازاد بہن سے ہو چکی ہے، اور میں نے اس سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ میں اسے کسی صورت نہیں چھوڑوں گا۔ میرا ایک لڑکا بھی اس کے بطن سے ہے۔'' وہ عورت کہنے لگی: ''میں تمہیں اس بات پر مجبور نہیں کرتی کہ تم اسے چھوڑ کر مجھ سے شادی کرلو، لیکن یہ ضرور کہتی ہوں کہ تم شادی کے بعد ہفتہ میں صرف دو بار میرے پاس آیا کرو اور باقی سارا وقت اپنی پہلی بیوی کے ساتھ رہا کرو۔ وہ تاجر اس بات پر راضی ہو گیا اور اس عورت سے نکاح کرلیا۔

اپنی اس نئی بیوی کو لے کر وہ اپنے گھر آیا اور اپنی پہلی بیوی سے کہنے لگا کہ ''میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ میں رات اس کے پاس رہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور رات اس نئی بیوی کے پاس گزاری۔ پھر اس کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ روزانہ ظہر کی نماز کے بعد اس عورت کے پاس جانے لگا یہاں تک کہ آٹھ ماہ گزر گئے۔

اسی دوران اس تاجر کی پہلی بیوی کو اپنے میاں کے حالات کچھ

عجیب عجیب سے لگنے لگے کیونکہ اب وہ پہلے کی طرح گھر میں پورا وقت نہیں دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک نوکرانی کے ذریعہ اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس نے اپنی باندی سے کہا کہ جب میرا میاں گھر سے نکلے تو دیکھنا کہ یہ کہاں جاتا ہے۔ چنانچہ جب وہ تاجر اپنے روزانہ معمول کے مطابق گھر سے نکلا تو وہ باندی بھی اس کے پیچھے ہو لی۔ وہ گھر سے سیدھا اپنی دوکان پر آ گیا۔ باندی اس کی دکان کے آس پاس کہیں چھپی رہی۔ جب نماز ظہر کا وقت ہوا تو وہ وہ باندی اس کے تعاقب میں چل پڑی۔ دکاندار کو بالکل کوئی علم نہ تھا کہ باندی اس کا تعاقب کر رہی ہے، اس لیے وہ بے خبری میں اس عورت کے گھر چلا گیا۔ باندی اس کے پڑوسیوں کے پاس آئی اور ان سے اس گھر کے بارہ میں تحقیق احوال کی۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ یہ ایک کم سن عورت کا گھر ہے اور اس نے کپڑے کے ایک تاجر سے شادی کر رکھی ہے جو ظہر کے بعد اس کے گھر آتا ہے۔ باندی نے یہ تمام معلومات حاصل کر کے اپنی مالکہ کو آ کر بتا دیں۔ مالکہ نے اسے سختی سے کہا کہ قصہ کا کسی کو پتہ نہ چلے اور اس نے اپنے خاوند سے بھی اس کے بارہ میں کچھ نہ کہا کہ آپ نے فلاں جگہ شادی کر رکھی ہے۔ یونہی ہنسی خوشی زندگی کے دن گزرتے گئے۔ ایک سال کے بعد اس تاجر کا انتقال ہو گیا اور اس نے آٹھ ہزار اشرفیاں ترکہ میں چھوڑیں۔ تاجر کی اس پہلی بیوی نے اس ترکہ کو شریعت کے مطابق تقسیم کیا۔ اس نے سات ہزار اشرفیاں بچہ کے لیے الگ کر دیں اور باقی ایک ہزار اشرفیوں کے دو حصے کیے۔ پانچ سو اشرفیاں ایک تھیلے میں بند کر کے اس باندی کو دیں اور اسے کہا کہ یہ تھیلا اس عورت کے پاس لے جا جو اس تاجر کی دوسری بیوی ہے، اور اسے کہنا کہ تاجر کی وفات ہو گئی اور اس نے

> ترکہ میں آٹھ ہزار اشرفیاں چھوڑی ہیں۔ جن میں سے سات ہزار اشرفیاں تو اس کے لڑکے کو مل گئی اور ایک ہزار اشرفیاں تیرے اور میرے حصے میں آئی ہیں۔ پانچ سو میں نے اپنے پاس رکھی ہیں اور پانچ سو تمہیں بھیج رہی ہوں۔ یہ تمہارا شرعی حق ہے اس کو لے لو۔
>
> باندی وہ پانچ سو اشرفیاں لے کر اس عورت کے پاس آئی اور اسے پہلے تو اس کے تاجر کے انتقال کے بارہ میں بتایا۔ پھر کہا کہ اس کی پہلی بیوی نے یہ پانچ سو اشرفیاں تمہارے لیے بھیجی ہیں۔ اس تاجر کے انتقال کا سن کر وہ عورت رونے لگی۔ پھر اس نے اپنا ایک صندوق کھولا اور اس میں سے ایک کاغذ نکالا جو کہ طلاق نامہ تھا۔ اس نے اس باندی کو وہ پرچہ دیا اور وہ اشرفیاں واپس کرتے ہوئے کہا کہ اپنی مالکہ کو جا کر پہلے تو میرا سلام دینا اور پھر یہ بتانا کہ اس تاجر نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ یہ طلاق نامہ اس کا ثبوت ہے، اور یہ پانچ سو اشرفی جو اس زمانہ میں بہت بڑا مال تھا، اس کو واپس لوٹا دینا کیونکہ میں اس تاجر کے ترکہ کی کسی شی کی بھی شرعی طور پر حقدار نہیں۔ (صفۃ الصفوۃ: جلد ۲ ص)

اب ڈھونڈنے سے بھی آپ کو ایسی عورتیں نہیں ملیں گی جو حقوق کی ادائیگی میں اس قدر احتیاط کریں۔ یہ سب کچھ خوف آخرت کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ عورت پانچ سو اشرفی لے لیتی تو کسی کو کیا پتہ تھا کہ اس کو طلاق ہو گئی ہے۔ یہ اس کی ایمانداری اور خلوص تھا کہ اس نے وہ اشرفیاں واپس لوٹا دیں۔

◆

﴿حجیت حدیث پر بہترین دلیل﴾

حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی قدس سرہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور بانی دارالعلوم قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے پوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تحریر وتقریر میں ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا بلکہ ماضی قریب میں حکمت قاسمی کے وہ تنہا وارث تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مفتی اعظم پاکستان جو حضرت قاری صاحبؒ کے خاص ساتھیوں میں سے تھے، یہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو جو علوم وہبی عطا فرمائے تھے، وہ اچھے اچھے علماء کی سمجھ میں نہیں آتے تھے، لیکن دو بزرگ ایسے تھے جنہوں نے حکمت قاسمی کی شرح وتوضیح اور اسے اقرب الی الفہم بنانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ایک شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور دوسرے قاری محمد طیب قاسمیؒ۔

جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ میں ایک مرتبہ آپ نے فلسفہ نماز کے موضوع پر تقریر فرمائی جو اپنی مثال آپ تھی۔ (وہ بعد میں کتابی شکل میں چھپی ہوئی ہے) اس تقریر کے سامعین میں خطیب الامت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی تھے جن کی خطابت کا شہرہ پورے برصغیر پاک وہند میں تھا۔ تقریر کے اختتام پر انہوں نے اٹھ کر پہلے تو حضرت قاری صاحب قدس سرہ کا منہ چوما، اور پھر فرمایا کہ یہ مولانا طیب صاحب نہیں بول رہے تھے بلکہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی روح بول رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بات سمجھانے اور مخاطب کے ذہن میں اتارنے کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ایک دفعہ آپ پاکستان تشریف لائے۔ کراچی سے لاہور آتے ہوئے راستہ میں ایک منکر حدیث نے انکار حدیث پر کچھ اشکالات پیش کیے۔ آپ نے ان کے جو مدلل جوابات دیے، وہ قاری صاحب قدس سرہ کے الفاظ میں کچھ یوں ہیں۔ فرماتے ہیں۔

> "میں ایک مرتبہ ٹرین میں پاکستان میں کراچی سے لاہور آ رہا تھا۔ ریل
> کا سفر تھا۔ اسی گاڑی میں ایک صاحب سوار ہوئے جو اپ ٹو ڈیٹ

قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے اس قدر نیاز مندی سے میرے ساتھ برتاؤ کیا اور اتنی خدمت کی کہ ذرا میں لوٹے کی طرف ہاتھ بڑھاؤں تو فوراً پانی بھر کر لائیں۔ اور اگر کسی چیز کا اشارہ بھی کروں، سمجھ جائیں اور لا کر رکھ دیں۔ بہت زیادہ خدمت کی۔ کئی گھنٹے تک وہ بیچارے محبت سے خدمت کرتے رہے۔ میرے دل میں قدر ہوئی کہ بھئی بالکل ہی جدید تعلیم یافتہ اور نوعمر آدمی اور اس طالب علم کے آگے اس قدر محبت سے پیش آئے، دل میں بڑی قدر ہوئی وہ تھے اصل میں منکر حدیث۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے انکار حدیث کی بحث و تمحیص کے اوپر لائیں، اس لیے خدمت کو انہوں نے پیش خیمہ بنایا۔ آخر میں انہوں نے اپنا مقصد ظاہر کیا۔ اب انہوں نے احادیث پر کچھ اعتراضات کرنے شروع کیے کہ وہ قابل اعتبار نہیں۔ وہ ایک تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔

میں نے کہا: ”آپ کسی چیز کو مانتے بھی ہیں؟“ کہنے لگے: ”قرآن“ میں نے کہا: ”قرآن کا قرآن ہونا آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا آپ پر وحی آئی تھی کہ یہ قرآن ہے۔ کیسے پتہ چلا آپ کو؟“ کہنے لگے: ”اللہ کے رسول کے ارشاد سے۔“ میں نے کہا: ”وہ ارشاد ہی تو حدیث ہے، تو قرآن کا قرآن ہونا تو حدیث پر موقوف ہے، حدیث کا آپ انکار کر دیں گے تو کون سی شرط ہے قرآن کے قرآن ہونے کی؟ کیسے آپ انکار کرتے ہیں؟“ تو وہ چپ ہوگئے۔

کہنے لگے دل سے تو حدیث کا انکار واقعی مشکل ہے۔ باقی حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ بعض قابل اعتبار نہیں۔ تو میں نے کہا: ”جس کو تو آپ نے مان لیا۔ آپ مصر کیوں ہیں کہ حدیث کی قسمیں ہیں۔“ میں نے کہا: ”جہاں تک حدیث کی قسمیں ہیں محدثین نے خود اس کی صراحت کی ہے کہ ہر حدیث کا ایک درجہ نہیں ہے۔“

جو حدیث متواتر ہے اور تواتر سے ثابت ہے، وہ صورت یقین ہے۔

اس کا انکار ایسا ہی ہے جیسے قرآن کا انکار۔ قرآن کی ایک آیت کا آدمی انکار کر دے تو اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ حدیث متواتر کے انکار سے بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

دوسرے درجہ کی حدیث، حدیث مشہور ہے۔ وہ اگر مورث یقین نہیں تو ظن غالب کی مورث تو ہے ہی۔ ظن غالب تو پیدا ہوگا، اور ظن غالب پر ہزاروں احکام کا مدار ہے تو وہ بھی حجت ہوگی۔

تیسرا درجہ خبر واحد کا ہے۔ وہ اگر ظن غالب نہیں تو مطلق ظن کو تو پیدا کرتی ہے۔ اور ظن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے احکام ظن اور گمان پر مبنی ہیں کہ آدمی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ وضو میں پیروں کا دھونا ضروری ہے، اور ذرا بھی خشک رہ جائے، وضو نہیں ہوگا، لیکن آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایڑھی دھل گئی ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ظن غالب ہی تو ہوتا ہے کہ پیر دھل گیا۔ اس ظن غالب پر شریعت بھی حکم دیتی ہے کہ ہاں دھل گیا۔ وضو ہو گیا۔ تو بہت سے احکام کا مدار ظن غالب پر بھی ہوتا ہے۔ تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کر دے وہ بھی حجت کی شان رکھتی ہے۔ آپ کا گمان جب فعل کے جائز ہونے پر حجت بن جاتا ہے تو حدیث اگر ظن ہی پیدا کر دے تو وہ کیوں حجت نہیں بنے گی؟ تو میں نے کہا: یہ تو خود محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ہر حدیث ایک درجے کی نہیں ہے۔ تو جس حدیث کو آپ نے مان لیا۔ اقسام حدیث قابل اعتراض ہیں تو خود محدثین ہی تقسیم کرتے ہیں۔ اب آپ کو اعتراض کیا ہے؟ کہنے لگے اب تو کچھ اعتراض نہیں۔

میں نے کہا: ''اب حدیث کا انکار نہیں کرو گے؟'' کہنے لگے: ''نہیں، اب نہیں کروں گا۔ تو لاہور آتے آتے ان کا خیال درست ہو گیا۔ (خطبات حکیم الاسلام، جلد ۱ ص ۷۷۔۷۹)

……

ایک لطیف شکایت

ایک مرتبہ سیدنا عمر بن خطاب اپنے عہد خلافت میں ایک صحابی سیدنا کعب بن سوارؓ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ایک عورت آئی اور اس نے ایک بڑے لطیف پیرائے میں اپنے خاوند کی شکایت کی وہ اس طرح کہ اس نے سیدنا عمرؓ سے کہا:

"امیر المومنین! میرے شوہر جیسا نیک شخص شاید دنیا میں کوئی ہو۔
وہ دن بھر روزہ رکھتا ہے اور شب بھر نماز پڑھتا ہے۔"
یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

سیدنا عمرؓ اس بات سے اس کا مقصد صحیح طور پر نہ سمجھ پائے۔ چنانچہ اس عورت سے یہ بات سن کر آپؓ نے فرمایا: "حق تعالیٰ شانہ تجھے برکت دے اور تیری مغفرت فرمائے، نیک اور پارسا عورتیں اپنے شوہروں کی ایسی ہی اچھی تعریف کرتی ہیں۔"

اس عورت نے سیدنا عمرؓ کے منہ سے یہ جملہ سن کر کھڑی اور پھر واپس جانے لگی۔ سیدنا کعب بن سوارؓ جو اس وقت وہاں موجود تھے، انہوں نے عورت کی اس شکایت اور امیر المومنین کے اس جواب کو سن کر سیدنا عمرؓ سے کہا

"امیر المومنین! آپ اس عورت کی بات صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے۔
اس نے اپنے صائم الدھر اور زاہد شب زندہ دار شوہر کی تعریف نہیں
کی بلکہ بڑے لطیف پیرائے میں اس کی شکایت آپ سے کی ہے۔
اس بات سے اس کا مطلب یہ تھا کہ میرا خاوند عبادات میں
میرے حقوق زوجیت ادا نہیں کرتا۔"

سیدنا عمرؓ نے فرمایا: "اچھا یہ بات ہے۔ اس عورت کو واپس بلاؤ۔"

وہ عورت آپ کے بلانے پر واپس آگئی۔ اس سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ واقعی سیدنا کعب بن سوارؓ کی بات درست ہے۔ اب سیدنا عمرؓ نے اس صحابی رسول سے کہا

اچھا: "تم نے اس کی اس لطیف شکایت کو سمجھا ہے، اب فیصلہ بھی تم ہی کرو۔"

سیدنا کعبؓ نے عرض کی: "امیر المومنین! میں آپ کی موجودگی میں کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: "نہیں، تم نے ہی اس کی شکایت کو سمجھا تھا اب اس کا ازالہ بھی تم ہی کرو۔" سیدنا کعبؓ نے اس کے خاوند کو بلایا اور اس سے کہا کہ تیری اہلیہ نے تیرے خلاف یہ شکایت کی ہے کہ تو اس کے حقوق زوجیت ادا نہیں کرتا، اور دن بھر روزہ اور رات کو نوافل پڑھتا رہتا ہے۔" اس نے اس بات کو تسلیم کیا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ تو تین دن عبادت کر سکتا ہے لیکن چوتھے روز تمہیں یقیناً اپنی اہلیہ کے پاس گزارنا ہوگا۔"

اس نے کہا: "بہت اچھا۔"

اس کے بعد دونوں میاں بیوی چلے گئے۔ سیدنا عمرؓ نے سیدنا کعبؓ سے پوچھا: "یہ فیصلہ تم نے کیسے کیا؟" سیدنا کعبؓ نے کہا:

> "امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک مرد کو زیادہ سے زیادہ چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ اگر کوئی شخص اس اجازت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے چار شادیاں کر لے تو بھی ہر بیوی کے حصہ میں چار میں سے ایک دن رات آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چوتھا دن رات ایک بیوی کا حق ہے، لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عورت کا شوہر تین دن رات عبادت کر سکتا ہے لیکن چوتھا دن رات لازماً اسے اپنی بیوی کے ساتھ گزارنا ہوگا اور اس کے حقوق زوجیت ادا کرنا ہوں گے۔"

سیدنا عمرؓ اس صحابی کا یہ فیصلہ سن کر پھڑک اٹھے اور فرمایا: "یہ فیصلہ تمہاری پہلی فہم و فراست سے عجیب ہے۔"

اس کے بعد سیدنا عمرؓ نے سیدنا کعب بن سورؓ کو بصرہ کا قاضی مقرر فرما دیا۔

(الاستیعاب لابن عبد البر تحت ترجمہ کعب بن سورؓ)

……

ایک ہار کا عجیب واقعہ

حافظ ابن رجب حنبلیؒ (م ۷۹۵ھ) علمائے حنابلہ میں سے ایک بہت بڑے عالم ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں طبقات حنابلہ پر ان کی ایک بڑی مشہور کتاب ہے۔ وہ اپنی اس کتاب ''ذیل طبقات حنابلہ'' میں قاضی ابوبکر بن محمد بن عبدالباقی بغدادیؒ کے حالات میں ان کا ایک عجیب و غریب واقعہ ان کی زبانی نقل فرماتے ہیں۔ قاضی ابوبکرؒ فرماتے ہیں:

> ''میں ایک زمانہ میں مکہ میں آ کر رہائش پذیر ہو گیا۔ ان دنوں میری مالی حالت اچھی نہ تھی۔ ایک روز میں بھوک سے نڈھال تھا اور بھوک کو مٹانے کے لیے میرے پاس کوئی درہم و دینار نہ تھا۔ میں مکہ کی سڑکوں پر پھر رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک ریشم کی تھیلی پڑی ہوئی مل گئی جس کا پھندنا بھی ریشم کی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ میں اس تھیلی کو اٹھا کر گھر لے آیا اور اسے کھول کر دیکھا تو اس میں بڑے قیمتی موتیوں کا نہایت قیمتی اور نفیس ہار تھا۔ میں نے اس جیسا ہار آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ہار کو گھر میں رکھ کر میں باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک بڑے میاں اعلان کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک پھٹے پرانے کپڑے میں پانچ سو دینار بندھے ہوئے تھے، اور وہ یہ کہہ رہے تھے کہ جو شخص موتیوں کے ہار والی تھیلی واپس کر دے گا اس کو پانچ سو دینار انعام دیا جائے گا۔ میں نے بڑے میاں کے اس اعلان کو سن کر اپنے دل میں کہا کہ میں بھوکا بھی ہوں اور ضرورت مند بھی۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے ناچ رہے ہیں، کیوں نہ میں وہ ہار والی تھیلی واپس کر کے پانچ سو اشرفیاں

انعام میں لے لوں اور ان سے اپنی ضرورتیں پوری کرلوں۔

میں نے اس بڑے میاں کو بلایا اور اس کو اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

میں نے اس تھیلی کی نشانیاں اس سے پوچھیں۔ اس نے تھیلی کی پوری تفصیلات بتائیں کہ تھیلی کس رنگ کی تھی، پھندنا کیسا تھا، ہار کس قسم کا ہے اور اس کے موتی کیسے ہیں۔ جب میری پوری تسلی ہوگئی تو میں نے وہ تھیلی نکال کر اس بڑے میاں کے سامنے رکھ دی۔ اس نے تھیلی پکڑ کر پانچ سو دینار میرے آگے رکھ دیے تاکہ میں انعام کی وہ رقم لے لوں۔ میری اس وقت ایک عجیب حالت تھی۔ گویا کہ ؎

اک طرف کعبہ ہے میرا اک طرف ایمان ہے
کس کو رکھوں کس کو چھوڑوں کشمکش میں جان ہے

ایک طرف وہ پانچ سو دینار تھے اور دوسری طرف میری ضروریات اور پیٹ کی بھوک تھی۔ میں ایک عجیب قسم کی کشمکش میں تھا کہ کیا کروں۔ آخر دل نے فیصلہ کیا کہ تھیلی لوٹانے کے معاوضہ کی یہ رقم نہیں لینی چاہیے، لہٰذا میں نے وہ رقم لینے سے انکار کردیا۔ اس بڑے میاں نے مجھے وہ رقم دینے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ یہ میرا فرض تھا کہ میں یہ آپ کی تھیلی آپ کو لوٹا دوں۔ میں اس پر کوئی اجر اور بدلہ نہیں لینا چاہتا۔ اس نے پھر بھی بہت اصرار کیا لیکن میں نے کہا میں کسی صورت یہ رقم نہیں لوں گا حالانکہ مجھے اس رقم کی سخت ضرورت تھی۔ آخرکار وہ چلا گیا۔

مکہ کی زندگی میرے لیے کٹھن سے کٹھن تر ہوتی گئی، اور میں نے حالات سے مجبور ہوکر مکہ کو خیرباد کہا اور کشتی میں بیٹھ کر کسی دوسرے ملک میں جانا چاہا۔ میں کشتی میں بیٹھ کر جا رہا تھا، مجھے اپنی منزل مقصود کا کوئی علم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے۔ اتفاق سے سمندر کی موجوں سے کشتی ٹوٹ گئی، اور سوائے میرے باقی تمام مسافر سمندر کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ ان کا سامان بھی ان کے ساتھ بہ گیا۔ میں اکیلا تنہا کشتی کے ایک تختہ پر سطح سمندر پر تیر رہا تھا۔ کب تک تیرتا رہا اس کے بارہ میں مجھے کوئی علم نہیں، اور نہ ہی مجھے کوئی علم تھا کہ

میں کہاں جا رہا ہوں۔ دو تین روز کے بعد میں اس تختہ کے ذریعہ تیرتا ہوا ایک جزیرہ میں جا پہنچا جہاں کچھ لوگ آباد تھے وہ لوگ کون تھے اور جزیرہ کا کیا نام تھا، مجھے کچھ علم نہیں۔ جزیرہ میں اتر کر میں نے ایک مسجد دیکھی۔ میں اس مسجد میں جا کر بیٹھ گیا اور قرآن حکیم پڑھنے لگا۔ مجھے قرآن پڑھتا دیکھ کر جزیرہ کے سب لوگ میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے قرآن حکیم پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کا وعدہ کر لیا اور ان کو قرآن حکیم پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ بہت خوش تھے اور ان لوگوں نے مجھے ڈھیروں مال دیا جس سے میں نے بھی اپنی زندگی نہایت خوشی اور مسرت کے ساتھ گزارنی شروع کر دی۔

کچھ ماہ بعد میں نے اس مسجد میں قرآن حکیم کے کچھ بوسیدہ اوراق رکھے ہوئے دیکھے۔ میں انہیں اٹھا کر پڑھنے لگا۔ مجھے وہ اوراق پڑھتا دیکھ کر انہوں نے پوچھا: ”آپ خوش نویسی بھی جانتے ہیں؟“ میں نے کہا: ”جی ہاں۔“ انہوں نے کہا: ”پھر آپ ہمیں لکھنا اور پڑھنا سکھا دیجئے۔“ مختصر یہ کہ وہ اپنے بچوں اور جوانوں کو لے کر آ گئے اور میں انہیں لکھنا پڑھنا سکھانے لگا۔ اس سے بھی انہوں نے میری کافی مالی امداد کی۔

ایک روز وہاں کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے یہاں ایک یتیم بچی ہے اور اس کے پاس مال و دولت بھی کافی موجود ہے۔ دولت حسن بھی ہے، ہماری خواہش ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔ میں نے انہیں منع کیا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا، لیکن انہوں نے اس قدر اصرار کیا کہ مجھے ان کی بات ماننی پڑی۔ جب وہ شب زفاف میں اسے لے کر میرے پاس آئے تو جونہی میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو میں نے اس کے گلے میں وہی ہار لٹکا ہوا دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ میں نہایت حیرت سے اس ہار کو کافی دیر تک دیکھتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ یہ ہار تو میں نے اس بڑے میاں کو دیا تھا، یہ اس کے پاس کیسے آ گیا۔ لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ میں لڑکی کو نہیں بلکہ اس کے گلے کے ہار کو دیکھ رہا ہوں، تو لوگوں نے مجھے کہا کہ حضرت! آپ نے تو اس یتیم لڑکی کا دل توڑ دیا ہے۔ آپ اس کو دیکھنے کے بجائے اس قیمتی ہار کو دیکھ رہے ہیں جو اس کے گلے میں ہے۔“

میں نے انہیں ہار کا تمام قصہ سنایا تو سب ایک ساتھ خوشی سے اچھل پڑے اور

انہوں نے خوشی سے ایک ساتھ اللہ اکبر کا ایسا نعرہ لگایا کہ تمام اہل جزیرہ نے وہ آواز سنی۔ میں نے کہا: ''کیا ہوا؟'' تم اتنے خوش کیوں ہو؟ اور اس خوشی کے نعرہ کی کیا وجہ ہے؟'' وہ کہنے لگے کہ جن بڑے میاں نے آپ سے یہ ہار لیا تھا وہ اس لڑکی کے باپ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے دنیا میں صرف ایک سچا اور پکا مسلمان ملا ہے جس نے مجھے یہ قیمتی ہار بغیر کسی معاوضہ کے لوٹایا۔ اس شخص کی ایمانداری اور سچائی سے متاثر ہو کر وہ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ ''اے اللہ! مجھے اس شخص سے ایک بار پھر ملا دے تاکہ میں اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دوں اور اسے اپنا داماد بنا لوں۔ بڑے میاں تو دوبارہ آپ کو نہیں مل سکے لیکن ان کی دعا قبول ہو گئی اور ان کی یہ بچی آپ کے حبالۂ عقد میں آ گئی۔

> ''میں ایک مدت تک اپنی اس اہلیہ کے ساتھ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں سے دو لڑکے بھی عطا فرمائے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ دونوں لڑکے بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، اور وہ ہار ترکہ میرے قبضے میں آ گیا۔ میں نے اسے ایک روز ایک لاکھ دینار میں فروخت کر دیا۔ اور یہ جو مال و اسباب تم کو نظر آ رہا ہے یہ اس ہار کی باقی ماندہ رقم کا حصہ ہے۔'' (ذیل طبقات الحنابلہ: جلد ۱، ص ۱۹۲)

……

مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے لیکن اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا

تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں جب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی، کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں ایک مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ مسجد کے سامنے متنازعہ جگہ تھی اس وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع کی صورت پیدا ہوگئی۔ مسجد کے متصل جو زمین تھی، مسلمان اس زمین کو مسجد کی ملکیت بتاتے تھے اور اس کو مسجد میں شامل کرنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ یہ قدیم مندر کا حصہ ہے۔ جھگڑے نے طول پکڑا تو معاملہ عدالت تک پہنچ گیا اور کئی سال تک یہ دیوانی مقدمہ چلتا رہا۔

دونوں طرف سے شواہد پیش کیے گئے لیکن وہ اتنے قطعی نہ تھے کہ ان کی بنیاد پر کسی فریق کے حق میں فیصلہ کیا جا سکے۔ مجسٹریٹ انگریز تھا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے الگ الگ گفتگو کی تاکہ کسی فیصلہ پر پہنچا جا سکے۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ قطعہ اراضی مسجد کی ملکیت ہے۔ اگر تم کسی ایسے ہندو کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ کر دوں گا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ایسے کسی ہندو کا نام نہیں بتا سکتے۔ چونکہ یہ مذہبی معاملہ ہے اور ہم کو کسی ہندو سے یہ قطعاً امید نہیں کہ ایسے مذہبی معاملہ میں وہ جانب داری کے بغیر بالکل سچ بات کہہ سکے اور یہ گواہی دے دے کہ یہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔

اس کے بعد اس انگریز مجسٹریٹ نے ہندوؤں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم کسی ایسے مسلمان کا نام بتا سکتے ہو جو تمہارے دعوئی کی تصدیق کرے اور یہ گواہی دے کہ یہ زمین مسجد کی نہیں بلکہ مندر کی ملکیت ہے۔ اگر تم ایسے کسی مسلمان کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ تمہارے حق میں کر دوں گا۔ ہندوؤں نے آپس میں مشورہ کیا اس کے بعد انہوں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ مسئلہ قومی عزت کا معاملہ بن گیا ہے، اس لیے بہت مشکل ہے کہ کوئی مسلمان یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ہے تاہم ہماری بستی

میں ایک بزرگ ایسے ہیں جن سے ہم کو امید ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔

ہندوؤں نے جس مسلمان کا نام بتایا وہ مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کے بھائی اور حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کے والد مولانا محمود بخش (۱۲۵۸ھ) تھے۔ مجسٹریٹ کا کیمپ اس وقت کاندھلہ کے قریبی موضع ایلم میں تھا۔ اس نے فوراً مولانا محمود بخش کو پیغام بھیجا کہ وہ عدالت میں پہنچ کر متعلقہ مسئلہ میں اپنا بیان قلم بند کرائیں۔ جب قاصد سمن لے کر مولانا محمود بخش کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ کسی فرنگی کا کبھی منہ نہیں دیکھوں گا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ اپنا چپڑاسی بھیج کر کہلایا کہ اس کا انتظام رہے گا کہ میں یا کوئی دوسرا انگریز آپ کے سامنے نہ پڑے، آپ مہربانی فرما کر تشریف لائیں۔ کیونکہ آپ ہی کے بیان پر ایک اہم مقدمہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس نے مزید یہ کہلا بھیجا کہ آپ کی مذہبی کتاب قرآن حکیم میں یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو پیش کرے، وہ ہرگز اس کو نہ چھپائے۔

اس یقین دہانی پر مولانا محمود بخشؒ کاندھلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں تشریف لائے۔ مجسٹریٹ خیمہ کے اندر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا۔ مولانا دروازہ کے پاس باہر کی طرف کھڑے ہو گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد خیمہ کے باہر جمع تھی۔ ہر ایک ملے جلے جذبات کے ساتھ منتظر کہ دیکھئے آج کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ نے بلند آواز سے پوچھا کہ "مولانا محمود بخش صاحب یہ بتایئے کہ یہ متنازعہ جگہ ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی؟" مولانا نے فرمایا: "صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی جگہ ہے۔ مسلمانوں کا دعویٰ اس کے بارہ میں غلط ہے۔ مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش کے اس بیان پر اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ یہ زمین کاندھلہ کی موجودہ جامع مسجد کی جنوب مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ ہندوؤں نے مجسٹریٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد یہاں مندر تعمیر کر دیا۔ اب بھی اس جگہ پر وہ مندر موجود ہے۔

مسلمان کچہری سے اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کے چہرے اداس تھے اور ان کے دلوں میں شکست کا احساس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ "مولوی نے قوم کو غیروں کے سامنے رسوا کر دیا۔" مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ قانون کی عدالت کا فیصلہ

اگرچہ ہو چکا ہے مگر اخلاق کی عدالت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ مولانا محمود بخش کی اس سچائی اور بے لاگ حق پرستی کا ہندوؤں پر بہت اثر پڑا۔ وہ مولانا کی سچائی کے واقعہ میں اس دین کی سچائی کو دیکھنے لگے جس نے ان کے اندر یہ زبردست قوت پیدا کی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملہ میں بھی انصاف کی حدود سے نہیں ہٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاندھلہ کے کئی ہندو خاندان اسلام سے متاثر ہو کر مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ ان نو مسلم خاندانوں میں سے ایک گھرانہ ۱۹۴۷ء تک کاندھلہ میں موجود تھا جو تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔

”مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے، مگر اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا۔“

……

﴿حنظلہ میسرہ کے دونوں لشکروں میں سے پہلے ایک سے جنگ کرو﴾

یہ جملہ ہشام بن عبدالملک کی زبان سے اس وقت نکلا جب وہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اور اس کو افریقہ میں اس کے جرنیل حنظلہ نے سن لیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حسب معاملہ شخص اپنے مخصوص حالات میں گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے بے لاگ طور پر سوچ نہیں پاتا، اور یہ بات اس سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ اس ہنگامی موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت پھر اللہ کی نصرت خارج سے ہوتی ہے۔ یہی صورت سیدنا فاروق اعظمؓ کو مدینہ میں جمعہ کے خطبہ میں پیش آئی جب انہوں نے خطبہ دیتے وقت "یا ساریة الجبل" (اے ساریہ پہاڑ کی طرف) کے الفاظ کہے اور ساریہ جرنیل نے دوری جنگ پر ان الفاظ کو سن کر ان پر عمل کیا اور دشمن پر فتح پائی۔ اور اسی قسم کے الفاظ ہشام بن عبدالملک نے کہے جو دمشق میں بستر مرگ پر پڑا تھا اور اس کے جرنیل حنظلہ نے اس کے ان الفاظ کو افریقہ میں سن لیا۔

تواریخ میں ہے کہ سنہ ۱۲۲ھ میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں افریقہ میں بربر قوم کے مقابلہ میں اسلامی لشکر کو شکست ہوئی۔ اس فوج میں زیادہ تر شام کے لوگ تھے اور فوج کی تعداد کم تھی۔ ہشام کو جب اس کے بارہ میں پتہ چلا تو اس نے قسم کھائی کہ اگر میں زندہ رہا تو اہل بربر پر ایک لاکھ آدمیوں کا لشکر بھیجوں گا اور یہ سب میرے تنخواہ دار فوجی ہوں گے۔ اس کے بعد پھر ایک لاکھ بھیجوں گا اور برابر بھیجتا رہوں گا یہاں تک کہ میرے بیٹوں اور پوتوں کے سوا کوئی باقی نہ رہے۔ پھر ان میں بھی قرعہ ڈالوں گا۔ اور اگر میرے نام پر قرعہ نکلا تو میں خود لڑنے کے لیے نکلوں گا۔"

اس کے بعد ہشام نے بشر بن صفوان گورنر افریقہ کے بھائی حنظلہ بن صفوان کلبی کو چالیس ہزار فوج دے کر روانہ کیا۔ اس جنگ کے دوران خلیفہ ہشام بیمار پڑ گیا مگر اس کا دل برابر میدان جنگ کی طرف لگا ہوا تھا۔ روایات میں ہے کہ ایک روز شدت مرض میں اس کی

زبان سے نکلا۔ ”حنظلہ! میسرہ کے دونوں لشکروں میں سے پہلے ایک سے جنگ کرلو۔“

پاس بیٹھے ہوئے حضرات سمجھے کہ ہشام ہذیان کی حالت میں بڑبڑا رہا ہے۔ مگر دمشق کی آواز حنظلہ کو افریقہ میں پہنچ گئی۔ حنظلہ نے ایسی ہی کیا۔ پہلے اس لشکر سے نپٹے جو مقام قرن میں تھا۔ اور ایک لشکر کو شکست دینے کے بعد دوسرے لشکر پر حملہ کیا جو مقام اصنام میں تھا اور فتح حاصل کی۔ دو لشکروں کو اس طرح الگ الگ شکست دینا نہایت آسان اور کارگر ثابت ہوا۔

……

ترقی کا راز

کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس کے اندر اس قسم کے زندہ افراد موجود ہوں۔ زندہ افراد کی موجودگی سے قوم زندہ ہوتی ہے اور زندہ افراد نہ ہونے سے قوم مر جاتی ہے۔ زندہ آدمی وہ ہے جو مصلحت کے مقابلہ میں اصول کو اہمیت دیتا ہو۔ جو اپنی غلطی پر عذرات اور تاویلات کا پردہ ڈالنے کے بجائے اس کو مان لیتا ہو جو ذاتی شکایت کو نظر انداز کردے نہ کہ اس کی بنا پر کسی کو اپنا دشمن سمجھ لے۔ جو اس وقت بھی ایک انسان کی قدر کر سکے جب کہ اس نے اس کے خلاف کاروائی کی ہو۔

مشرقی بنگال کا علاقہ مسلمانوں کے دور حکومت میں دہلی کی مرکزی حکومت کے ماتحت تھا۔ لیکن کئی بار ایسا ہوا کہ وہاں کا گورنر بغاوت کر کے مرکزی حکومت سے الگ ہو گیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ ان میں سے ایک گورنر غیاث الدین بھی تھا جس نے مرکزی حکومت سے بغاوت کر کے بنگال کی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس زمانہ میں ڈھاکہ کا شہر وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس خود مختار حکومت کا پایۂ تخت سونار گاؤں تھا، مشہور انگریز مورخ ایف۔ بی۔ بریڈلے برٹ (F.B. Bradelay Birt) نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ایک زندہ انسان کا پتہ چلتا ہے۔

لکھا ہے کہ ایک روز غیاث الدین تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس کے تیر سے ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا زخمی ہو گیا۔ بیوہ عورت کو معلوم نہیں تھا کہ یہ تیر بادشاہ نے چلایا ہے۔ وہ قاضی کے پاس شکایت لے کر گئی۔ قاضی نے اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ یہ تیر بادشاہ کا ہی چلایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک متذبذب رہا کہ بادشاہ کے خوف اور اللہ کے خوف میں سے کس کو ترجیح دے۔ بالآخر اللہ کا خوف قاضی پر غالب آ گیا اور انہوں نے بادشاہ کو جواب دہی کے لیے سمن جاری کر دیے۔ بادشاہ کو جونہی سمن پہنچے وہ بلا کسی تامل اور پس و پیش کے قاضی کی عدالت کی طرف روانہ ہوا، لیکن اس نے اپنے کپڑوں

میں ایک چھوٹی سی تلوار بھی چھپالی۔ قاضی صاحب نے عدالت میں بادشاہ کا کسی قسم کا کوئی احترام نہیں کیا بلکہ ملزموں کی طرح اس عورت کے ساتھ کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ معاملہ کی جانچ پڑتال میں یہ ثابت ہو گیا کہ وہ تیر واقعی بادشاہ کا چلایا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے بادشاہ کو حکم دیا کہ وہ اس بیوہ عورت کو معقول مالی معاوضہ دے کر اپنا قصور معاف کرائے۔ بادشاہ نے بے چون و چرا قاضی صاحب کے اس حکم کی تعمیل کی اور بیوہ عورت کو ایک بڑی رقم پیش کر کے اس سے اپنا قصور معاف کرایا۔

مقدمہ ختم ہونے کے بعد قاضی صاحب اپنی کرسی سے عدالت سے اٹھ کر بادشاہ کے سامنے باادب کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ نے فوراً انہیں اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ تلوار ان کو دکھائی جو وہ اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوئے تھا اور کہا کہ یہ تلوار میں اس لیے لایا تھا کہ اگر تم میرے اس مقدمہ میں شریعت کے حکم سے ذرا بھی روگردانی کرو گے تو میں تمہارا سر اڑا دوں گا، لیکن تم نے شریعت کی پاس داری کرتے ہوئے اپنا فیصلہ صادر کرنے میں کوئی خوف نہیں کیا اس کے لیے تم انتہائی اعزاز کے مستحق ہو۔

(Dacca: The Romance of one Eastern Capital, P.55-56)

آج اس جمہوری دور میں جب کہ ہر امیر وزیر اور ہر ایم این اے اور ایم پی اے اپنے آپ کو لوگوں کا خادم کہتا ہے شریعت کی اس طرح پابندی کرتا ہے اور آج کی عدالتوں میں یہ جرأت و ہمت ہے کہ صدر مملکت کے خوف پر اللہ کے خوف کو ترجیح دے؟ اب تو ہر شخص اپنے بڑوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں اپنی ترقی اور عافیت سمجھتا ہے بلکہ اب تو ہر آمر کی اس طرح خوشامد کی جاتی ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ ایک انسان اتنا بھی گر سکتا ہے ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

◆

﴿عزت کپڑوں میں نہیں ہے﴾

سنہ ۱۶ھ میں مسلمان فوجیں سیدنا ابو عبیدہ بن جراحؓ کی زیر قیادت شام کو فتح کرتے ہوئے فلسطین تک پہنچ گئیں۔ سیدنا عمرو بن العاصؓ اور سیدنا شرحبیل بن حسنہؓ اس وقت فلسطین میں روم کی فوجوں سے نبرد آزما تھے۔ یہ فوجیں کثرت تعداد میں بہت زیادہ تھیں۔ جدید قسم کا سامان حرب وضرب ان کے پاس موجود تھا اور پھر ان کی قیادت روم کا سب سے بڑا جرنیل اطربون کر رہا تھا۔ سیدنا عمرو بن العاصؓ جنگ کا نقشہ بنانے میں لگے ہوئے تھے کہ اطربون کا انھیں ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا:

> "تم میرے دوست اور برابر کے میر ہو۔ بخدا! اجنادین کے بعد اب تم فلسطین کا کوئی حصہ فتح نہ کر سکو گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم واپس چلے جاؤ اور اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں نہ ڈالو، ورنہ دوسروں کی طرح تمہیں بھی منہ کی کھانی پڑے گی۔"

سیدنا عمرو بن العاصؓ کو یہ خط پڑھ کر سخت حیرت ہوئی لیکن وہ جانتے تھے کہ اطربون بڑا چالاک اور کائیاں ہے۔ جواب میں آپ نے اس کو لکھا:

> "برابری کی بھی خوب رہی۔ میں تو اس ملک کا فاتح ہوں، لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے دوستوں سے مشورہ کر لو۔ شاید تمہاری عبرت ناک تباہی سے پہلے کوئی نیک مشورہ دے دے۔"

بیت المقدس پر حملہ سے قبل سیدنا عمرو بن العاصؓ نے ارد گرد کے تمام علاقوں پر قبضہ کر کے اطربون کی سپلائی لائن کاٹ دی۔ پھر ایک خط امیر المومنین سیدنا عمرؓ کو لکھا کہ

> "میں بڑے ہی خطرناک دشمن سے لڑ رہا ہوں اور ایسے شہروں میں ہوں جو آپ کے لیے سپرد کر دیے گئے۔ آگے جو آپ کی رائے۔"

اس دوران اطربون اور بیت المقدس کا پادری صفرینوس قلعہ بند ہو گئے اور

مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا، لیکن یہ محاصرہ طویل ہو گیا۔ اہل شہر کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ایک روز یہ شہر مسلمانوں کے قبضہ میں جا کر رہے گا۔ چنانچہ صلیب اعظم اور کلیساؤں کے تمام قیمتی ظروف جہاز میں لدوا کر قسطنطنیہ بھجوا دیے گئے، اور خود اطربون بھی فوجوں کو لے کر مصر بھاگ گیا۔

امیر المومنین سیدنا عمرؓ نے دیکھا کہ فلسطین سے انہیں بار بار امداد کے لیے لکھا جا رہا ہے تو وہ خود فلسطین کے سفر پر روانہ ہوئے، اور اپنے جرنیلوں کو اطلاع بھجوائی کہ وہ انہیں جابیہ آ کر ملیں۔ ادھر مسلمانوں کے طویل محاصرے اور اطربون کے فرار نے صفرنیوس پادری کو مجبور کر دیا کہ وہ مسلمانوں سے صلح کی گفتگو کرے۔ چنانچہ آپ کے جابیہ پہنچنے سے قبل صلح نامہ تیار ہو گیا اور امیر المومنین کا انتظار ہونے لگا۔

سیدنا ابو عبیدہؓ سپریم کمانڈر تمام حضرات کو ساتھ لے کر آپ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے۔ پادری صفرنیوس کا خیال تھا کہ امیر المومنین کا لاؤ لشکر نظر آئے گا۔ ان کا محافظ دستہ ان کے اردگرد اور ان کے آگے پیچھے ہو گا جیسا کہ اس زمانہ میں بادشاہوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن وہاں تو دور دور تک کوئی ایسا اہتمام نظر نہ آتا تھا۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ ایک آدمی اونٹ پر بیٹھا ان کی طرف آ رہا ہے اور دوسرا اس کی نکیل پکڑے آگے آگے آ رہا ہے۔ سب مسلمان جرنیلوں نے دوڑ کر اس شخص کا بڑا احترام اور اہتمام سے استقبال کیا جو نکیل پکڑے پیدل آ رہا تھا۔ پھر نہایت ادب و احترام سے ان سے باتیں کرنے لگے۔ صفرنیوس نے پوچھا: ''امیر المومنین کہاں ہیں اور کب آئیں گے؟'' اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ یہ شخص امیر المومنین ہو سکتے ہیں جس نے اونٹ کی نکیل پکڑی تھی۔ اسے بتایا گیا کہ یہی تو امیر المومنین ہیں۔

حاکم کی روایت میں ہے کہ اس سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ جب آپ اسلامی لشکر سے ملے تو ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ یہ تہ بند باندھے ہوئے ہیں اور کسی قسم کا کوئی سامان آپ کے پاس نہیں ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا: ''امیر المومنین! آپ کو عیسائیوں کے فوجی اور سول افسروں اور ان کے مذہبی عہدیداروں سے ملنا ہے اور آپ اس حال میں ہیں۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: اے ابو عبیدہ! کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا۔ ہم

دنیا میں سب سے پست قوم تھے۔ پھر اللہ نے اسلام کے ذریعہ ہم کو عزت دی۔ جب بھی ہم اس کے سوا کسی اور چیز کے ذریعہ عزت چاہیں گے تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا۔

عزت اور ذلت کو اللہ کی طرف سے سمجھنا ایک ایسا عقیدہ ہے جو آدمی کو بغیر کسی ہتھیار کے ہتھیار والا بنا دیتا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ایک ایسی خود اعتمادی سکھاتا ہے جو کسی خارجی سہارے کے بغیر اپنی اندرونی طاقت کے اوپر قائم ہوتی ہے۔ اس کا خزانہ آدمی کے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر، اور جس طاقت کی بنیاد اندرونی جذبہ پر ہو اس کو کوئی چھیننے والا کبھی چھین نہیں سکتا۔

……

﴿سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی وصیت﴾

سیدنا عمرؒ نے خلیفہ ہونے سے لے کر اڑھائی سال تک نظامِ خلافت کو چلانے کے لیے دن رات کوشش کی۔ اس کے تمام مفاسد اور خرابیوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی یہاں تک کہ خلافت کی گراں باری نے آپ کی کمر کو دوہرا کر دیا اور دن رات کی فکر نے آپ کے گوشت کو کھا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہو کر رہ گئے، لیکن دل مضبوط اور طاقتور تھا۔ لوگ برابر آپ کی خیر و برکت سے مستفید ہوتے رہے۔ آخر رجب سنہ ۱۰۱ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر اس ہستی عدم نما سے عدم ہستی نما کو انتقال فرما گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

آپ کی وفات کی وجوہات میں تاریخ میں دو روایات ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی وفات طبعی تھی اور دوسری یہ کہ شاہی خاندان کے افراد نے جب یہ محسوس کیا کہ آپ کی خلافت کا زمانہ جوں جوں لمبا ہوتا جا رہا ہے، آپ کی حکومتی پالیسیاں سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہیں، اور اگر آپ کا یہی طور طریقہ رہا تو جلد ہی اموی خاندان کی شاہانہ قوت ہمیشہ کے لیے دم توڑ دے گی، لہٰذا انہوں نے آپ کو راستہ سے ہٹانے کی ٹھان لی۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ آپ کے ایک غلام کو ایک ہزار دینار دے کر آپ کو زہر دلوا دیا۔ آپ کو اس بات کا علم ہو گیا، لیکن آپ نے غلام پر کوئی سختی نہ کی، صرف اس سے ایک ہزار دینار واپس لے کر ان کو بیت المال میں داخل کر دیا اور غلام کو آزاد کر دیا۔

طبیب کو بلایا گیا اس نے بھی زہر تشخیص کیا لیکن آپ نے علاج کروانے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ غلام کا راز فاش نہ ہو اور کوئی اس پر سختی نہ کرے۔ اور فرمایا:

> ”اگر مجھے یہ یقین ہو جاتا کہ میرے کان کی لو کے پاس میری شفا ہے تو بھی میں اس کے لیے ہاتھ نہ بڑھاتا۔“

بہر حال سبب طبعی ہو یا زہر خورانی، آپ کو جب زندگی سے مایوسی ہو گئی تو اپنے

بعد نامزد شدہ خلیفہ یزید بن عبدالملک کے لیے مندرجہ ذیل وصیت نامہ لکھوایا:

"میں تمہارے لیے یہ وصیت نامہ اس حالت میں لکھوا رہا ہوں کہ میں مرض سے نہایت لاغر ہو گیا ہوں۔ میرے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ قیامت کے روز امور خلافت کے بارہ میں مجھ سے سوال کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کا حساب لے گا اور میں اس سے اپنا کوئی فعل چھپا نہ سکوں گا۔ کیونکہ ارشاد خداوندی ہے

﴿فلنقصنّ عليهم بعلمٍ وّما كنا غائبين﴾

"ہم ان کو علم سے قصہ سناتے ہیں اور ہم غائب نہ تھے۔"

اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو گیا تو میں کامیاب و کامران ہوا اور ایک طویل عذاب سے نجات پائی، اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہوا تو میرے انجام پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ میں اس اللہ سے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، نہایت عجز و نیاز سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی رحمت سے عذاب جہنم سے نجات فرمائے اور اپنی رضا سے جنت الفردوس عطا فرمائے۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ تقویٰ اختیار کرنا اور رعایا کا خیال رکھنا کیونکہ میرے بعد تم صرف تھوڑے روز زندہ رہو گے۔ تم کو اس بات سے بھی سخت احتراز کرنا چاہیے کہ تم سے غفلت اور جہالت میں ایسی لغزش سرزد ہو جس کی تم تلافی نہ کر سکو۔ سلیمان بن عبدالملک اللہ کا ایک بندہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وفات دی اور اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھ کو خلیفہ بنایا اور میرے بعد تم کو ولی عہد مقرر کیا۔ میں جس حالت میں تھا اگر وہ اس لیے ہوتی کہ میں بہت سی بیویوں کا انتخاب کروں اور مال و دولت اکٹھا کروں تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس سے بہتر سامان مہیا کیے تھے جو وہ کسی بندہ کو مہیا کر سکتا ہے، لیکن میں سخت اور نازک سوال سے ڈرتا

ہوں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ میری دست گیری فرمائے۔"

جب آپ یہ وصیت لکھوا رہے تھے تو مسلمہ بھی آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آپ کے اہل وعیال کے بارہ میں آپ سے کہا:

"امیر المومنین! آپ نے اپنی اولاد کا اس مال و دولت سے ہمیشہ منہ خشک کر رکھا ہے اور آپ ان کو ایسی حالت میں چھوڑے جاتے ہیں کہ ان کے پاس دنیا کے مال ومتاع کا کچھ نہیں۔ آپ ان کے بارہ میں مجھے یا اپنے خاندان کے کسی اور شخص کو کچھ وصیت کر جائیں۔"

آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ "مجھے ٹیک لگا کر بٹھا دو۔" چنانچہ انہوں نے بٹھا دیا۔

پھر فرمایا:

"تمہارا یہ کہنا کہ اس مال سے میں نے ہمیشہ اپنی اولاد کا منہ خشک رکھا ہے، خدا کی قسم! میں نے ان کا کوئی حق تلف نہیں کیا، البتہ جو ان کا حق نہیں تھا وہ ان کو نہیں دیا۔ اور تمہارا یہ کہنا کہ میں تمہیں یا خاندان کے کسی اور فرد کو وصیت کرتا جاؤں، تو سنو! اس معاملہ میں میرا وصی اور ولی اللہ تعالیٰ ہے جو صلحاء کا ولی ہوتا ہے۔ میرے لڑکے اگر تقویٰ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی سبیل نکال دے گا۔ اور اگر وہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو ان کو گناہ کے لیے قوی اور طاقتور نہیں بناؤں گا۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے بچوں کو بلا کر نمناک آنکھوں سے فرمایا:

"جان پدر! میں تم پر قربان جن کو میں نے خالی ہاتھ چھوڑا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے تم کو اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ میرے بچو! تم کسی ایسے عرب اور ذمی سے نہ ملو گے جس پر تمہارا حق نہ ہو۔ عزیز بچو! دو باتوں میں سے ایک بات تمہارے باپ کے اختیار میں تھی۔ ایک یہ کہ تم متمول اور دولت مند ہو جاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے۔ دوسرے یہ کہ تم محتاج رہو اور تمہارا باپ

> جنت میں داخل ہو۔ ان دونوں باتوں میں اس کو یہ زیادہ پسند تھا کہ
> تم محتاج رہو اور وہ جنت میں جائے۔ اچھا اب جاؤ۔ اللہ تعالیٰ
> تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۲۸۰ از ابن جوزی)

آپ کی مدت خلافت دو سال اور چند ماہ ہے۔ وفات کے وقت عمر چالیس سال تھی۔ اس مختصر زمانے کو لوگ بڑا طویل زمانہ شمار کرتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں خلافت کی برکات ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں اور عدل و انصاف کی ہمہ گیری پوری مخلوق کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ کی اولاد میں سے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک شخص ہمارے پاس بہت سا مال لے کر آتا اور کہتا کہ یہ مال مستحق فقراء میں تقسیم کر دیں مگر اس مال کو لینے والا کوئی نہ ہوتا گویا کہ عمرؒ نے لوگوں کو مالدار بنا دیا تھا۔ صرف صدقہ فطر ہی مسلمانوں کے تمام فقراء اور مساکین کو کافی ہوتا تھا۔

……

﴿ربیعۃ الرائےؒ کی تعلیم و تربیت﴾

ربیعۃ الرائے کا تعلق تابعین سے ہے۔ ان کا نام ربیعہ تھا اور کنیت ابوعثمان۔ باپ کا نام فروخ۔ آپ کے والد فروخ قبیلہ بنی جرہ کے غلام تھے۔ اس غلام کے گھر میں ربیعہ پیدا ہوئے جو مستقبل میں اقلیم علم کے تاجدار بنے اور بڑے بڑے محدثین ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ ربیعہ بقول حافظ ذہبی امام بھی تھے، حافظ بھی تھے اور فقیہ و مجتہد بھی تھے۔ اور خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ وہ فقیہ تھے اور فقہ و حدیث کے حافظ بھی۔ رائے میں انہیں خاص بصیرت حاصل تھی۔ اس لیے انہیں ربیعۃ الرائے کہا جانے لگا۔

(ملاحظہ تذکرۃ الحفاظ ذہبی: جلد ۱ ص ۱۴۱، تاریخ بغداد: جلد ۸ ص ۴۲۱)

ان کی تعلیم و تربیت کے بارہ میں خطیب بغدادیؒ نے لکھا ہے:

> ”ابھی وہ شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کے والد ماجد فروخ کو خراسان کی مہم پر جانا پڑا، وہاں جا کر کچھ ایسے اتفاقات پیش آتے گئے کہ وہ ۲۷ برس تک اپنے وطن نہ آ سکے۔ ربیعہ کی والدہ نہایت عاقلہ، دانش مند اور عاقبت اندیش خاتون تھیں۔ انہوں نے ربیعہ کی پیدائش کے بعد بیٹے کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ کی کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ ان کا یہ اکلوتا بیٹا علم و فضل میں ایک بلند مقام حاصل کرے۔ چنانچہ شوہر کی غیر موجودگی میں انہوں نے اپنے صاحبزادے کو زیور تعلیم سے خصوصی طور پر آراستہ کیا اور اپنے شوہر کا کل اندوختہ جس کی تعداد تاریخ کے رپورٹر تیس ہزار دینار بتاتے ہیں: اپنے بیٹے کی تعلیم پر صرف کر دیا۔ ربیعہ خود بھی بڑے ذہین و فطین تھے، اس لیے انہوں نے بہت جلد اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ اور عنفوان شباب ہی میں وہ

جملہ علوم میں کامل و مکمل ہو گئے۔ اور ۲۶۔ ۲۷ برس کی عمر میں ان کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا اور دور دور سے لوگ ان کے درس میں آ کر شریک ہوتے اور وہ اس زمانہ میں مرجع خلائق بن گئے۔

۲۷ سال خراسان میں گذارنے کے بعد ان کے والد فروخ گھر واپس آئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ربیعہ نے دروازہ کھولا تو باہر ایک اجنبی کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور سخت برہم بھی ہوئے کیونکہ باپ بیٹا ایک دوسرے سے یک قلم ناآشنا اور ناواقف تھے۔ ربیعہ نے جب ایک اجنبی شخص کو جس کو انہوں نے ستائیس سال میں ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا، اور پھر وہ ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا، دیکھ کر سخت برہم ہوئے اور کہا: ''اے دشمن خدا! تو میرے گھر پر حملہ کرتا ہے اور اس میں زبردستی گھستا ہے۔'' فروخ نے جواب دیا: ''میں دشمن خدا نہیں بلکہ تو دشمن خدا ہے جو زبردستی میرے گھر میں گھسا ہوا ہے۔'' دونوں میں تکرار کچھ طویل ہو گئی جس کے نتیجہ میں دونوں باہم دست و گریباں ہو گئے۔ یہ شور اور ہنگامہ سن کر اڑوس پڑوس کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے اور دیکھا کہ دونوں باہم گتھم گتھا ہوئے ہوئے ہیں۔ ربیعہ فروخ کو پکڑے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ بخدا! میں تجھ کو کوتوال شہر کے پاس لے جائے بغیر نہ چھوڑوں گا کیونکہ تو مجھے اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ تو میرے گھر میں زبردستی گھسنا چاہتا ہے۔ کچھ اسی قسم کے الفاظ فروخ کی زبان پر تھے۔ نہ فروخ کو علم تھا کہ یہ میرا بیٹا ہے اور نہ ہی ربیعہ کو پتہ تھا کہ یہ اس کا حقیقی باپ ہے۔

ان دونوں میں تکرار ہو رہی تھی بلکہ زوروں پر تھی کہ سیدنا انس بن مالکؓ تشریف لے آئے اور فروخ سے فرمایا:

> ''بڑے میاں! آپ کسی دوسرے گھر میں ٹھہر جائیں۔ یہاں ٹھہرنے پر اصرار کریں۔''

اب فروخ نے اپنا تعارف کرایا کہ

> ''میں بنی فلاں کا غلام ہوں۔ میرا نام فروخ ہے اور یہ میرا اپنا گھر ہے۔''

جونہی یہ کلمات فروخ نے کہے تو ان کی اہلیہ نے اندرونِ خانہ ان کو سن لیا اور آواز سے بھی پہچان لیا۔ لہٰذا وہ گھر سے نکل کر اپنے بیٹے سے کہنے لگیں کہ یہ تمہارے والد ہیں۔ اور انہوں نے اپنے شوہر کو بھی بتایا کہ یہ کوئی اجنبی شخص نہیں جو تمہارے گھر میں رہتا ہے بلکہ یہ تیرا اپنا بیٹا ہے جسے تم حمل کی حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ اس حقیقت کے منکشف ہونے کے بعد دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے گلے مل کے خوب روئے اور فروخ نہایت عزت واحترام کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔

چند روز کے بعد فروخ نے اپنی اہلیہ سے اپنے اس تیس ہزار دینار اندوختہ کے بارہ میں پوچھا اور کہا کہ میرے پاس چار ہزار دینار مزید ہیں۔ بیوی کل رقم بیٹے کی تعلیم پر خرچ کر چکی تھی لہٰذا جواب دیا کہ ابھی ایسی جلدی کیا ہے؟ آپ کی رقم نہایت حفاظت سے ہے۔ اطمینان اور سکون سے بتاؤں گی۔ اس وقت ربیعہ الرائے کی ذات طالبانِ علم اور شائقین دانش کے لیے مرجع بن چکی تھی۔ مدینہ منورہ کی مسجد نبوی میں ان کا ایک وسیع حلقہ درس قائم تھا، جس میں نہ صرف مدینہ منورہ کے بڑے بڑے اربابِ علم اور عمائد و اشراف شریک ہوتے بلکہ دوسرے شہروں کے اربابِ علم و دانش بھی شامل ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بہت بڑا وسیع حلقۂ درس تھا۔ ربیعہ معمول کے مطابق مسجد تشریف لے گئے اور ان کی والدہ نے درس کا وقت معلوم کر کے شوہر سے کہا کہ ذرا مسجد نبوی میں جا کر نماز پڑھ آئیں۔ فروخ مسجد گئے تو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک شخص کے گرد لوگوں کا ہجوم لگا ہوا ہے۔ امام مالکؒ، حسن بن زیدؒ، ابن ابوعلی لہبی اور مساحقی وغیرہ مدینہ منورہ کے شرفاء اور اکابر حلقۂ درس میں شریک ہیں۔ فروخ یہ ہجوم بے کراں دیکھ کر قریب چلے گئے۔ لوگوں نے تھوڑا سا راستہ دے دیا۔ ربیعہ نے درس میں خلل پڑنے کے خیال سے سر جھکا لیا، لہٰذا فروخ انہیں نہ پہچان سکے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا: ”یہ کون بزرگ ہیں؟“ انہوں نے بتایا: ”یہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (یہ فروخ کی کنیت تھی) فروخ نے جونہی یہ سنا تو وہ مسرت سے بول اٹھے: ”خدا نے میرے لڑکے کو یہ رتبہ عطا کیا۔“ اور پھر

جا کر اہلیہ سے کہا: ”میں نے تمہارے لڑکے کو اس قدر بلند رتبے میں دیکھا ہے کہ اس سے قبل کسی صاحب علم فقیہ کو نہیں دیکھا تھا۔

شوہر کی زبان سے یہ اعتراف حقیقت سننے کے بعد اہلیہ نے کہا:

”اب بتاؤ، کیا چاہتے ہو، بیٹے کی یہ عظمت وشان یا پھر تیس ہزار اشرفیاں؟“

فروخ نے جواب دیا: ”بخدا! اپنے بیٹے کی عظمت وشان۔“

بیوی نے کہا: ”تو پھر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے تمہارا کل اثاثہ اس کی تعلیم میں صرف کر دیا ہے۔“

فروخ نے کہا: ”بخدا! میری کل دولت صحیح ٹھکانے لگی۔“

(تاریخ بغداد و خطیب بغدادی: جلد ۸ ص ۴۲۱،۴۲۲)

……

قول وعہد کی پابندی

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل بھی عربوں میں قول وعہد کی پابندی کا خاصہ موجود تھا۔ ان کا خواہ کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے وہ دشمن سے کیے ہوئے عہد کو بھی پورا کرتے تھے بلکہ اگر انہیں اپنی جان بھی قربان کرنی پڑتی تو وہ قول وعہد کی پابندی کے لیے اس سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ہمارے اس دعویٰ کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ سفر ہجرت میں جو خِرِّیت (ماہر سفر یا راہ نما) سیدنا صدیق اکبرؓ نے مقرر فرمایا تھا، اگرچہ وہ قریش کے ہم مذہب تھا اور اس کا نام عبداللہ بن اریقط تھا لیکن اس نے اپنا عہد و پیمان نبھاتے ہوئے پوری رازداری سے کام لیا اور قریش کے ہر قسم کے لالچ سے متاثر ہوئے بغیر پوری دیانت داری کے ساتھ حسب پروگرام اور حسب عہد دونوں حضرات کو مدینہ منورہ پہنچا دیا اور سو اونٹوں کی کوئی پرواہ نہ کی جو رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکرؓ کو پکڑوانے پر قریش مکہ نے مقرر کیے ہوئے تھے۔ آج کل کا کوئی شخص ہوتا تو اونٹوں کے اس لالچ میں عہد و پیمان کو توڑ دیتا اور ان دونوں کو پکڑوا کر انعام حاصل کر لیتا، لیکن تاریخ میں اس کی بدعہدی کی وجہ سے اس کا نام سیاہ حروف میں لکھا جاتا۔

اس سلسلہ میں علامہ مرزوقی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے قبیلہ مضر کے لیے قحط سالی کی دعا کی۔ سات سال تک بارش کا ایک قطرہ نہ برسا۔ خشک سالی سے مجبور ہو کر قبیلہ کے سردار حاجب نے اپنی قوم سے کہا کہ میں کسریٰ ایران کے پاس جاتا ہوں کیونکہ قحط کی تباہ کاریوں اور خشک سالی کی وجہ سے اب یہاں رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ قوم نے اس کی تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ وہ کسریٰ کے پاس گیا اور اس سے قحط سالی کے خاتمہ تک اس کے ملک میں رہنے کی اجازت طلب کی۔

کسریٰ نے اس کی درخواست کے جواب میں کہا: ”تم لوگ قزاقی اور غارت گری کے خوگر اور فتنہ و فساد کو پسند کرنے والے لوگ ہو۔ اگر تم میرے ملک میں سکونت

پذیر ہوئے تو تمہاری ان عادات بد کی وجہ سے میری قوم اور ملک کا سکون برباد ہوگا اور میں اپنی قوم کا سکون برباد نہیں ہونے دینا چاہتا۔ سردار قبیلہ نے کہا: ''میں اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ جب تک میری قوم تیرے ملک میں رہائش پذیر رہے گی کوئی ایسی نازیبا حرکت نہ کرے گی جس سے ملک کے امن وسکون میں کوئی ارتعاش پیدا ہو۔'' کسریٰ نے کہا: ''اس بات کا کوئی ضامن ہے؟'' حاجب نے کہا: ''میں اپنی اس بات کی ضمانت کے طور پر اپنی کمان تیرے پاس رکھتا ہوں۔''

کسریٰ کے لیے یہ بات بڑی انوکھی اور عجیب وغریب تھی۔ اس کی سمجھ میں کمان گروی رکھنے کا مطلب نہ آیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد حاجب اپنی کمان لے کر جب دربار میں داخل ہوا تو اہل دربار اس کمان کو دیکھ کر ہنس پڑے، لیکن کسریٰ نے کہا کہ ہمیں کمان کی ضمانت منظور ہے۔

تواریخ میں ہے کہ جتنا عرصہ حاجب اپنی قوم کے ساتھ ایران کے علاقہ میں رہا، قوم کے ہر فرد نے اپنے سردار کے اس عہد کا پاس رکھا اور کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کی جس سے عہد کی شکست وریخت ہوتی ہو اور ملک کا امن اور سکون پامال ہوتا ہو۔

کچھ سالوں کے بعد حاجب مر گیا اور قبیلہ مضر کو اللہ تعالیٰ نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرما دی اور سرکار دو عالم ﷺ کی دعا سے اس بدولت وہ ساری رونقیں واپس آ گئیں۔ تمام علاقہ سرسبز وشاداب ہو گیا۔ کھیت لہلہانے لگے، تالاب پانی سے بھر گئے۔ چنانچہ پورا قبیلہ ایران کے علاقہ کی سکونت چھوڑ کر واپس اپنے علاقہ میں آ گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد حاجب کا بیٹا عطارد کسریٰ کے پاس اپنے باپ کی رہن شدہ کمان لینے کے لیے گیا۔ کسریٰ نے کہا: ''وہ شخص جس نے یہ کمان گروی رکھی تھی، وہ تو کوئی اور تھا؟'' عطارد نے کہا: ''وہ میرا باپ تھا اور میں اس کا بیٹا ہوں۔ باپ تو فوت ہو گیا۔ میں اپنے باپ کی کمان لینے آیا ہوں۔'' کسریٰ نے وہ کمان اسے واپس کر دی اور معاہدے کے ایفا کی خوشی میں اس کو خلعت فاخرہ بھی عطا کی۔

قول وعہد کی یہ پابندی صرف افراد تک ہی محدود نہ تھی بلکہ قبائل کے مابین بھی

جو معاہدات ہوتے اس کی بھی پوری پوری پابندی کی جاتی۔ اگرچہ جزیرہ نمائے عرب میں کوئی منظم حکومت نہ تھی پھر بھی قبائل کے درمیان باہمی عہد وپیمان کی پابندی نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا تھا جو اپنے اندر ایک باضابطہ حکومت کی طاقت اور قوت رکھتا تھا۔ چنانچہ لوگوں کے جان ومال کی حفاظت اور بیرونی حملہ آوروں کا دفاع، ان سب تحفظات کا ذمہ یہ معاہداتی نظام تھا۔

ان لوگوں کو جھوٹ سے خاص نفرت تھی اور ایک جھوٹے آدمی کو وہ بڑا ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے۔ جاہلیت کی تاریخ میں ایسے کئی واقعات ہیں کہ اہل عرب نے اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی دے کر بھی اپنے عہد کو وفا کیا اور اپنے قول کی لاج رکھی۔ اس سلسلہ میں صاحب بلوغ الادب نے ایک واقعہ سموؤل ابن حبان کا نقل کیا ہے۔

امراؤ القیس جب قیصر روم کی ملاقات کے لیے گیا تو اس نے اپنی زرہیں امانت کے طور پر سموؤل بن حبان کے پاس رکھیں۔ امراؤ القیس مر گیا تو شام کے کسی بادشاہ نے امراؤ القیس کی وہ زرہیں لینے کے لیے سموؤل پر چڑھائی کر دی۔ سموؤل قلعہ نشین ہو گیا اور اپنے قلعہ کے دروازے نہایت مضبوطی سے بند کر لیے۔ بدقسمتی سے سموؤل کا ایک لڑکا قلعہ سے باہر رہ گیا جس کو بادشاہ نے گرفتار کر لیا۔ بادشاہ نے سموؤل کو آواز دی اور کہا کہ اگرچہ تو قلعہ نشین ہو گیا ہے لیکن دیکھو تمہارا یہ لڑکا میرے قبضہ میں ہے، اور تمہیں علم ہے کہ امراؤ القیس میرا چچا زاد بھائی تھا اور میں اس کی میراث کا دوسروں سے زیادہ حق دار ہوں، لہٰذا اگر تو نے اس کی زرہیں میرے حوالے نہ کیں تو میں تیرے اس بیٹے کو قتل کر دوں گا۔ سموؤل اپنے بیٹے کو اس ظالم کے ہاتھ میں دیکھ کر سخت پریشان ہوا اور اس نے غور وفکر کے لیے کچھ مہلت مانگی۔ بعد میں اس نے قلعہ میں اپنے اعزا واقربا اور خواتین خانہ سے صلاح ومشورہ کیا۔ سب نے یہی مشورہ دیا کہ زرہیں اس کے حوالہ کر کے اپنے بیٹے کی جان بچاؤ۔ جب صبح ہوئی تو سموؤل نے قلعہ کی فصیل سے جھانک کر بادشاہ کو آواز دی اور کہا:

> ”اے بادشاہ! میں کسی قیمت پر تمہیں وہ زرہیں نہیں لوٹاؤں گا۔ تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے، کر لے۔“

بادشاہ نے اسی وقت اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا لیکن سموئل نے وہ زرہیں اسے نہ دیں، اور بادشاہ بے نیل و مرام واپس چلا گیا۔ بادشاہ کے واپس جانے کے بعد سموئل وہ زرہیں لے کر امراؤ القیس کے اہل خانہ کے پاس گیا اور وہ زرہیں اس کے ورثاء کے سپرد کر دیں۔ چنانچہ اس کے کچھ شعر ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

> "میں نے امراؤ القیس الکندی کی زرہیں اس کے وارثان کو پہنچا دیں جن حالات میں دوسری قومیں خیانت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میں ان حالات میں بھی اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں۔"

* * *

﴾بار خلافت نے زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا﴿

سلیمان بن عبدالملک اموی وابق میں مقیم تھا کہ یہیں مرض الموت میں مبتلا ہو گیا۔ اس وقت تک ولی عہد کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی اور وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس وقت کے مشہور محدث رجاء بن حیوہ کندیؒ جو اس وقت اس کے ساتھ تھے، نے کہا:

> ”امیر المومنین! خلیفہ کسی صالح، نیک اور امین و دیانت دار شخص کو بنانا چاہیے تاکہ قبر میں امن اور قیامت کے روز خجالت و ندامت نہ اٹھانی پڑے۔“

سلیمان بن عبدالملک میں اگرچہ کچھ خرابیاں بھی تھیں لیکن ویسے وہ نیک فطرت اور سلیم الطبع شخص تھا، لہٰذا محدث رجاء بن حیوہؒ کی یہ بات اس کے قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں گھر کر گئی۔ وہ اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے لگا جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں کیا تھا یا اس آخرت کی جواب دہی کے نظریہ کے تحت نہ کیا تھا۔ لہٰذا اس نے رجاء بن حیوہؒ کے مشورہ کے تحت اور واقعات کے نشیب و فراز کو دیکھتے ہوئے سلیمان نے عمر بن عبدالعزیزؒ کو خلیفہ نامزد کر دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ وصیت نامہ تحریر کیا:

> ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: یہ تحریر خدا کے بندے سلیمان بن عبدالملک امیر المومنین کی طرف سے عمر بن عبدالعزیز کے لیے ہے۔ میں اپنے بعد آپ کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں اور آپ کے بعد یزید بن عبدالملک کو، لہٰذا مسلمانو! ان کا کہنا سننا اور ان کے احکام کی اطاعت کرنا۔ اللہ تعالیٰ سے ہر حالت میں ڈرتا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا کہ دوسرے لوگ آپ پر حرص و آز کی نگاہ ڈالیں۔“

یہ وصیت نامہ سربمہر کر کے محدث رجاء بن حیوہ کے حوالے کر دیا گیا اور حکم دیا

کہ وہ خاندان کے لوگوں کو اکٹھا کر کے بغیر نام ظاہر کیے ان سے نامزد خلیفہ کی بیعت لے لیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اس طرح سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ مقرر ہو گئے۔

لیکن جونہی خلافت کا بارِ گراں ان کے بار دوش ہوا عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ عمر جن کی گورنری پر تقرر کے وقت تیس اونٹ ان کا ذاتی سامان اٹھا کر لائے تھے۔ (یعقوبی، جلد ۲ ص ۳۳۹) جن کی خوش لباسی اور نفاست طبع کا یہ حال تھا کہ جس لباس پر ایک مرتبہ کسی کی نظر پڑ جاتی تھی پھر اسے زیب تن نہ فرماتے تھے۔ خوشبویات کے شوق کی وجہ سے داڑھی پر عنبر کا سفوف چھڑکتے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ خوش لباس آدمی تصور کیے جاتے تھے اور محدث رجاء بن حیوۃ کا بیان ہے کہ آپ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ خوش لباس، خوشبویات کے دلدادہ اور متکبر کی چال چلنے والے تھے۔ لیکن جونہی خلافت کی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑا اور مسند خلافت پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی سیدنا ابوذر غفاریؓ، سیدنا ابوہریرہؓ اور دیگر درویش صفت صحابہ کرامؓ کا قالب اختیار کر لیا۔ دل کی دنیا بدلنے کے ساتھ ظاہری دنیا بھی بدل گئی۔ اب نہ وہ زرق برق کا لباس تھا اور نہ وہ مشک و عنبر کی خوشبویات تھیں۔ بارِ خلافت نے آخری ضرب لگائی تو یکایک آنکھیں کھل گئیں اور اب دوسرے ہی عالم کی ہوش ربائیاں تھیں۔ نہ وہ آسمان تھا، نہ زمین تھی، نہ وہ آفاق تھا نہ انفس، انقلاب قوموں میں ہو یا افراد میں، پہلے سطح پر نہیں بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے، اور دل و دماغ میں انقلاب آنے کے بعد پھر انسان یوں سمجھتا ہے کہ زندگی کا مزہ انہی کو ملتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے گھونٹ بھی لیتے رہتے ہیں، کیونکہ یہاں پانے کا مزہ انہی کو ملتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنہوں نے کچھ کھویا نہیں انہیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں؟

مختصر یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ چنانچہ سلیمان بن عبدالملک کی تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد حسب معمول جب آپ کو شاہی سواری پیش کی گئی تو آپ نے وہ واپس کر دی اور فرمایا: ”میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔“

گھر پہنچے تو اس بارِ گراں کی ذمہ داری سے چہرہ پریشان تھا کیونکہ اب عمر بن عبدالعزیزؒ فکری، فطری اور عملی لحاظ سے بدل چکے تھے۔ دلوں کی اقلیم میں مفتوں اور ملکوں

کے اندر انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے انقلاب سے اس دنیا کے انقلابات وابستہ ہیں۔ قلب کی سرزمین میں امید وطلب کے بے شمار درخت اگتے ہیں اور بہاروں کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں، لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ہو، ان کے لیے بہار وخزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں، کوئی موسم بھی انہیں شادابی کا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے قلب کی جڑیں مضبوط وتوانا تھیں، اس وجہ سے خلافت کا بارگراں پڑتے ہی پریشانی اور رنج وغم کی گھنگور گھٹائیں قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں امنڈ آئیں اور اس کے آثار چہرہ پر بھی نظر آنے لگے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ اگرچہ نامزد تھے لیکن اپنے کو خلیفہ سمجھتے تھے، شخصی حکمران نہیں سمجھتے تھے جس کو نہ دنیا کی فکر ہوتی ہے اور نہ آخرت میں مسئولیت کا کچھ خوف۔ کیونکہ شخصی حکمرانوں کے سر پر تاج ہوتا ہے، لیکن پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ ان کے تمام جذبات تاج کی حفاظت کے تحت ہوتے ہیں اور اس بارہ میں وہ گویا انسان کی عام فطری جبلت کے علاوہ ایک ہی جنس خاص بن جاتے ہیں۔

علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ جونہی گھر پہنچے تو پریشان حال اور کبیدہ خاطر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کوہ گراں آپ پر ڈال دیا گیا ہے۔ خادم نے پوچھا: "خیر ہے، آپ اس قدر متفکر کیوں ہیں؟" فرمایا: "اس سے بڑھ کر فکر وتشویش کی کیا بات ہوگی کہ مشرق و مغرب میں رسول اللہ ﷺ کی امت کا کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس کا حق مجھ پر نہ ہو اور بغیر مطالبہ و اطلاع کے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔" (سیرۃ عمر بن عبدالعزیزؒ از ابن جوزی: ۵۲)

یہ سارے واقعات حافظ ذہبیؒ نے اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء، جلد ۵ ص ۱۱۷۔ ۱۲۶ تک نقل کیے ہیں۔

* * *

عربوں کی جود وسخا

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل بھی عربوں میں کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی تھیں جو دنیا کی کسی قوم میں نہیں تھیں۔ ان کی اپنی ایک تہذیب تھی، ایک تمدن تھا، ایک ادب تھا، ایک ثقافت تھی جس کی وجہ سے تمام دنیا میں وہ اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ صرف انہی کو پوری دنیا میں یہ حق حاصل تھا کہ وہ خالص النسل اور محفوظ النسب ہونے کا دعویٰ کریں۔ ان کے نہ صرف اپنے نسب محفوظ تھے بلکہ انہیں اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب بھی ازبر تھے۔ ان کے اونٹ ان کے صحرا کے جہاز تھے اور ریت کے سمندر کے سینے پر ان کے یہ جہاز رینگتے اور مشرق کی آخری سرحدوں تک ان کو پہنچاتے تھے۔

قول وعہد کی پابندی ان کی گھٹی میں تھی اور بعض دفعہ تو اپنے عہد کی پابندی کے لیے وہ اپنی تمام قوت اور اپنے تمام وسائل وقف کر دیتے تھے بلکہ بعض دفعہ جان کی بازی بھی ہار دیتے۔

جود وسخا میں تو وہ تمام زمانہ میں مشہور تھے اور یہ ان کی تمام دنیا میں ایک امتیازی خصوصیت تھی۔ ایک معمولی عرب جس کا کل اثاثہ اور کل کائنات ایک اونٹنی ہوتی، وہ بھی اپنے مہمان کی خاطر ومدارات کے لیے اس کو ذبح کر کے خوشی اور مسرت محسوس کرتا تاکہ وہ دل کھول کر اپنے مہمان کی مہمان داری کر سکے۔

قبیلہ طے کا سردار حاتم جو دنیا میں اپنی سخاوت کی وجہ سے مشہور تھا، جزیرہ نما عرب ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ کتابوں میں ہے کہ ایک روز وہ بالکل تہی دست اور فاقہ مست تھا۔ رات ہوئی تو اس نے کسی طریقہ سے اپنے بچوں کو بھوکے سلا دیا۔ جب بچے سو گئے تو حاتم کے خیمہ میں ایک عورت داخل ہوئی اور فریاد کی کہ وہ خود بھی بھوکی ہے اور اس کے بچے بھی بھوک سے نڈھال ہیں۔ رات کا چاند رینگ کر اپنی آدھی منزلیں طے کر چکا ہے

لیکن بھوک کی وجہ سے اس کی اور اس کے بچوں کی آنکھیں نیند سے ناآشنا ہیں۔ اس عورت کی یہ بات سن کر حاتم اٹھا اور اپنے پسندیدہ اور محبوب گھوڑے کو ذبح کر ڈالا اور عورت کے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے گوشت کے پارچے جتنے وہ لے جا سکتی تھی، اس کو دیے۔ پھر حاتم نے قرب و جوار کے لوگوں میں باقی ماندہ تمام گوشت تقسیم کروا دیا، لیکن حاتم اور اس کے بچے جیسے بھوکے تھے ویسے ہی بھوکے رہے اور ایک بوٹی بھی ان کے حصہ میں نہ آئی۔ سخاوت کا یہ جذبہ کہ خود اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر دوسروں کے بچوں کا پیٹ بھرنا صرف عربوں ہی میں تھا۔ دنیا کی اور کسی قوم میں ایثار و قربانی کا یہ جذبہ نہ تھا۔

(العقد الفرید: جلد ۱ ص ۱۰۸)

بعض کتابوں میں یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ حاتم کی بیوی نے اپنے شوہر کی سخاوت کے بارہ میں بتایا کہ ایک مرتبہ شدید قحط پڑا۔ کھانے کے لیے انسانوں کو روٹی اور جانوروں کو چارہ نہیں ملتا تھا۔ ہمارے سب جانور ہلاک ہو گئے۔ ایک رات ہم سب بھوکے سوئے۔ ہمارے بچے بھوکے پیٹ ہونے کی وجہ سے رو رہے تھے۔ حاتم نے اپنے بیٹے عدی کو بہلانا شروع کیا۔ میں نے اپنی بیٹی کو بہلانا شروع کیا تاکہ یہ دونوں سو جائیں۔ چنانچہ میں نے ظاہر کیا کہ میں سو گئی ہوں حالانکہ میں سوئی نہیں تھی کیونکہ مجھے حاتم کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ حاتم کو میرے سونے کا یقین ہو گیا۔ حاتم خیمہ میں پڑا دور دور تک غور سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے ایک سایہ قریب آتا دکھائی دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ ایک عورت تھی جو یہ کہہ رہی تھی کہ اے سفانہ کے باپ! میں روتے اور بلکتے بچوں کو چھوڑ کر آئی ہوں۔ میری کچھ مدد کرو۔ حاتم نے کہا: ”جاؤ، ان بچوں کو یہاں لے آؤ۔ میں انہیں پیٹ بھر کے کھلاؤں گا۔ وہ عورت بچوں کو لینے کے لیے چلی گئی۔ میں نے اٹھ کر حاتم سے کہا یہ تو نے کیا کہا، ہمارے تو اپنے بچے بھوک سے بلکتے ہوئے سوئے ہیں، لیکن اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے گھوڑے کو جا کر ذبح کیا، اس کے گوشت کو بھونا اور اس عورت سے کہا کہ اپنے بچوں کو خوب کھلاؤ اور خود بھی کھاؤ۔ پھر مجھ سے کہا: ”تم بھی اپنے بچوں کو جگا کر لے آؤ اور انہیں بھی پیٹ بھر کے

کھلاؤ۔" حاتم نے پھر کہا: "بخدا! یہ نہایت رذالت اور کمینگی ہے کہ تم لوگ کھاؤ اور میرے قبیلے والے بھوکے سوئیں۔ چنانچہ اس نے قبیلہ کے ہر گھر میں جا کر ان کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی، اور کہا کہ جہاں آگ جل رہی ہے وہاں تشریف لائیں اور میری ضیافت میں شریک ہو کر میری عزت افزائی کریں۔ قبیلے کے سب لوگ آئے اور خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ جب سب لوگ کھا رہے تھے حاتم اپنی چادر سے اپنا منہ ڈھانپ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا تمام لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھایا لیکن حاتم جیسے بھوکا تھا ویسے ہی بھوکا رہا، اور اس نے ایک لقمہ بھی اپنے منہ میں نہ ڈالا۔ (بلوغ الارب: جلد ۱ ص ۷۳)

یہ بات صرف حاتم طائی تک محدود نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی لوگ جود و سخا میں بہت مشہور تھے بلکہ ہر عرب بخل کو ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ ان کا مقولہ تھا:

﴿ای داء ادوء من البخل﴾

"یعنی بخل سے زیادہ خراب اور کوئی بیماری نہیں ہے۔"

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے والد ابوقحافہ کا چچازاد بھائی عبداللہ بن جدعان تھا۔ اس کے پاس کھانے کا بہت بڑا برتن ہوتا تھا جو ہر وقت کھانے سے بھرا رہتا تھا۔ وہ برتن اتنا بڑا تھا کہ ایک شتر سوار اپنے اونٹ پر بیٹھ کر اس میں سے کھانا کھا سکتا تھا۔ ایک دفعہ بچہ اس میں گر پڑا اور ڈوب گیا۔

مہمان نوازی کی ایسی ہی ضیافتوں کے بارہ میں ایک عورت فخریہ طور پر اپنے شوہر کی یہ خصوصیت بیان کرتی ہے کہ

> "جس کے اونٹ ہر وقت اصطبل ہی میں موجود رہتے ہیں صرف تھوڑے سے اونٹ چراگاہوں میں چرنے کے لیے بھیج دیئے جاتے ہیں۔ یہ اونٹ جیسے ہی باجے کی آواز سنتے ہیں تو انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب ذبح ہو جائیں گے۔"

جنگ بدر میں قریش کے جو بڑے بڑے سردار مارے گئے تھے اور بعد میں انہیں بدر کے کنویں میں پھینکا گیا ایک شاعر ابوبکر بن شعوب نے ان کے مرثیہ میں ان کی

مہمان داری کی بہت تعریف کی ہے کہ یہ لوگ دعوت کے موقع پر اپنے مہمان کو کوہان کے پارچے اور کباب آبنوس کی کشتیوں میں سجا کر پیش کرتے تھے۔

وماذا بالقليب قليب بدر
من الشيزى تزين بالسنام
وماذا بالقليب قليب بدر
من القينات والشرب الكرام

یعنی بدر کے کنویں میں وہ سردار پڑے ہوئے ہیں جن کے ہاں آبنوس کی کشتیاں نما طشت دعوت کے موقع پر مہمانوں کو پیش کی جاتی تھیں جو اونٹ کے کوہان کے گوشت سے آراستہ ہوتی تھیں۔

بدر کے اس کنویں میں وہ سردار پڑے ہوئے ہیں جن کے ہاں معززین کے اجتماع میں گانے والیاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں اور شراب کا دور چلتا۔

عربوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ وہ رات کے وقت اونچے اونچے ٹیلوں پر آگ جلا دیا کرتے تھے تاکہ اگر رات کے وقت کسی مسافر کا وہاں سے گذر ہو تو وہ اس آگ کو دیکھ کر یہاں کے لوگوں کے خیموں تک پہنچ سکے، اور جب کوئی بھولا بھٹکا مسافر رات کے وقت ان کے ہاں پہنچ جاتا تو وہ اس کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھتے۔

کبھی کبھی یہ لوگ بجائے آگ جلانے کے عود اور دوسری خوشبودار چیزیں جلاتے تاکہ وسیع و عریض صحرا میں ہوا کے جھونکے اس کو دور دور تک پھیلا دیں اور مسافر اس خوشبو کو سونگھ کر ان کے پاس پہنچ جائے اور وہ اس کی مہمان نوازی کر کے لطف اندوز ہوں۔

بعض لوگوں نے اس مقصد کے لیے کتے پال رکھے تھے جو رات کی خاموشی اور سناٹے میں بھونکتے اور دور دراز تک ان کی آوازیں شب کے صحرا نوردوں اور رات کے مسافروں کو ان کے خیموں تک پہنچا دیتیں، اور وہ ان کی مہمانی کر کے اپنی روح کو سکون

بخشتے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنے بیٹے کو اپنے کتے کے بارہ میں وصیت کرتا ہے کہ

> "اے میرے بیٹے! میں تجھے اپنے کتے کے بارہ میں وصیت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیونکہ اس میں بعض خوبیاں ایسی ہیں جن کو میں بہت پسند کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ جب رات سیاہ چادر اوڑھ لیتی ہے تو یہ میرے مہمان کو اس وقت میرے پاس لے کر آتا ہے کیونکہ اس وقت آگ جلانے والے سو جایا کرتے ہیں۔"

……◆……

نقل مطابق اصل

جب تک نقل بھی اصل کے مطابق نہ ہو کوئی شخص اس کو لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ آج کل تو ہر شے دو نمبر مارکیٹ میں آ گئی ہے یہاں تک کہ علماء اور صوفیاء بھی دو نمبر پیدا ہو گئے ہیں۔ جس شخص کو دو نعتیں یاد ہو جائیں وہ اپنے کو نعت خوانوں میں شمار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جس شخص کو دو حدیثیں یاد ہو جائیں وہ اپنے کو امام بخاریؒ یا پھر محدثین میں سے شمار کرنا شروع کر دیتا ہے اور جس کو ہا و ہو کرنا آ جائے وہ اپنے کو جنید بغدادیؒ یا بایزید بسطامیؒ تصور کر لیتا ہے۔ لیکن گذشتہ زمانے میں اصل اصل ہوتی تھی اور نقل نقل، اور ہر شخص کو اصل اور نقل کے مابین فرق محسوس ہوتا تھا، مگر یہ کہ کسی نے بہروپ بھرا ہوا ہو تو یہ الگ بات ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک بہروپیے کی حکایت نقل کی ہے جس سے کئی سبق حاصل ہو سکتے ہیں۔ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

> "اورنگ زیب عالمگیر جب تخت نشین ہوا اور لوگوں کو انعام تقسیم ہوا تو ایک بہروپیا بھی آیا۔ عالمگیر نے اس کو پہچان لیا کہ یہ بہروپیا ہے اور یہ فرمایا کہ جب تم کوئی ایسا بہروپ بدلو گے تب انعام لے گا۔ وہ چلا گیا اور اس کے بعد مختلف وقتوں میں مختلف بہروپ بدل کر آیا، مگر عالمگیر دھوکے میں نہ آئے اور ہر بار اس کو پہچان لیا۔ وہ پریشان تھا کہ بادشاہ میرے بہروپ کو پہچان لیتا ہے۔
>
> اس بہروپیے کو معلوم ہوا کہ بادشاہ فلاں مہم پر جانے والے ہیں۔ وہ کچھ مدت قبل اس مہم کے راستہ میں ایک گاؤں میں جا کر مقیم ہو گیا اور درویشانہ لباس اور درویشانہ صورت بنا کر وہاں رہنے لگا۔ گاؤں اور گرد و نواح کے تمام علاقوں میں اس کی شہرت ہو گئی کہ کوئی بہت بڑا درویش اور اللہ والا آیا ہوا ہے۔ چنانچہ لوگوں کا ایک ہجوم

اس کے پاس ہر وقت موجود رہتا تھا۔

بادشاہ عالمگیرؒ جب اس مہم پر جا رہے تھے اور وہ اس گاؤں کے قریب پہنچے تو وزیر نے بتایا کہ یہاں ایک اللہ والے بزرگ اور درویش رہتے ہیں۔ عالمگیرؒ کو چونکہ درویشوں سے محبت تھی لہٰذا فرمایا کہ ہم ضرور ان سے ملاقات کریں گے۔ چونکہ مہم پر جا رہے تھے اس وجہ سے اس اللہ والے سے دعا کرانا بھی مقصود تھا۔ چنانچہ وزیر کو ساتھ لیا اور بغرض ہدیہ کچھ اشرفیاں لے کر اس بزرگ کی خدمت میں پہنچے۔ ملاقات ہوئی، اور تصوف کے بارہ میں عالمگیرؒ نے کچھ مسائل دریافت کیے جس کا جواب اس نے تسلی بخش دیا۔ یہ لوگ اپنے فن کی تکمیل کے لیے سب کچھ سیکھا کرتے تھے۔ اس کے بعد عالمگیرؒ نے وزیر کو اشارہ کیا۔ وزیر نے اشرفیوں کی شکل میں ہدیہ پیش کیا۔ اس نے وہ ہدیہ قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔ اس پر عالمگیرؒ کی عقیدت میں اور اضافہ ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ یہ واقعی کوئی اللہ والا کامل درویش ہے جو بادشاہوں کا ہدیہ بھی قبول نہیں کرتا۔

عالمگیرؒ جب اس سے واپس ہوئے تو پیچھے پیچھے یہ بھی ذرا فاصلہ سے ہو لیا۔ جب عالمگیرؒ دربار میں بیٹھے تو اس نے بھی پیش ہو کر جھک کر سلام کیا۔ عالمگیرؒ نے دیکھ کر غور کیا تو پہچانا اور اس کے کمال فن کا اقرار کیا اور انعام دیا مگر معمولی جیسا ان لوگوں کو ملا کرتا ہے۔ اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور سلام کیا۔ عالمگیرؒ نے اس سے پوچھا کہ ہم اس وقت جو دے رہے تھے اب اتنا تھوڑا ہی دے سکتے ہیں لیکن اس وقت کیوں نہیں لیا۔ عرض کیا کہ حضور اب جو بھی عطا فرمایا ہے وہی میرے لیے سب کچھ ہے۔ باقی اس وقت لینے سے میرے کمال میں یعنی فن نقالی میں کھنڈت پڑتی۔ وہ نقل صحیح نہ ہوتی کیونکہ نقل صحیح وہی ہوتی ہے جو اصل کے مطابق ہو اور یہ بات درویشی کے خلاف ہے کہ وہ دنیا کو حاصل کریں۔ اور میں نے ان کی صورت بنائی تھی، اگر لیتا تو نقل صحیح نہ ہوتی۔ عالمگیرؒ کو اس کی اس بات کی بڑی ہی قدر ہوئی اور مکرر انعام دیا۔ (الافاضات یومیہ۔ جلد ۳ ص ۳۰۷)

مسلمان کتنے زیادہ اور بازنطینی کتنے کم

''مسلمان کتنے زیادہ اور بازنطینی کتنے کم'' یہ الفاظ اسلام کے اس جرنیل کے ہیں جس نے اپنی پوری زندگی کبھی شکست کا منہ نہ دیکھا۔ اور یہ جرنیل سیدنا خالد بن ولیدؓ تھے اور یہ الفاظ انہوں نے رومی فوج کے مقام میں جنگ یرموک میں کہے تھے۔

صفر ۱۳ھ میں سیدنا ابوبکرؓ نے اکابر صحابہ کرامؓ کی ایک مجلس مشاورت طلب فرمائی اور اس میں آپ نے شام پر حملہ کرنے کے بارہ میں اپنا پلان بیان فرمایا۔ سب حاضرین نے بیک آواز کہا:

> ''اے خلیفہ رسول ﷺ! آپ کی اطاعت ہم پر واجب ہے، لہٰذا آپ جو حکم کریں گے اس کو بجالایا جائے گا۔''

اس پلان کے تحت چار لشکر تیار کیے گئے جن کی قیادت سیدنا عمرو بن العاصؓ، سیدنا ابوعبیدہ بن الجراحؓ، سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ اور سیدنا شرحبیل بن حسنہؓ کر رہے تھے۔ ان لشکروں کو مختلف راستوں سے بھیجا گیا اور ان کی مجموعی تعداد تیس (۳۰) ہزار تھی۔

قیصر روم نے ایک لشکر جرار جس کی تعداد لاکھوں میں تھی مسلمانوں کے مقابلہ میں بھیجا۔ مجاہدین اسلام کو جب ان لشکروں کی تعداد اور ان کے جدید اسلحہ کا علم ہوا تو انہیں اپنی تعداد کی کمی کی وجہ سے کچھ اندیشہ ہوا، چنانچہ انہوں نے بارگاہِ خلافت میں دشمن کی کثرت تعداد کی اطلاع دی، لیکن بارگاہِ خلافت سے یہ جواب آیا کہ

> ''تم سب ایک جگہ اکٹھے ہو جاؤ اور اپنی قلت تعداد کا غم نہ کرو۔ تم اللہ کے دین کے مددگار ہو۔ وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا، اور تم سب یرموک میں جمع ہو جاؤ۔''

سیدنا ابوبکرؓ نے عراق سے خالدؓ کو ان کی مدد کے لیے بلایا۔ یہ نو ہزار کا لشکر لے کر منزلوں پر منزلیں طے کرتے اور مختلف شہروں کو فتح کرتے ہوئے یرموک پہنچ گئے۔

مسلمانوں کی فوج کے چار جرنیل پہلے سے موجود تھے اور پانچویں خالد بن ولیدؓ عراق سے آ گئے۔ ان پانچوں نے مل کر جنگی چالیں سوچیں اور متفقہ طور پر سب نے سیدنا خالد بن ولیدؓ کو امیر لشکر منتخب کیا۔ سیدنا خالدؓ نے ایک نئے ڈھنگ سے مسلمان فوج کو میدان میں اتارا۔ سارا لشکر ۳۶ دستوں میں تقسیم کیا گیا اور قلب لشکر اور میمنہ اور میسرہ پر مختلف جرنیلوں کو مقرر کیا گیا۔

اسلامی لشکر کی صف آرائی کے دوران کسی شخص کے منہ سے نکل گیا:

"بازنطینی کتنے زیادہ اور مسلمان کتنے کم ہیں۔"

سیدنا خالدؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا:

> "مسلمان کتنے زیادہ اور بازنطینی کتنے کم ہیں۔ مسلمانو! یاد رکھو، فوجیں تعداد کی کثرت سے نہیں ہمت اور جرأت کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوتی ہیں۔ خدا کی مدد ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے جو بہادر اور جرأت مند ہوتا ہے۔ الحمد للہ! ہم بہادر بھی ہیں، جرأت مند بھی ہیں اور صاحب ایمان بھی۔ ہم سے کون مقابلہ کرے گا۔"

جونہی لشکر آمنے سامنے ہوئے اور قاری لشکر سیدنا مقداد بن اسودؓ نے سورۃ الانفال کی تلاوت کی تو مجاہدین اسلام کے دلوں کی گہرائی میں کلام الٰہی کا ایک ایک حرف اترتا چلا گیا۔ احساس حمیت دمک اٹھا۔ دل میں خدا کی یاد کا چشمہ ابلنے لگا۔ زبان پر اللہ کا نام ترنم ریز اور دست و بازو میں شیر جبریل کی طاقتیں سمٹ آئیں۔ طبل جنگ بجنے پر سرفروش اور جاں نثار شیروں کی طرح آگے بڑھے اور چیتوں کی طرح جھپٹے۔ ہاتھوں میں تلواریں بجلی کی طرح کوندنے لگیں اور حریفوں کو جان کے لالے پڑنے لگے اور بازنطینیوں کی سٹی گم ہو گئی۔

اور سیدنا خالدؓ سپہ سالار لشکر کا تو عجیب حال تھا۔ آخر سیف اللہ (اللہ کی تلوار) تھے اور اللہ کی تلوار کو نہ تو کوئی توڑ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کند کر سکتا ہے۔ وہ قلب لشکر میں گھس کر حملہ آور ہوتے۔

جرجہ (George) ایک رومی عیسائی تھا۔ خالدؓ کی بے مثال شجاعت اور بے پناہ

عزم وحوصلہ سے وہ بہت متاثر ہوا، اور امان پکار کر سیدنا خالدؓ کے سامنے آیا اور سیدنا خالدؓ کو پاس بلا کر پوچھنے لگا: ”خالد! ایک بات بتاؤ؟ کیا تمہارے نبیؐ پر آسمان سے کوئی تلوار اتری تھی؟“ سیدنا خالدؓ نے جواب دیا: ”نہیں۔“ جرجہ نے کہا: ”پھر آپ کو اللہ کی تلوار کیوں کہا جاتا ہے؟“ سیدنا خالدؓ نے جواب دیا: ”اس لیے کہ ہمارے نبی ﷺ نے میرے لیے نصرت خداوندی کی دعا فرمائی تھی۔ میں مشرکوں کے لیے اللہ کی تلوار ہوں۔“ جرجہ نے کہا:

> ”بے شک تم درست کہتے ہو، اور تمہاری بہادری اور جرأت اس کی زندہ مثال ہے۔“

خالدؓ کی باتوں اور ان کی جرأت و ہمت نے جرجہ کے دل پر خاص اثر کیا۔ اس نے اپنی ڈھال کو پلٹ دیا جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کے خیالات میں تبدیلی آ گئی ہے۔ اور جرجہ عیسائی سے مسلمان ہو گیا۔ یہ رومیوں کے مقدمۃ الجیش کا امیر تھا۔

اس جنگ میں خالدؓ اور اس کے ساتھیوں نے شجاعت و بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ حریف انگشت بدنداں تھا۔ چار سو مسلمانوں نے باہم مل کر عہد کیا تھا کہ میدان جنگ میں شہید ہو کر رہیں گے۔ ان میں سے اکثر نے جام شہادت نوش کیا۔ ابوجہل کے بیٹے سیدنا عکرمہؓ ایک دستے کے سردار تھے۔ انہوں نے اپنے دستے کو آواز بلند کہا:

> ”میں سرکار دو عالم ﷺ کے خلاف لڑتا رہا ہوں۔ کیا آج ان رومیوں سے بھاگوں گا۔ بولو! کون ہے جو آج میرے ساتھ موت پر بیعت کرتا ہے۔“

ان کے کہنے پر بہت سے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ بالآخر یہ بھی اس جنگ میں جام شہادت نوش کر گئے، لیکن ان کے ہاتھ موت کی بیعت کرنے والا دستہ انتہائی شجاعت کا ثبوت دے رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبری کی روایت کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار افراد کھائی میں گر کر نذر اجل ہوئے ان میں اسی (۸۰) ہزار وہ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

ان حالات میں سیدنا خالدؓ کا یہ کہنا کہ مسلمان کتنے زیادہ ہیں اور رومی کتنے کم، بالکل درست اور صحیح ہے۔ اسی جنگ میں سیدنا خالدؓ نے رومی سردار باہان سے کہا تھا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ

﴿انا قوم نشرب الدماء، وانه بلغنا انه لا دم اطیب من دم الروم فجئنا لذالک﴾

”ہم ایک ایسی قوم ہیں جو خون پیتے ہیں اور ہمیں پتہ چلا ہے کہ رومیوں سے زیادہ کسی اور قوم کا خون لذیذ اور اچھا نہیں ہے۔ ہم صرف اس لیے آئے ہیں۔“

خالدؓ کے اس فقرہ نے رومیوں کی جان نکال دی اور ان کی ہمتیں جواب دے گئیں اور وہ تعداد میں کثیر ہونے کے باوجود اپنے آپ کو قلیل تصور کرتے تھے۔

یرموک میں رومیوں کی شکست نے ان کی قوت کو اسی طرح پاش پاش کر کے رکھ دیا جس طرح قادسیہ میں ایرانیوں کی شکست میں ان کی قوت پارہ پارہ ہو گئی تھی۔

* * *

بادشاہ سر سے پاؤں تک ہل گیا

سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت سے قبل یہ نہیں کہ لوگ جھونپڑیوں اور کچے مکانوں میں رہتے تھے بلکہ وہ اونچے اونچے مکانوں اور محلات میں اپنی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگیاں نہایت مہذب اور متمدن تھیں۔ نعمان بن امراء القیس کے بنوائے ہوئے محلات خورنق اور سدیر اس زمانہ میں ضرب المثل تھے۔

(ملاحظہ ہو معجم البلدان: جلد ۵ ص ۲۸۲، طبری: جلد ۲ ص ۷۲)

خورنق کی تعمیر کے بارہ میں طبری نے لکھا ہے کہ اس محل کی تعمیر کی یہ وجہ ہوئی کہ یزدگرد کسریٰ کا کوئی بچہ زندہ نہ رہتا تھا۔ اس نے حکماء سے پوچھا کہ مجھے کوئی ایسی جگہ بتاؤ جو ہر قسم کی بیماریوں سے پاک وصاف ہو۔ انہوں نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں اب حیرہ آباد ہے۔ اس نے اپنے بیٹے بہرام گور کو نعمان بن امراء القیس کے پاس بھیجا کہ میری رہائش کے لیے اس جگہ ایک محل تعمیر کراؤ۔ اس نے ایک مشہور معمار اور **آرکیٹیکٹ** (Architect) ''سنمار'' کو تلاش کیا اور اس کو اس محل کی تعمیر کا کام سپرد کیا۔ جب محل تیار ہو گیا تو نعمان اس کے معائنے کے لیے آیا۔ محل کی مضبوطی، دل کشی اور خوبصورتی کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔

شومیٔ قسمت سے سنمار اپنے کام کی تحسین وآفرین کو سن کر کہنے لگا کہ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم لوگ مجھے پورا پورا اجر ومعاوضہ دو گے اور میرے کام کی اس طرح تحسین کرو گے تو میں تمہارے لیے ایسا محل تعمیر کرتا جو سورج کے ساتھ گردش کرتا رہتا۔ نعمان نے تعجب سے پوچھا کہ کیا تم اس سے بھی خوبصورت محل بنا سکتے ہو؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ سنمار کو محل کے اوپر سے گرا کر مار دیا جائے۔

معمار سنمار تو مر گیا اور نعمان اس محل میں رہنے لگا۔ نعمان جب تیس سال حکومت کر چکا تو ایک روز وہ خورنق محل کی چھت پر بیٹھا داد عیش دے رہا تھا۔ اس نے

بیٹھے بیٹھے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ اسے پھلوں سے لدے ہوئے باغات، لہلہاتے کھیت اور کھجوروں کے اونچے اونچے درخت جھومتے نظر آئے۔ وہ اس دلکش اور روح پرور نظارہ سے بڑا خوش ہوا کیونکہ محل کے اردگرد کا منظر بہت روح پرور اور روح افزا تھا۔

پھر اسے ایک دم خیال آیا کہ کل جب میں نہیں ہوں گا تو ان تمام چیزوں کا مالک کوئی اور ہوگا۔ اس خیال نے اسے دنیا کی بے ثباتی کا پتہ دیا اور وہ سر سے پاؤں تک ہل گیا۔ اس کے قلب و ذہن کے بند دریچے کھل گئے۔ اس نے محل کے پہرے داروں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ جب تمام محافظ اور پہرے دار چلے گئے تو تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ وہ رات کی تاریکی میں ایک کمبل اوڑھ کر ایسا غائب ہوا کہ پھر وہ کسی کو نظر نہ آیا۔ اس طریقہ سے اس نے محل کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

(ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام حسن ابراہیم: جلد ۱ ص ۳۵۔۳۶)

* * *

عہد کو پورا کرنے کی ایک عجیب وغریب مثال

عہد کو پورا کرنا اسلام میں نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں عہد کو نہ پورا کرنے والے کو قیامت کے روز پوچھا جائے گا۔ اور حدیث میں منافق کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ وعدہ کر کے اس کو پورا نہیں کرتا۔

اسلام سے قبل عربوں میں بھی یہ صفت پائی جاتی تھی کہ جب وہ کسی سے وعدہ کرتے تو اس کو پورا کرتے۔ اس بارہ میں کتابوں میں ایک عجیب وغریب واقعہ نعمان بن منذر والی حیرہ کا ہے۔ یہ نعمان بن منذر، منذر بن ماء السماء کا بیٹا تھا۔ منذر بن ماء السماء کو مزدکی تحریک کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے نوشیروان عادل کے باپ نے حیرہ کی گورنری سے معزول کر دیا تھا اور بعد میں نوشیروان جب خود مزدک کے خلاف ہو گیا تو اس نے اپنے عہد حکومت میں اس کو اپنے عہدے پر بحال کر دیا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں دو دن خاص مقرر کیے ہوئے تھے۔ ایک کا نام یوم النعیم (خوشی کا دن) تھا اور دوسرے کا نام یوم البؤس (غم کا دن) تھا۔ یوم النعیم کو جس پر اس کی پہلی نظر پڑتی اس کو وہ سو اونٹ انعام میں دیتا اور یوم البؤس کو جو شخص اس کو سب سے پہلے نظر آتا اس کو وہ قتل کر دیتا۔

ایک روز نعمان بن منذر جنگل میں شکار کے لیے گیا اور ایک گورخر کے پیچھے گھوڑا دوڑایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سارے مصاحبین پیچھے رہ گئے اور بادشاہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کا کوئی آشنا نہیں تھا۔ اتنے میں بادل امنڈ آئے اور نہایت زوردار بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ اسے ایک مکان دکھائی دیا جو بنی طے کے ایک شخص حنظلہ نامی کا تھا۔ حنظلہ اپنی بیوی کے ساتھ اس مکان میں رہائش پذیر تھا۔ بادشاہ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ حنظلہ نے دروازہ کھولا۔ بادشاہ نے اس سے سر چھپانے کی درخواست کی۔ اس نے اندر تشریف لانے کے لیے کہا۔ حنظلہ مہمان کو نہیں پہچانتا تھا کہ یہ حیرہ کا بادشاہ ہے۔ اس کے پاس صرف ایک بکری تھی جس کا دودھ وہ

دونوں میاں بیوی بیٹے تھے۔ اپنی روایتی اور طبعی مہمان نوازی کی وجہ سے حنظلہ نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ کوئی غیر معمولی مہمان ہے، لہٰذا اس کی مہمان نوازی کس طرح کی جائے۔ بیوی نے کہا: میں نے تھوڑا سا آٹا بچا کر رکھا ہوا ہے۔ میں روٹی پکاتی ہوں۔ تم پہلے بکری کا دودھ دھولو پھر اس کو ذبح کرلو۔ چنانچہ نعمان کو انہوں نے پہلے دودھ پلایا۔ پھر اس بکری کو ذبح کر کے اس کے گوشت اور روٹی سے اس کی مہمان نوازی کی۔ جب مہمان کھانا کھا چکا تو اس کو نہایت آرام سے رات گزارنے کے لیے کہا۔ صبح نعمان جب وہاں سے روانہ ہوا تو اس نے کہا میں حیرہ کا بادشاہ نعمان ہوں۔ اگر کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے تو میرے پاس بلا خوف وخطر آنا، میں تمہیں اپنی اس خدمت کا صلہ دوں گا۔ حنظلہ نے کہا: ”بہت اچھا۔“ اس بات پر کافی عرصہ گزر گیا، لیکن ایک مرتبہ ان کے علاقہ میں قحط پڑ گیا۔ خستہ حالی نے ان دونوں میاں بیوی کو آ دبوچا۔ ایک روز اس کی بیوی نے کہا کہ اب تو فاقہ بھی برداشت نہیں ہوتا اور مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ حیرہ کے بادشاہ نے تمہیں آنے کو کہا تھا، لہٰذا تم اس کے پاس جاؤ، شاید وہ کوئی ہماری مالی امداد کرے۔ حنظلہ بیوی کے کہنے پر حیرہ روانہ ہو گیا۔ لیکن سوء اتفاق سے جب وہ نعمان کے دربار میں داخل ہوا اس روز یوم البؤس تھا۔ سب سے پہلے نعمان نے اسی کو دیکھا اور پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے میری اس بارش کی رات بڑی خدمت کی تھی۔ لیکن اسے بہت دکھ ہوا کہ یہ آج میرے پاس کیوں آیا ہے۔ بادشاہ نعمان اس کو دکھ اور افسوس سے دیکھ رہا تھا۔ حنظلہ یہ سمجھا کہ شاید اس نے مجھے پہچانا نہیں ہے جو اس طرح مجھے دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ نعمان نے کہا: میں نے تمہیں پہچان لیا ہے لیکن کاش تم آج نہ آتے، کسی اور دن آجاتے کیونکہ آج یوم البؤس ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے تو اس بات کا علم نہیں تھا۔ نعمان نے کہا لیکن میں مجبور ہوں۔ آج کے دن اگر میرا سگا بیٹا بھی میرے سامنے آجاتا تو میں اس کو بھی قتل کر دیتا، لہٰذا اگر کوئی حاجت ہے تو مانگ لو کیونکہ میں تجھے ضرور قتل کروں گا۔ حنظلہ نے کہا: ”تمہارا یہ انعام واکرام میرے کس کام کا، اگر تو نے مجھے بعد میں قتل کر دیا۔“ نعمان نے کہا: ”قتل تو تو ضرور ہوگا۔“ اس نے کہا: ”اگر واقعی میرے قتل کے بغیر چارہ نہیں تو مجھے مہلت دو تاکہ میں ایک مرتبہ اپنے گھر

والوں سے مل آؤں اور انہیں آخری وصیتیں کر آؤں۔ اور ان کے لیے مناسب انتظام کر کے میں واپس آ جاؤں گا۔ بادشاہ نے کہا "کوئی ضامن دو۔" حنظلہ نے ادھر ادھر دیکھا، اس کی نگاہ شریک بن عمرو پر پڑی۔ اس نے اس سے ضمانت دینے کے لیے کہا، لیکن شریک بن عمرو نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ بنی کلب کا ایک شخص جس کا نام قراد بن اجدع تھا، وہ کھڑا ہو گیا اور بادشاہ سے کہنے لگا: "میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔"

نعمان نے حنظلہ کو پانچ سو اونٹنیاں اور بہت سا مال و متاع دیا اور ایک سال کی معیاد دی کہ وہ واپس آ جائے۔ جب سال گزر گیا اور صرف ایک روز باقی رہ گیا تو نعمان نے قراد بن اجدع سے کہا کہ "وہ شخص تو واپس نہیں آیا، لہٰذا میرا خیال ہے کہ کل تجھے قتل کر دیا جائے گا۔" قراد نے کہا: "اگر دن کا پہلا حصہ منہ موڑ چکا ہے تو کل کا دن بھی قریب ہے، زیادہ دور نہیں۔"

دوسرے روز نعمان بن منذر اپنے دستور کے مطابق اپنے ہتھیار سجا کر گھوڑے پر سوار ہو کر اس جگہ آیا جہاں وہ اس روز پہلے نظر آنے والے شخص کو قتل کیا کرتا تھا۔ اس نے جلاد کو قراد بن اجدع کا سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ شاہ کے وزیروں نے کہا کہ جب تک اس دن کا سورج مغرب میں اپنا منہ نہ چھپا لے، اخلاقی طور پر آپ اسے قتل نہیں کر سکتے، لہٰذا سورج غروب ہونے کا انتظار کریں۔ اگرچہ نعمان نے رات تک مہلت دے دی لیکن اس کا دل چاہتا تھا کہ یہ قتل ہو جائے اور حنظلہ بچ جائے جس نے کسی مشکل رات میں اس کی مہمان نوازی کی تھی۔

سورج رینگ رینگ کر جھیلِ مغرب میں اپنا منہ چھپانے جا رہا تھا اور رات اپنی زلفوں کی سیاہ چادر سے کائنات کو ڈھانپنے ہی والی تھی۔ جلاد نے قراد کے کپڑے اتار دیے۔ تلوار بے نیام کر لی گئی۔ بادشاہ کی ایک نگاہ آفتاب کی طرف اور دوسری جلاد کی طرف تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ جونہی سورج غروب ہو وہ فوری طور پر جلاد کو سر قلم کرنے کا حکم دے دے۔ قراد بن اجدع کو نطع پر کھڑا کر دیا گیا اور جلاد بادشاہ کے اشارۂ ابرو کا منتظر تھا کہ اچانک دور سے ایک شخص آتا ہوا نظر آیا۔ بادشاہ جلاد کو قراد بن اجدع کا حکم دینے ہی والا تھا کہ وزراء نے کہا: جب تک معلوم نہ ہو جائے کہ آنے والا شخص کون ہے اس وقت تک

اس کو قتل نہ کیا جائے۔ جب وہ شخص قریب آیا تو سب نے دیکھا کہ وہ حنظلہ ہے۔ بادشاہ نے جب حنظلہ کو دیکھا تو اسے سخت پریشانی ہوئی۔ اس نے غصہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہا: ”جب تم ایک بار قتل سے بچ کر چلے گئے تھے تو پھر واپس کیوں آئے؟“ اس نے کہا: ”الوفاء“ یعنی عہد کو پورا کرنے کے لیے۔ بادشاہ نے پوچھا: ”وفا کا یہ درس تو نے کہاں سے سیکھا؟“ اس نے کہا: عیسائیت سے۔ چنانچہ حنظلہ نے عیسائی مذہب کی تعلیمات اس کے سامنے پیش کیں اور بادشاہ نعمان نے عیسائیت کو قبول کرلیا۔ اس روز نعمان بن منذر نے یہ قتل کرنے کا طریقہ ختم کردیا اور قراد اور حنظلہ دونوں کو معاف کر دیا۔ پھر کہا:

> ﴿واللّٰہ! ما ادری ایکما اوفیٰ واکرم﴾
>
> ”بخدا! میں نہیں جانتا کہ تم دونوں میں سے زیادہ باوفا اور زیادہ کریم کون ہے؟“

حنظلہ نے کہا: ”میں وہ شخص ہوں کہ وعدہ پورا کرنا جس کی فطرت میں داخل ہے، اور میں ہر احسان کا بدلہ دینے کے لیے اپنی جان کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔

(بلوغ الادب: جلد ا، ص ۲۷۱)

◆

اللہ سے معاملہ درست کرنے کا نتیجہ

شیخ سعدیؒ نے بوستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ میں نے رودبار کے میدان میں ایک شخص کو دیکھا جو چیتے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ مجھے اسے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کیونکہ چیتا تو انسان کو پھاڑ کھانے والا جانور ہے نہ کہ سواری والا جانور۔ جب چیتے پر سوار شخص نے مجھے اس حیرت و پریشانی میں دیکھا تو کہا: ”سعدی! جو تو نے دیکھا ہے اس پر تعجب نہ کر کیونکہ

توہم گردن ازحکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

یعنی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی گردن نہ پھیر تا کہ دنیا کی کوئی شی تیرے حکم سے گردن نہ پھیر سکے۔

مطلب یہی ہے کہ اللہ سے معاملہ درست کر لو دنیا کی ہر شی تمہارے زیرِ حکم ہو جائے گی تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ جب کسی فرد یا جماعت نے اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ درست کر لیا تو پھر دنیا کی ہر شی اس کے زیرِ فرمان ہو گئی۔

ایک روز سیدنا فاروق اعظمؓ بیٹھے ہوئے تھے کہ زلزلہ آیا اور زمین ہلنے لگی۔ سیدنا عمرؓ نے زمین پر اپنا درہ مارا اور فرمایا:

”اے زمین! ٹھہر۔ کیوں کانپتی ہے، ابھی عمرؓ تیری پیٹھ پر انصاف کرنے والا موجود ہے۔“

روایات میں آتا ہے کہ زمین اسی وقت ٹھہر گئی۔ (فسکنت الارض)

سیدنا فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالواحد بن زیدؒ نے مسلسل تین روز اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ ”اے اللہ! مجھ کو جنت کی رفیقۂ حیات اس دنیا میں دکھا دے۔“

ایک روز انہوں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ کسی کہنے والے نے یہ کہا کہ

میمونہ سوداءؓ جنت میں تمہاری رفیقۂ حیات ہے۔ پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟''

خواب ہی میں بتایا گیا کہ ''وہ کوفہ میں فلاں قبیلہ سے تعلق رکھتی ہے اور فلاں مقام پر ملے گی۔''

حضرت عبدالواحدؒ (یہ سیدنا زین العابدینؒ کے پوتے اور حضرت فضیل بن عیاضؒ کے شیخ تھے۔) فرماتے ہیں کہ یہ خواب دیکھ کر میں کوفہ گیا اور وہاں کے لوگوں سے اس کے بارہ میں پوچھا۔ لوگوں نے بتلایا کہ وہ تو ایک دیوانی عورت ہے اور ہماری بکریاں چراتی ہے۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ میں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے بتلایا کہ جنگل میں فلاں جگہ چلے جاؤ وہ تمہیں وہاں مل جائے گی۔ چنانچہ میں لوگوں کی بتائی ہوئی جگہ پر جنگل میں پہنچ گیا۔

جنگل میں جا کر میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا کہ وہ اللہ کی بندی تو نماز میں مصروف ہے۔ سامنے اس کا عصا پڑا ہے۔ خود وہ اون کا جبہ پہنے ہوئے ہے جس پر لکھا ہوا ہے۔ ''لا تباع ولا تشتری'' یعنی نہ یہ بیچا جاتا ہے نہ خریدا جاتا ہے۔ اور اس کی بکریاں بھیڑیوں کے ساتھ پھر رہی ہیں۔ نہ تو بھیڑیے بکریوں کو کھاتے ہیں اور نہ بکریاں بھیڑیوں سے خوف زدہ ہیں۔

جب اس اللہ کی بندی کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے اپنی نماز مختصر کر دی اور کہا:

''ابن زید! واپس چلے جاؤ، ابھی وقت نہیں آیا ہے۔''

میں نے اس سے کہا:

''اللہ تجھ پر رحم فرمائے تجھے کس نے بتلا دیا کہ میں ''زید کا بیٹا'' ہوں۔''

اس نے کہا: ''تمہیں علم نہیں کہ روحیں اللہ کا لشکر ہیں جو ایک جگہ اکٹھی ہیں، ان میں سے جن میں تعارف ہو جاتا ہے وہ یہاں بھی ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں، اور جن میں وہاں تعارف نہیں ہوتا وہ یہاں بھی الگ تھلگ رہتی ہیں۔

میں نے اس سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجیے، اس نے کہا: ''اس واعظ پر تعجب ہے جسے نصیحت کی ضرورت ہو۔ مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ جس بندہ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی کوئی

چیز عطا کی اور وہ پھر بھی اس کی طلب میں رہا تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنی خلوت کی چاہت سلب فرما لیتے ہیں۔ قرب کو بُعد سے بدل دیتے ہیں اور اُنس کے بجائے وحشت اس کے دل میں بٹھا دیتے ہیں۔"

پھر اس نے چند عبرت ناک اشعار پڑھے۔ میں نے کہا کہ "میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ بھیڑیے بکریوں کے ساتھ پھر رہے ہیں۔ نہ تو بکریاں بھیڑیوں سے ڈرتی ہیں اور نہ ہی بھیڑیے بکریوں کو کھاتے ہیں۔" ایسا کیوں ہے؟"

اس نے کہا کہ جاؤ ایسی باتیں مت کرو۔ میں نے چونکہ اپنے مولائے کریم کے درمیان معاملہ درست رکھا ہوا ہے اس لیے اس نے بھیڑیے اور بکریوں میں موافقت پیدا فرما دی ہے۔" (صفۃ الصفوۃ: جلد ۳ ص ۱۲۱)

……

اب خود ان کے گھر میں غریبی ناچنے لگی

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ غصب شدہ اموال اور جائدادوں کی واپسی کا تھا۔ بعض اموی عمال نے غریبوں اور زیر دستوں کے جو اموال اور جائیدادیں غصب کر رکھی تھیں، اور شاہی خاندان کے افراد، بعض اموی عمال اور عمائدین سلطنت نے غریبوں کی زمینوں کو اپنی جاگیر بنالیا ہوا تھا۔ یہ کام دیکھنے میں تو نہایت آسان تھا لیکن دراصل یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ سارے خاندان، عمائدین سلطنت اور عمال بنو امیہ سے مخالفت مول لینا تھا، لیکن آپ نے اس نازک اور کٹھن کام کو جو ایک کار خیر تھا اور زیر دستوں اور غریبوں کی دعائیں لینا تھا، آپ نے اپنی اصلاحات میں اس کو ایک نمبر پر رکھا۔ خود آپ کے پاس بڑی موروثی جاگیر تھی جس کے بارہ میں آپ یہ سمجھتے تھے کہ اس کو اپنے پاس رکھنا میرے لیے جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے جب اس جاگیر کو واپس کرنے کا ارادہ کیا تو بعض خیر خواہوں اور دوستوں نے عرض کی کہ اگر آپ جاگیر واپس کر دیں گے تو اپنی اولاد کے لیے کیا انتظام کریں گے؟“ فرمایا: ”میں ان کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔“ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ص ۱۰۸)

روایات میں ہے کہ اس کے بعد آپ نے اپنے خاندان کے افراد کو اکٹھا کیا اور فرمایا:

> ”بنی مروان! تم کو شرف اور دولت کا ایک حظ وافر عطا ہوا ہے اور میرے خیال میں امت کا نصف یا دو تہائی مال تمہارے قبضہ میں ہے۔“

یہ دراصل انہوں نے ان لوگوں کو اشارتاً بتایا کہ تم غصب شدہ اموال اور جائدادیں واپس کر دو۔ وہ لوگ آپ کے اس اشارہ کو سمجھ گئے اور کہا:

> ”خدا کی قسم! جب تک ہمارے سر ہمارے جسموں سے جدا نہ ہو

> جائیں اس وقت تک ہم یہ اموال اور جائدادیں واپس نہیں کریں گے۔ خدا کی قسم! ہم نہ اپنے آباؤ اجداد کو کافر بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی اولادوں کو مفلس۔"

ان کے یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا:

> "خدا کی قسم! اگر اس معاملہ میں تم میری مدد نہیں کرو گے تو میں تم کو ذلیل ورسوا کردوں گا۔ میرے پاس سے چلے جاؤ۔"

اس کے بعد آپ نے عام مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا اور فرمایا:

> "ان لوگوں (خلفائے بنی امیہ) نے ہمیں ایسی جاگیریں اور عطایا دیئے جو بخدا! انہیں دینے کا کوئی حق نہیں تھا اور نہ ہمیں ان کے لینے کا۔ اب میں ان سب کو ان کے حقیقی اور اصلی حق داروں کو واپس کرتا ہوں، اور اس کام کو اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اسنادِ شاہی کا رجسٹر منگوایا۔ مزاحم ان اسناد کو نکال کر پڑھ پڑھ کر سناتے جاتے اور سیدنا عمرؒ انہیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے۔ صبح سے لے کر نماز ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی ایک ایک جاگیر واپس کردی حتیٰ کہ اپنے پاس ایک نگینہ تک نہ رہنے دیا۔

آپ کی اہلیہ فاطمہ کو آپ کے والد عبدالملکؒ نے ایک بیش قیمت پتھر دیا تھا، اس کے بارہ میں بھی آپ نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ اس کو بیت المال میں داخل کردو یا پھر مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ کی اہلیہ اگرچہ ایک خلیفہ کی بیٹی تھی لیکن بڑی وفا شعار تھی، اس لیے وہ ہیرا فوراً بیت المال میں داخل کردیا۔ (تاریخ الخلفاء، سیوطی: ص ۲۳۳)

روایات میں ہے کہ عمرؒ آندھی کی طرح چاروں طرف گھوم رہے تھے اور باطل کی جڑیں اکھاڑ رہے تھے اور غرور ونخوت کے آثار حرفِ غلط کی طرح مٹا رہے تھے۔ آپ نے عزم کرلیا کہ ورثہ میں ملی ہوئی جائدادیں اور جمع شدہ ناجائز مال لوگوں میں بانٹ دیں گے اور ہبہ کیے ہوئے قطعات اراضی عوام کو دے دیں گے تاکہ عوام کے دلوں میں حق کا

رعب بٹھا دیا جائے جسے پہلے حکمران برباد کر گئے تھے۔ اور اسلامی تہذیب وتمدن کو نکھارا جائے جسے حوادث نے لوگوں کے دل ودماغ سے مٹا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ امت ایسی گندگیوں میں لتھڑی ہوئی ہے جن سے اس کو پاک کرنا مشکل ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے اپنے کپڑے اتار پھینکے اور خوشبو دھو ڈالی اور آٹھ درہم قیمت کی چادر اوڑھ لی۔ پھر حکم فرمایا کہ میرے پاس جو برتنے کی اشیاء ہیں ان سب کو اور سواریوں اور کپڑوں کو اور عطر وغیرہ کو فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ سب اشیاء ۲۳ یا ۲۴ ہزار اشرفیوں میں فروخت ہوئیں اور وہ سارا روپیہ بیت المال میں جمع کرا دیا گیا۔ گویا اصلاح عمل اپنے گھر سے شروع کیا۔

پھر خلافت کی سرکاری سواریوں کو لایا گیا۔ گھوڑے زین کسے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے اور ان پر سوار تلواریں سونتے ہوئے تھے قناتیں تنی ہوئی اور خیمے گڑے ہوئے تھے۔ ان سب کے آگے محافظ دستہ کا افسر چل رہا تھا۔ سیدنا عمرؒ نے اس سے کہا۔ "مجھے تمہاری ضرورت نہیں، میں نے تم سب کو سبکدوش کر دیئے۔" (صفة الصفوة: جلد ۲ص ۶۲)

پھر آپ اپنے خچر کی تلاش میں قطاروں میں گھس گئے اور اسے پکڑ کر اس پر سوار ہو گئے۔ بہت سے پہرے داروں اور سپاہیوں کو فارغ کر دیا جن کی تعداد چھ سو سے زیادہ تھی۔

پھر ان قناتوں اور فرشوں کو ٹھوکر مار کر اپنے راستہ سے ہٹا دیا۔ پھر اپنے غلام مزاحم کو بلا کر فرمایا: "یہ خچر، گھوڑے اور قناتیں وغیرہ اور دیگر آرائشی سامان بیت المال میں جمع کراؤ۔"

اب حالت یہ تھی کہ خود سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے اپنے گھر میں غربت ناچنے لگی۔ ان کی اہلیہ فاطمہ بنت عبدالملک نے درخواست کی کہ ان کا اور ان کے بچوں کا ماہانہ مقرر کر دیا جائے۔ فرمایا "بیت المال میں گنجائش نہیں۔" وہ بولی! "آپ قبل از خلافت دوسروں سے کیوں لیا کرتے تھے؟" فرمایا: "جب تو وہ مال میرے لیے حلال اور طیب تھا۔ اس کا وبال اور گناہ انہی پر تھا جنہوں نے اس کو ناجائز طریقے سے حاصل کیا، لیکن خلیفہ بنائے جانے کے بعد میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس طرح عمرؒ اپنی اہلیہ کو برابر سمجھاتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی اسی تقویٰ اور پرہیزگاری کے سانچے میں ڈھل گئی۔

◆

اسے کچھ نہ کہو، جانے دو

یہ الفاظ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ نے ایک بنیا کے بارہ میں کہے جس نے مولاناؒ پر ناجائز تشدد کیا اور انہیں کھینچ کر تھانہ لے گیا۔

حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی قدس سرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (م ۱۲۴۵ھ) کے حقیقی بھتیجے تھے، علمی نسبت سے شاہ محمد اسحاق صاحب دہلویؒ کے شاگرد عزیز اور روحانی نسبت سے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب دہلویؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کاندھلہ کے مردم خیز قریہ میں پیدا ہوئے لیکن وفات مدینہ منورہ میں ہوئی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

بڈولی یوپی میں ایک قصبہ ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحبؒ وہاں کی سرائے میں ٹھہرے۔ برابر میں ایک بنیا مع اپنے لڑکے ٹھہرا ہوا تھا۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں سونے کے کڑے تھے۔ مولانا کی رات کو اس سے بات چیت ہوتی رہی جیسا کہ سفر میں عادت ہے کہ مسافر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ بنیے نے پوچھا: "میاں جی! کہاں جاؤ گے؟"

حضرت مولاناؒ نے سب کچھ بتا دیا کہ فلاں جگہ جانا ہے اور فلاں راستے سے جاؤں گا۔ اس کے بعد مولانا تہجد پڑھ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ بنیے کے اس لڑکے کے ہاتھ سے کسی نے رات کو سونے کے کڑے اتار لیے۔ بنیا اٹھا تو دیکھا کہ لڑکے کے ہاتھ میں کڑے نہیں ہیں۔ بس اس کی تو جان نکل گئی۔ دیکھا کہ میاں جی بھی نہیں ہیں جن سے رات بات چیت ہو رہی تھی۔ اس نے کہا: "ہو نہ ہو کڑے وہی لے گئے۔ یہ کوئی ٹھگ تھا۔" وہ سیدھا اسی راستے پر روانہ ہوا جس پر حضرت مولاناؒ نے جانے کا ارادہ بیان فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ مولانا اس کو مل گئے۔ بس پہنچتے ہی اس نے مولانا کو ایک دھول رسید کی۔ مولانا نے کہا "کیا ہے؟" کہا: "پوچھتا ہے کیا ہے؟ کڑے کہاں ہیں۔" مولانا نے

فرمایا: ''بھائی! میں نے تیرے کڑے نہیں لیے۔'' اس نے کہا: ''کیا ان باتوں سے تو چھوٹ جائے گا؟ میں تجھے تھانہ لے چلوں گا۔''

مولانا نے فرمایا: ''مجھ کو کوئی عذر نہیں۔ میں تھانہ بھی چلوں گا۔''

غرض وہ مولانا کو پکڑے ہوئے جھنجھانہ کے تھانہ میں پہنچا۔ اتفاقاً تھانیدار مولانا کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے دور سے دیکھا کہ مولانا تشریف لا رہے ہیں۔ وہ مولانا کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بنئے کے تو ہوش اڑ گئے کیونکہ

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی ظالم تیرا چاہنے والا نکلا

اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو کوئی بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اور ذرا کر اب جوتے پڑیں گے۔ مگر مولانا اس سے فرماتے ہیں: ''بھاگ جا، بھاگ جا۔ تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔''

تھانیدار نے مولانا سے پوچھا: ''یہ کون تھا؟''

فرمایا: ''تم اسے کچھ نہ کہو۔ جانے دو۔ اس کی چیز کھو گئی، اس کی تلاش میں آیا تھا۔''

دیکھئے کیا بے نفسی ہے۔ لطف یہ کہ ذرا غصہ نہیں بلکہ مولانا اس کے احسان مند بھی ہوئے۔

چنانچہ فرمایا کرتے تھے:

''اس سے مجھے بڑا نفع ہوا۔ جب لوگ مصافحہ کرتے ہیں اور میرے ہاتھ پیر چومے جاتے ہیں تو میں نفس سے کہتا ہوں تو وہی تو ہے جس کے ایک بنئے نے دھول لگائی تھی۔ بس اس سے عجب نہیں ہوتا۔'' (حسن العزیز: جلد ۴ ص ۶۲)

◆

تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

سیدنا عمرؓ ابن عبدالعزیزؒ نے جونہی مسند خلافت پر قدم رکھا۔ دل کی دنیا بدل گئی۔ دفعتاً زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ دنیا سے یک قلم دامن جھاڑ لیا۔ ساری املاک بیت المال کو واپس کر دیں۔ لونڈی، غلام، فرش فروش، لباس وعطریات اور عیش وعشرت اور جمال وتجمل کے تمام سامانوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی۔ بعض روایات میں ہے کہ بیت المال سے کوئی مشاہرہ نہ لیتے تھے کہ بعض روایات میں ہے کہ چار سو دینار سالانہ ان کا وظیفہ تھا جس پر ان کی اور ان کے اہل وعیال کی گذران تھی۔ لباس بقدر ستر پوشی اور غذا بقدر لا یموت سے زیادہ نہ تھی۔ گویا عیش وتنعم کی گود میں پرورش پانے والا عمر بن عبدالعزیزؒ اب ابو ذر غفاریؓ اور حسن بصریؒ کا قالب اختیار کر چکا تھا

؎

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

آپ کی اس نیکی اور صالحیت کا یہ نتیجہ تھا کہ پورے ملک میں امن وامان اور خوش حالی تھی، موسیٰ ابن ایمن الراعی کہتے ہیں کہ وہ محمد بن عیینہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے، اور حالت یہ تھی کہ شیر اور بکری اور دوسرے تمام جنگلی جانور ایک ہی جگہ ہوتے اور کوئی کسی پر حملہ آور نہ ہوتا تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ ایک بھیڑیا ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا انتقال ہو گیا ہے، چنانچہ جب پتہ چلا تو واقعی اسی رات کو آپ کا انتقال ہوا تھا۔ کرمان اور دوسرے کئی ایک مقامات پر بھی بکریوں کے شیروں کے ساتھ چرنے کے کئی ایک واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں۔

آپ یہ دعا اکثر فرمایا کرتے تھے:

﴿اللّٰهم ان عمر ليس باهل ان تناله رحمتك، ولكن رحمتك اهل ان تنال عمر﴾

"اے اللہ! عمر اس قابل نہیں کہ تیری رحمت پر نچھاور ہو البتہ تیری رحمت اس کی اہل ہے کہ عمر (جیسے گناہ گار) کو اپنے دامن میں چھپالے۔" (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۰۳)

◆

دس درہم کی برکات

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث میں ہے کہ:

> ”بے شک ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ کسی شخص کو یہ پرواہ نہ ہو گی کہ جو مال وہ حاصل کر رہا ہے وہ حلال ہے یا حرام ہے۔“
>
> (بخاری جلد ۳ص ۳۱۳۔ نسائی: جلد ۷ص ۳۱۳)

آج کی پوری دنیا میں یہی ہو رہا ہے کہ روپیہ کماؤ لیکن کن ذرائع سے کماؤ اس بارہ میں بھی کسی نے نہیں کہا۔ کوئی شخص نہیں دیکھتا کہ یہ طریقہ حلال ہے یا حرام، بس صرف روپیہ کمانے کی فکر ہے حالانکہ حرام کمائی کا تو اسلام میں کوئی تصور ہی نہیں اور نہ ہی حرام کمائی اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ اور ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ”اے لوگو! اللہ پاک ہے اور پاک شئی ہی کو قبول کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کو وہی حکم دیا ہے جو اس نے رسولوں کو دیا تھا۔
>
> (اس کے ثبوت میں آپ نے یہ آیت پڑھی)
>
> ﴿یاایها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً﴾
>
> ”اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے عمل کرو۔“
>
> (مسلم حدیث نمبر: ۲۳۴۲)

سیدنا انس بن مالکؓ نے ایک روز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: ”اے اللہ کے رسولؐ! دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ”اپنی کمائی پاک رکھو تمہاری دعائیں قبول ہوں گی۔ جب کوئی حرام کا لقمہ اٹھاتا ہے تو اس کی چالیس روز کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔“

اسلام ہر ممکن یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کو ماننے والا کوئی شخص حرام نہ کھائے اس

وجہ سے اسلام نے مال کمانے اور اس کے خرچ کرنے دونوں پر پابندی لگا دی۔ یہ اسلامی اقتصادیات کا بنیادی اصول ہے۔ لیکن اب اس زمانہ میں حلال وحرام کی تمیز اٹھ چکی ہے۔ اب تو ہر شخص بے دھڑک سودی لین دین کا کام کرتا ہے یہاں تک کہ یتیموں کا مال کھانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

یہ درست ہے کہ مال کو مال اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ انسان کی طبیعت کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ لیکن اسلام نے کسب مال کی اجازت دی ہے حب مال کی اجازت ہرگز نہیں دی۔ اسی حب مال کا جذبہ ہے کہ بعض آدمی مزدور کو اس کے مال کی مزدوری بھی نہیں دیتے۔ جس طرح مزدور کو مزدوری نہ دینا گناہ کبیرہ ہے اسی طرح مال دار کا حق کی ادائیگی میں دیر کرنا بھی ظلم ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

﴿مطل الغنی ظلم﴾

"دولت مند کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔"

ایسا بارہا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی سے قرض لیتا ہے یا کچھ رقم ادھار لیتا ہے اور جب ادائیگی کا وقت آتا ہے تو ٹال مٹول کرتا ہے یا مکر جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ بے چارا قرض خواہ اپنے حق سے دست بردار ہو جاتا ہے یا کچھ حصہ اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی ٹال مٹول اور تاخیر قرض خواہ کو اذیت پہنچانے کے لیے ہوتی ہے۔ ایسا کرنا ظلم ہے۔ اسلام نے ایسے ٹال مٹول کرنے والے کے بارہ میں فرمایا:

> "قدرت والے کی ٹال مٹول سے اس کی آبرو حلال ہوتی ہے اور اس کی سزا جائز ہوتی ہے۔" (ابن حبان)

مال حلال میں بہت برکات ہوتی ہیں جب کہ حرام مال یک قلم برکات سے خالی ہوتا ہے۔ بلکہ حرام مال کمانے والے پر وبال جان ہوتا ہے۔ آج ہم اپنی اولاد کے لیے ڈھیروں دولت چھوڑنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ساری دولت پر عیش کر سکے وہ ڈھیروں دولت اکٹھی کرنے میں حلال وحرام کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ پھر وہ دولت نہ صرف اولاد کے لیے بلکہ اولاد کی اولاد، پھر اس کی اولاد اور پھر اس کی اولاد گویا پشتوں کے لیے ہم دولت جمع کر کے اس دنیا سے جانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عیش تو اس دولت پر ہماری

اولاد کرتی ہے اور جہنم کا ایندھن ہم بن جاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ وہ دولت جو ہم دس پشتوں تک اکٹھی کر کے اس دنیا سے جاتے ہیں وہ پہلی ہی پشت میں تاخت وتاراج ہو جاتی ہے بلکہ اولاد کے مابین باہمی قتل وغارت اور مقدمہ بازی کا سبب بن جاتی ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ واقعہ ہم سب کے لیے باعث عبرت ہے۔

خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ وہ بولے: ''اپنے مشاہدات میں سے یا سنی سنائی باتوں میں سے؟'' کہا: ''اپنے مشاہدات میں سے۔'' وہ بولے:

> ''عمر بن عبدالعزیزؒ نے گیارہ بیٹے چھوڑ کر انتقال فرمایا اور سترہ (۱۷) درہم ترکہ میں چھوڑے۔ پانچ دینار تو ان کی تجہیز وتکفین پر صرف ہو گئے اور دو دینار کی قبر کی جگہ خریدی گئی۔ باقی صرف دس دینار بچے، اور ہر بچے کو ایک پورا درہم بھی ورثہ میں نہ ملا۔ اور ہشام بن عبدالملک فوت ہوئے تو ان کا ترکہ ان کی اولاد میں تقسیم ہوا تو ہر ایک کو دس دس لاکھ ملے۔ میں نے عمرؒ کی اولاد میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے اللہ کی راہ میں ایک دن میں سو گھوڑے دیئے، اور اولاد ہشام میں ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ اسے صدقہ دیا کرتے تھے۔''

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی ص ۲۹۶)

◆

یہ بت فروش ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ

’’سلطان محمود بادشاہ نے جب ہندوستان کو فتح کیا اور سومنات کا مندر توڑا تو اس میں جتنے بت نصب تھے سب توڑ ڈالے۔ ان میں سے جو بت سب سے بڑا تھا اس کو بھی توڑنا چاہا۔ مندر کے پجاریوں نے بہت الحاح وزاری کی اور کہا کہ اس کے برابر ہم سے سونا لے لیا جائے لیکن اس بت کو نہ توڑا جائے۔ محمود نے ارکان سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا کہ ہم کو فتح تو ہو چکی ہے، اب ایک بت کو چھوڑ دینے سے ہمارا کیا جاتا ہے۔ اس قدر مال ملتا ہے وہ لے لو لشکر اسلام اور سلطنت اسلام کے کام آئے گا۔

مجلس میں سیدنا سالار مسعود غازیؒ بھی تھے۔ انہوں نے فرمایا: ’’یہ بت فروشی ہے۔‘‘ اب تک سلطان بت شکن مشہور تھا اب بت فروش کہلائے گا۔‘‘ محمود کے دل کو یہ بات لگ گئی مگر کچھ تردد باقی تھا۔ دوپہر کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ میدان حشر ہے اور ایک فرشتہ ان کو جہنم کی طرف یہ کہہ کر کھینچتا ہے کہ یہ بت فروش ہے۔ دوسرے فرشتے نے کہا کہ نہیں یہ بت شکن ہے، اس کو جنت میں لے جاؤ۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ فوراً حکم دیا کہ بت توڑ ڈالا جائے۔ اس کو جو توڑا تو دیکھا کہ اس کے تمام پیٹ میں جواہرات بھرے ہوئے تھے۔

حق تعالیٰ شانہ کا شکر کیا کہ بت فروشی سے بھی بچا اور جس مال کی طمع میں بت فروشی اختیار کرنا چاہتا تھا، اس سے زیادہ مال بھی مل گیا۔ یہ جنت اور جہنم کی طرف کھینچا جانا اس تردد کی صورت دکھائی گئی جو محمود کے قلب میں تھا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ بت کو چھوڑ دینا حقیقت میں بت فروشی نہ تھا لیکن صورتاً بت فروشوں کی مشابہت تھی جس کا یہ نتیجہ ہوا۔" (وعظ علاج الکبر مشمولہ مواعظ اشرفیہ: ص ۵۶۵)

◆

﴿حرام چیزوں سے علاج﴾

اسلام میں حرام چیزوں سے علاج کی اجازت صرف اضطراری حالت میں ہے ورنہ اسلام نے ممانعت فرمائی ہے۔ سلطان نورالدین زنگی (م ۵۶۹ھ) دنیائے اسلام میں ایک نہایت مشہور شخصیت گذری ہے۔ آپ سلطان ہونے کے ساتھ ساتھ تقویٰ وطہارت، عدل وانصاف، خشیت الٰہی میں نہایت مشہور تھے۔ تاریخ اسلام میں ان کے ان کارناموں کا ذکر جلی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ آپ کے ایک صاحبزادے جن کا نام اسماعیل تھا، وہ بھی تقویٰ وطہارت اور نیکی وخشیت میں اپنے باپ کی طرح تھے۔ تاریخ میں ان کا لقب ''الملک الصالح'' آیا ہے۔ ابھی عنفوان شباب یعنی صرف ۱۹ برس کے تھے کہ مرض قولنج میں مبتلا ہو گئے۔ قولنج کا مرض نہایت تکلیف دہ اور جان لیوا ہوتا ہے۔

ان کے بارہ میں کتابوں میں لکھا ہے کہ:

> ''اطباء نے ان کے اس مرض کے علاج کے لیے یہ تجویز کیا کہ ان کو تھوڑی سی شراب استعمال کرائی جائے۔ نوجوان شہزادے نے اطباء کے اصرار کے باوجود کہا کہ
>
> ﴿لا افعل حتی اسئال الفقهاء﴾
>
> ''میں جب تک فقہاء سے نہ پوچھ لوں شراب کو استعمال نہیں کروں گا۔''
>
> شافعی مذہب کے فقہاء نے ایسی حالت میں بالاتفاق جواز کا فتویٰ دیا۔ شہزادے نے علماء احناف میں سے علامہ علاء الدین کاسانی صاحب بدائع الصنائع سے اس بارہ میں پوچھا کہ مجھے اس حالت تھوڑی سی شراب پی لینی چاہیے؟ انہوں نے بھی جواز کا فتویٰ دیا۔ لیکن شہزادے کا دل نہیں مانتا تھا۔ شہزادے نے علماء سے اور

خصوصی طور پر علماء کا ساکی سے پوچھا کہ "اگر میری موت کا وقت مقرر ہے تو شراب پینے سے کیا موت ٹل جائے گی؟" جواب دیا گیا کہ نہیں۔ شہزادے نے کہا

﴿واللہ مالقیت اللّٰہ وقد فعلت ما حرم علی﴾

"خدا کی قسم! میں ایسی چیز استعمال کر کے اللہ سے نہیں ملوں گا جسے اللہ نے مجھ پر حرام قرار دیا ہے۔"

علامہ ابن العماد حنبلیؒ نے لکھا ہے:

﴿مات ولم یشربہ رحمہ اللّٰہ﴾ (شذرات الذہب: جلد۳ ص۲۵۸)

"اللہ تعالیٰ اس شہزادے پر رحم فرمائے وہ مر گیا لیکن اس نے شراب کو منہ نہیں لگایا۔"

یہ تو اس شہزادے کا حال تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر نعمت دی ہوئی تھی۔ مال کی بھی فراوانی تھی اور زندہ رہنے کی بھی خواہش اس کے قلب میں موجزن تھی لیکن اس نے اس حرام شی کو منہ تک نہ لگایا حالانکہ علماء کے فتویٰ کے مطابق اگر وہ شراب پی لیتا تو اسے کوئی گناہ نہ تھا کیونکہ وہ بطور علاج اضطراری حالت میں پی رہا تھا۔ لیکن آج کل کے نو دولتیے شہزادے شراب پینے کو فیشن سمجھنے لگے ہیں، اس لیے کہ آج کل کے مغربی تہذیب میں رنگے ہوئے لوگ اس کو پیتے ہیں۔ مغرب کی ہر برائی ہم اپنے اندر لینے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اس کو ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں حالانکہ شراب پینے سے کوئی ترقی نہیں ہوتی بلکہ انسانیت مر جاتی ہے اور حیوانیت اجاگر ہوتی ہے۔ کیونکہ شراب پینے سے عقل جاتی رہتی ہے اور عقل ہی انسان اور حیوان میں فرق کرنے کی چیز ہے۔ اگر انسان سے عقل چلی جائے تو وہ حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ پھر شراب پینے سے اللہ کی نافرمانی اس پر مستزاد۔ آج ہم مغرب کی پیروی کرتے کرتے اپنی تہذیب کو بھی بھول گئے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے

بچو تہذیب مغرب سے سنو اے ایشیا والو!
کہ مغرب کی طرف جاتے ہی سورج ڈوب جاتا ہے

⁂

﴿بیماریوں سے شفا کا علاج﴾

بیماری جہاں مختلف بداحتیاطیوں کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے وہاں اس کے پیدا ہونے کا ذریعہ مختلف گناہ بھی ہیں۔ چنانچہ جوں جوں دنیا میں گناہوں کی زیادتی اور ان میں اضافہ ہورہا ہے دوں دوں ایسے ایسے امراض پیدا ہورہے ہیں جن کے نام ہمارے آباؤاجداد نے کبھی نہیں سنے تھے جیسے ایڈز وغیرہ، اور جو امراض اس زمانہ میں ہوتے بھی تھے، ان میں بھی اس قدر اضافہ ہوگیا ہے جیسے کہ ہیپاٹائٹس وغیرہ۔ یہ ورم جگر (ہیپاٹائٹس) پہلے بھی ہوتا تھا لیکن اس کثرت سے نہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ پاکستان کا ہر دسواں شہری ورم جگر کا مریض ہے۔ اگرچہ ان بیماریوں کی کثرت میں ہماری غذاؤں کا اور گندے ماحول کے اثرات میں ہیں لیکن ہمارے نزدیک سب سے بڑا اثر ہمارے گناہوں کا بھی ہے۔ کیونکہ گناہ نام ہے روح کے مرض کا اور روح جب مریض ہو تو جسم خودبخود مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر ہانمن (Hanmann) جس نے ہومیو پیتھک طریقہ علاج ایجاد کیا تھا اس نے بھی اسی نظریہ کے تحت یہ طریقہ علاج ایجاد کیا۔

ان بیماریوں کے علاج میں لوگوں کے ہزاروں لاکھوں روپے صرف ہوتے ہیں بلکہ آج کل علاج سے زیادہ روپے تو ٹیسٹوں پر خرچ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی پوری طرح شفا نہیں ہوتی جس کی ایک وجہ وہ برے اعمال کو نہ چھوڑنا ہے۔ بلکہ موجودہ زمانہ میں تو بداعمالی کی زیادتی ہورہی ہے، اور دوسری وجہ لوگ وہ اسباب اختیار نہیں کرتے جن سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ اگر لوگ اعمال بد کو ترک کردیں اور ان اسباب کو اختیار کرلیں جن سے شفا حصل ہوتی ہے تو اکثر بیماریاں ختم ہوجائیں۔ جن معاشروں میں گناہ کم ہیں وہاں بیماریاں بھی کم ہیں۔

احادیث نبویہ میں ہے کہ بیماریوں کے دفعیہ میں جہاں ترک معاصی اور علاج معالجہ اور دوادارو کرنے کو دخل ہے وہیں صدقات کو بھی ایک بہت بڑا دخل حاصل ہے۔

صدقہ کرنے سے بڑی بڑی تکالیف اور بیماریاں ختم ہوتی ہیں۔ بلکہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے بارہ میں کتابوں میں آتا ہے کہ آپ جب بھی بیمار ہوتے تو طبیب کو بلا کر پوچھتے کہ میری علاج پر کتنی رقم خرچ ہوگی؟ تو وہ ایک تخمینہ بتاتا۔ آپ اس اندازہ سے کچھ بڑھ کر صدقہ کر دیتے اور حق تعالیٰ شانہ انہیں شفا عطا فرما دیتے۔ کیوں اصل شافی الامراض تو حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے۔ دوائیں تو اس کا صرف ایک سبب ہیں۔ اگر دوائیں سبب بن سکتی ہیں تو صدقات بھی سبب بن سکتے ہیں، لہٰذا اس بارہ میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ پھر حدیث میں بھی تو آتا ہے کہ صدقہ بذات خود بیماریوں کے دفعیہ کا سبب ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿حصنوا اموالکم بالزکوٰة، داووا مرضاکم بالصدقة واعدوا اللبلاء الدعاء﴾

(مجمع الزوائد جلد۳ ص۶۳، جامع الصغیر جلد۱ ص۱۴۸)

''اپنے مالوں کی حفاظت زکوٰۃ سے کرو، اور اپنے مریضوں کا علاج صدقات وخیرات کے ذریعہ کرو اور بلاؤں کے دفعیہ کے لیے دعا کو استعمال کرو۔''

اس سلسلہ میں کتابوں میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے حدیث کی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ بعض بزرگان دین اور اکابر امت نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی طرح صدقات ہی سے اپنا علاج کراتے تھے۔ یہ دواؤں سے علاج کرانے میں جب مایوسی ہوئی تو انہوں نے صدقہ سے اپنا علاج کیا اور اللہ تعالیٰ نے مایوسی کو امید میں بدل کر شفائے کاملہ عطا فرما دی۔ چنانچہ مولانا محمد عبداللہ صاحب طارق، رفیق ندوۃ المصنفین نے اس سلسلہ میں کچھ واقعات نقل کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ صدقہ اور خیرات کے ذریعہ بلاؤں، آفتوں اور مصائب وتکالیف کا دور ہونا اور غضب الٰہی کا ٹھنڈا ہونا درست ہے۔ مذکورہ حدیث میں خاص طور پر بیماروں کے لیے صدقے کا مفید ہونا بیان کیا گیا ہے اور بلاشبہ یہ ایک کامیاب اور مجرب طریقہ علاج اور شفا حاصل

کرنے کا ایک مختصر اور قریبی راستہ ہے۔ لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ آج کل یہ عام معمول ہو گیا ہے کہ صدقہ کے لیے ایک چھوٹا سا بکرا جس میں بمشکل پانچ چھ سیر گوشت ہوتا ہے اور قریباً ہزار، بارہ سو میں آتا ہے، اس کو ذبح کر کے کسی غریب کو دے دیتے ہیں، اور وہ غریب اور نادار شخص اس کو تین چار سو میں فروخت کر کے اپنی ضروریات زندگی پوری کرتا ہے۔ اگر بکرے کی رقم ہی اس غریب آدمی کو دے دی جائے تو وہ اس کے لیے اس بکرے سے زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے، لیکن ہم وہ رقم دینے سے ہچکچاتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ غریب آدمی کو اس بکرے کی رقم دے دینا زیادہ اچھا اور اس کے لیے مفید ہے۔ ویسے بھی بعض علماء کے نزدیک قربانی اور عقیقہ کے علاوہ کسی صدقہ میں جانور کو ذبح کرنا حدیث میں نہیں آیا۔

حافظ ذکی الدین المنذریؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ مشہور امام حدیث عبداللہ بن مبارکؒ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور بیان کیا کہ میرے گھٹنے میں سات سال سے ایک پھوڑا ہے۔ میں ہر قسم کا علاج کر چکا ہوں اور بہت سے طبیبوں سے مشورہ کر چکا ہوں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ عبداللہ بن مبارک نے فرمایا: "جاؤ اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جہاں لوگوں کو پانی کی تنگی ہو اور وہاں تم ایک کنواں بنوا دو۔ مجھے امید ہے کہ ادھر زمین سے چشمہ ابلنا شروع ہوگا اور ادھر ساتھ کے ساتھ تمہارا خون بہنا بند ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور بفضلہ تعالیٰ شفایاب ہو گیا۔

اس واقعہ کے ناقل امام بیہقیؒ بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ امام ابوعبداللہ حاکمؒ کا بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہے۔ ان کے چہرے پر پھنسیاں ہو گئیں۔ ہر طرح کا علاج کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، اور اسی میں قریباً ایک سال گزر گیا۔ ایک روز انہوں نے امام ابوعثمان الصابونیؒ کی خدمت میں درخواست کی کہ آپ اپنی جمعہ کے روز کی مجلس میں میرے لیے دعا فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے دعا فرمائی اور سب لوگوں نے خوب توجہ سے آمین کہی۔ جب دوسرا جمعہ آیا تو ایک خاتون نے مجلس میں امام ابوعثمان کی خدمت میں ایک پرچہ بھیجا کہ میں گذشتہ جمعہ کو جب یہاں سے گھر واپس ہوئی تو میں نے گھر جا کر بھی رات کو امام ابوعبداللہ حاکم کے لیے خوب گریہ وزاری کے ساتھ دعا کی۔ اسی شب

سرکار دو عالم ﷺ کی زیارت ہوئی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿قولي لابي عبدالله يوسع الماء على المسلمين﴾

''ابوعبداللہ حاکم سے کہہ دو کہ مسلمانوں کے لیے پانی کی فراوانی کر دیں۔''

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ میں یہ رقعہ لے کر امام ابوعبداللہ کے پاس پہنچا۔ انہوں نے پرچہ دیکھتے ہی اپنے گھر کے سامنے پانی کی سبیل قائم کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ سبیل تعمیر ہوئی اور وہاں پانی بھرا گیا اور برف ڈالا گیا اور لوگ پانی پینے لگے اور جلد ہی تمام پھنسیاں ٹھیک ہو گئیں اور چہرہ پہلے کی طرح بالکل صاف اور بے داغ ہو گیا، اور وہ اس کے بعد کئی سال تک زندہ رہے۔

ہمارے علم میں کئی ایسے شخص ہیں جو اپنی بیماریوں اور دیگر مشکلات میں یہی طریقہ اپناتے ہیں اور انہیں فائدہ ہوتا ہے۔ بعض اہل علم نے بالکل درست لکھا ہے کہ

''دوا دارو کے مروجہ حسی طریقوں کے مقابلہ میں یہ طریقہ زیادہ نفع بخش ہے۔''

(ملاحظہ ہو انتخاب الترغیب والترہیب: جلد ۲ ص ۲۴۲، اشرف اکیڈمی، لاہور)

◆

مردانِ کار کی ضرورت

بعض لوگوں کے پاس "پروگرام" تو بہت ہوتے ہیں، لیکن اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے "مردانِ کار" نہیں ہوتے۔ چنانچہ تاریخ میں ایک واقعہ ہے کہ ایک بار اورنگ زیب نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پیچھے ان کے وزیر سعد اللہ خان بھی کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خان نے کہا:

> "جہاں پناہ! آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر راس کماری تک لہرا رہا ہے کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان ہے جو آپ کے دل میں باقی رہ گیا ہے؟"
>
> اورنگ زیب یہ سوال کر کچھ دیر خاموش رہے، اور اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا: "سعد اللہ! مردے خواہم (سعد اللہ! میں ایک مرد چاہتا ہوں۔)

اورنگ زیب عالمگیر کے پاس وہ چیز مکمل طور پر موجود تھی جس کو نقشہ کار کہا جاتا ہے اسی کے ساتھ ان کے پاس حکومت اور وسائل بھی پوری طرح موجود تھے۔ اس کے باوجود وہ مغل سلطنت کو مستحکم بنانے میں اس لیے ناکام ہو گیا کہ اس کے پاس مردانِ کار نہ تھے۔ اگر اورنگ زیب کے پاس سچے مردانِ کار کی ٹیم موجود ہوتی تو اورنگ زیب کے بعد آنے والی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جیسا کہ اب ہمیں نظر آتی ہے۔

اسلام کے مشن کو آج انسانوں کی بھیڑ میں انسان کی تلاش ہے۔ خدا کے نام پر بولنے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس کو خدا کے خوف نے چپ کر رکھا ہو۔ دنیا کے پیچھے دوڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کی راہ دیکھ رہا ہے جو

آخرت کی خاطر کھڑا ہو گیا ہو۔ خدا کے نام پر خوشیاں منانے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو ڈھونڈ رہا ہے جس کو خدا کی یاد نے رونے پر مجبور کر دیا ہو۔ اپنی انا کا جھنڈا اٹھانے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس نے خدا کو اس طرح پایا ہو کہ اس کے پاس ایک بے انا روح کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا ہو۔ دین کے نام پر لڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو تلاش کر رہا ہے جس نے دین کی خاطر لڑائی بھڑائی چھوڑ دی ہو۔ "حاسبوا اغیارکم" کا جھنڈا اٹھانے والی فوج کے درمیان وہ ان لوگوں کا انتظار کر رہا ہے جو "حاسبوا انفسکم" کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آج اسلام کو مطلوب ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعہ اسلام دوبارہ فکری غلبہ کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔

آج اسلام کو ایسے انسان درکار ہیں جو اپنے کو اس حد تک خالص کریں کہ وہ ظواہر سے گزر کر حقیقت کو دیکھنے لگیں۔ جو اس صبر کے حامل ہوں کہ غیر متعلق مسائل سے اپنا دامن بچا کر اصل نشانہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھیں جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اتنا ہیچ سمجھیں کہ دنیا کی ہر قربانی دینا ان کے لیے آسان ہو جائے۔ جو اتنے زیادہ حقیقت پسند ہوں کہ اپنے مقابلہ میں دوسروں کی خوبی دیکھ سکیں۔ وہ اپنی سیٹ پر دوسرے کو بٹھا سکیں۔ جو حقائق اس طرح دیکھنے لگیں کہ کوئی لفظی شوشہ انہیں اس سے بدکانے والا نہ ہو۔ جو منفی جذبات سے اس قدر خالی ہوں کہ کوئی ذاتی رنجش انہیں منحرف نہ کر سکے، اور کسی کی ترقی انہیں حسد میں مبتلا نہ کرے جو دوسرے کو اپنے مقام پر رکھ کر دیکھیں اور اپنے کو دوسرے کے مقام پر۔ جو ظواہر سے زیادہ حقیقت کے دلدادہ ہوں اور حال سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھتے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ وہ دنیا کے بجائے آخرت میں جیتے ہوں اور اپنی بڑائی کے بجائے خدا کی بڑائی میں گم ہو چکے ہوں۔ ایسے ہی لوگوں نے دور اول میں اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کیا تھا اور ایسے ہی لوگ دور ثانی میں بھی اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کریں گے۔" (مجموعہ مقالات: جلد ۱، ص ۱۸۲-۱۸۳)

* * *

﴿اس پل پر یا اُس پل پر؟﴾

پرانے زمانہ میں جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کا خوف یاد دلاتے (اوصیکم بتقوی اللّٰہ) دراصل اللہ کا خوف ہی ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جو لوگوں کو مختلف قسم کی برائیوں سے روکتا ہے۔ یہ دو ٹانگوں والا جانور چار ٹانگوں والے جانور سے زیادہ بے حیا، زیادہ بدمعاش، زیادہ ظالم اور زیادہ درندہ ہوتا ہے اگر اس کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہو۔ آپ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملے گا کہ جنگل کے درندوں نے اکٹھے ہو کر کسی شہر پر حملہ کیا ہو اور پورے شہر کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا ہو۔ لیکن ایسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں واقعات آپ کو ملیں گے کہ انسانوں نے شہر کے شہر تباہ و برباد کر کے رکھ دیے۔ ہیروشیما، ناگاساکی، افغانستان اور عراق و ویت نام اس کی ماضی قریب کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ غرضیکہ اللہ کا خوف اور آخرت کی جواب دہی انسان کو ظلم و تشدد اور جبر و قہر سے روکتی ہے۔

ملک شاہ سلجوقی کے زمانہ میں ایک غریب بڑھیا کی گائے اس کے سپاہیوں نے پکڑ کے ذبح کر کے کھالی۔ بڑھیا بادشاہ کے پاس اپنی فریاد لے کر جانا چاہتی تھی لیکن بادشاہ کے تمام حوالی موالی اس کو بادشاہ تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ ایک روز ملک شاہ سلجوقی کی شاہی سواری پل سے گزر رہی تھی۔ یہ بڑھیا وہاں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بادشاہ کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور کہا:

> "اے بادشاہ! میرا اور تیرا انصاف اس پل پر ہوگا یا اس پل (صراط) پر؟"

ملک شاہ سلجوقی بڑھیا کے اس جملے سے کانپ اٹھا، وہ گھبرا کر سواری سے اتر پڑا! اور کہا:

> ''اماں! اس پل پر کس کی ہمت ہے کہ کھڑا ہو سکے، بہتر ہے کہ میرا اور تمہارا حساب اسی پل پر ہو جائے۔''
>
> اس کے بعد بڑھیا نے بتایا کہ تمہارے سپاہیوں نے اس کی گائے پکڑ کر ذبح کر دی ہے۔ میں تم سے اس ظلم کا انصاف چاہتی ہوں۔''

ملک شاہ سلجوقی وہیں ٹھہر گیا اور معاملہ کی تحقیق شروع کر دی۔ جب ثابت ہو گیا کہ بڑی بی کی شکایت درست اور صحیح ہے تو اس نے اسی وقت مجرموں کو سزا دی، بڑھیا سے معافی مانگی اور گائے کی اصل قیمت سے بہت زیادہ معاوضہ دے کر بڑھیا کو راضی کیا۔

◆

﴿مال کی حرص..........سمندر کا پانی﴾

مال کی حرص بھی کیا ہے! آدمی کے پاس جتنا مال بھی ہو کم ہی معلوم ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے دن رات کوشش کرتا ہے اور ہر ممکن طریقہ اپنے مال میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حکیم الامت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ مال و دولت کی حرص ایسے ہے جیسے سمندر کا پانی پینا۔ سمندر کا پانی آدمی جتنا بھی پیے پیاس بجھتی نہیں بلکہ اس میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مال و دولت کی حرص دن بدن بڑھتی ہے کم نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر بالفرض کسی شخص کے پاس مال و دولت سے بھری ہوئی دو وادیاں بھی ہوں پھر بھی وہ تیسری کی تلاش میں اپنی تو تمام توانایاں خرچ کر دے گا، اور حق تعالیٰ شانہ (بڑی حرص سے) اپنے جس بندہ کی توبہ چاہتا ہے قبول کر لیتا ہے۔

مطلب سرکار دو عالم ﷺ کا یہ ہے کہ انسان کی حرص و طمع میں دن رات اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ صبح و شام اس کے لیے بھاگتا دوڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ قبر کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے اس کی آنکھ سیر نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ پوری دنیا ننانوے کے چکر میں بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ بازاروں اور مارکیٹوں میں کھڑے ہو کر دیکھیں کہ ہر شخص ایک جنونی اور پاگل شخص کی طرح اپنی حرص اور طمع میں کمی کے بجائے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کی حرص اور طمع میں کمی کے بجائے روز بروز زیادتی اور اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کسی زمانے شیخ سعدیؒ کی کتاب گلستان پڑھی تھی، اس میں شیخؒ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا ہے جس سے ایک دنیا دار انسان کی فطرت کا پتہ چلتا ہے، اور سرکار دو عالم ﷺ کی اس حدیث کی تشریح بھی ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

> ”میں نے ایک تاجر کو دیکھا جس کے پاس ڈیڑھ سو اونٹ سامان کے تھے اور چالیس غلام اور خدمتگار جو اس زمانہ میں بہت بڑا تاجر

ہونے کی علامت تھی۔ شیخ فرماتے ہیں کہ ایک رات وہ مجھے جزیرہ کیش میں اپنے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ رات بھر وہ بہکی بہکی باتیں کرتا رہا۔ نہ وہ خود سویا اور نہ ہی اس نے مجھے سونے دیا۔ اس نے کہا میرا فلاں سامان ترکستان میں ہے اور فلاں مال ہندوستان میں، اور یہ فلاں زمین کی دستاویز ہے، اور فلاں چیز کا فلاں شخص ضامن ہے۔ کبھی کہتا کہ میں اسکندریہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں کیونکہ وہاں کی آب و ہوا نہایت اچھی ہے۔ پھر کہتا کہ نہیں کیونکہ دریائے مغرب میں طغیانی ہے۔ پھر کہا: ''اے سعدی! ایک دوسرا سفر بھی درپیش ہے۔ اگر وہ بھی کر لیا جائے تو باقی تمام عمر کے لیے گوشہ نشین اور خلوت گزین ہو جاؤں گا اور پھر نہایت قناعت و سکون کے ساتھ اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن گزار دوں گا۔'' میں نے تعجب سے پوچھا کہ وہ کون سا سفر ہے؟ اس تاجر نے کہا کہ میں ایرانی گندھک چین لے جاؤں گا کیونکہ مجھے پتہ چلا ہے کہ چین میں اس کا اچھا بھاؤ ہے۔ اور وہاں سے چین کے پیالے روم لے جاؤں گا، روم کا ریشم ہندوستان اور ہندوستان کا لوہا حلب لے جاؤں گا۔ حلب سے آئینے یمن لے جاؤں گا اور یمنی چادریں فارس لے جاؤں گا۔ بس پھر اس سفر کے بعد وطن میں ایک دوکان پر بیٹھ جاؤں گا اور پھر کہیں کا کوئی سفر نہیں کروں گا۔''

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ انصاف کی بات ہے کہ اس سوداگر نے یہ احمقانہ گفتگو اور پاگل پن کی باتیں اس قدر کیں کہ اس سے زیادہ کہنے کی طاقت نہ رہی۔ تاجر نے مجھ سے کہا: ''سعدی! تم بھی کچھ کہو جو تم نے دیکھا یا سنا ہو؟'' سعدیؒ فرماتے ہیں: میں نے کہا:

آن شنیدستی کہ در صحرائے غور   بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیا دار را   یا قناعت پر کند یا خاک گور

> تو نے سنا ہے کہ غور کے صحرا میں ایک سردار گھوڑے سے گر پڑا اور
> گرتے ہوئے اس نے کہا: دنیا دار کی تنگ آنکھ کو یا تو قناعت بھر
> سکتی ہے یا پھر قبر کی مٹی۔

آج ہمارا بھی اس تاجر کا سا حال ہے کہ لاکھ کے بعد دو لاکھ، دو لاکھ کے بعد چار لاکھ اور چار کے بعد آٹھ لاکھ کے چکر میں اپنے عزیز و اقارب اور آخرت کو بھولے ہوئے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک دوڑ لگی ہوئی ہے اور معلوم نہیں کہ دوڑ کی منزل کون سی ہے۔ اور قبر کی اس آواز کو بھی ہم نے گلدستۂ طاق نسیان بنا دیا ہے جو ہر روز ہمیں وہ پکارتی ہے کہ

> ﴿انا بيت الغربة وانا بيت الوحدة وانا بيت التراب وانا
> بيت الوحشة وانا بيت الدود﴾
> ”میں اجنبیت کا گھر ہوں، میں تنہائی کا گھر ہوں، میں مٹی کا گھر
> ہوں، میں وحشت کا گھر ہوں اور میں کیڑوں کا گھر ہوں۔“

ہم اس بات کو بھی بھول گئے کہ ہمارا انجام ایک روز موت ہے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس دنیا سے خالی ہاتھ جانا ہے۔ آج ہم دوسروں کو اپنے مونڈھوں پر اٹھا کر قبرستان لے جاتے ہیں ایک روز ایسا آئے گا کہ ہم کفن میں لپٹے ہوئے دوسرے کے کاندھوں پر سوار اسی طرح اس قبرستان میں آئیں گے۔

واذا حملت الى القبور جنازة
فاعلم بانك بعدها محمول

اور پھر جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب میت کو دفن کر کے لوگ واپس جاتے ہیں تو میت ان کے قدموں کی آواز سنتی ہے اور اس سے اس کی قبر سے پہلے کوئی ہم کلام نہیں ہوتا۔ قبر کہتی ہے:

> ”اے ابن آدم! کیا تو نے میرے حالات نہ سنے تھے؟ کیا تو نے میری تنگی، بدبو، ہولناکی اور کیڑوں سے نہ ڈرایا گیا تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر تو نے کیا تیاری کی؟“ (شرح الصدور للسیوطی: ص ۱۶۲)

اور موت سے غافل اور دنیا کے پیچھے بھاگنے والے شخص کو جب قبر بھینچتی ہے تو

اس کے مردے پڑوسی اس کو پکار کر کہتے ہیں: ''اے دنیا سے آنے والے انسان! کیا تو نے ہم سے نصیحت حاصل نہ کی؟ کیا تو نے نہ دیکھا کہ ہمارے اعمال کیسے ختم ہوئے؟ اور تجھے عمل کرنے کا موقع تھا لیکن تو نے وقت ضائع کیا۔''

(رواہ ابن ابی الدنیا کما فی شرح الصدور: ص ۱۲۸)

> ''اے زمین پر دولت دنیا کے پیچھے بھاگنے والے انسان! کیا تو مرنے والوں سے عبرت حاصل نہیں کرتا؟ کیا تو نہیں دیکھتا کہ کس طرح تیرے اعزاء واقربا کو لوگ اٹھا کر قبروں تک لے گئے۔''

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ؎

تزود من معاشک للمعاد
وقم للّٰه واعمل خیر زاد
ولا تجمع من الدنیا کثیر
فان المال یجمع للنفاد
اترضی ان تکون رفیق قوم
لهم زاد، وانت بغیر زاد

(۱) اپنی اس دنیوی زندگی میں اپنی آخرت کے لیے زادراہ حاصل کرلو، اور اللہ کے لیے اٹھو، اور زادراہ کے لیے عمل کرو۔

(۲) دنیا میں بہت زیادہ مال جمع کرنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ مال تو فنا ہونے کے لیے جمع کیا جاتا ہے۔

(۳) کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ تم ایک ایسی قوم کے ساتھی بنو جس کے پاس آخرت کے لیے زادراہ ہے جب کہ تیرے پاس کوئی زادراہ نہیں۔

……◆……

﴿عجیب حفاظت﴾

امام فخر الدین رازیؒ نے "رب العالمین" کی تفسیر کے ضمن میں حضرت ذوالنون مصریؒ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مالک و خالق کس طرح مختلف تکالیف اور مصائب سے ہماری حفاظت فرماتا ہے۔ ہماری عروس فکر اس بارہ میں بالکل کوری ہوتی ہے اور اس کو نہ مصائب کے آنے کا پتہ ہوتا ہے اور ٹلنے کا کہ حق تعالیٰ شانہ مصائب ٹال بھی دیتے ہیں اور ختم بھی کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں امام رازیؒ حق تعالیٰ شانہ کی رب العالمینی کے بارہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ذوالنون مصریؒ کپڑے دھونے کے لیے دریا پر تشریف لے گئے۔ انہیں وہاں ایک موٹا سا بچھو ساحل کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیا۔ جب وہ دریائے نیل کے کنارے پر پہنچا تو ذوالنونؒ نے دیکھا کہ فوری طور پر دریا سے ایک کچھوا نکلا جو فوری طور پر سطح آب پر تیرنے لگا۔ وہ بچھو کے قریب ہوا اور بچھو اس کے قریب، اور دونوں میں آنکھوں ہی آنکھوں میں خدا جانے کیا ساز باز ہوئی کہ بچھو کود کر اسی کی پشت پر سوار ہو گیا۔ کچھوا اس بچھو کو اپنی پشت پر سوار کر کے دوسرے کنارے کی طرف چلا۔ ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ بچھو کے کچھوے کی پشت پر اس طرح سوار ہونے سے مجھے کچھ شک سا ہوا کہ یہ بچھو کسی خاص مہم پر جا رہا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اس کو منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے اسباب مہیا کیے جا رہے ہیں، جیسے ایک چیونٹی کے دل میں حرم جانے کا خیال پیدا ہوا۔ چل کر تو وہ جا نہیں سکتی تھی کیونکہ چل کر جاتی تو شاید سالوں میں پہنچتی یا پھر کسی کے پاؤں تلے مسلی جاتی۔ قدرت نے اس کے دل میں ڈالا کہ درخت کے فلاں پتے پر بیٹھو۔ وہ بیٹھی اور ادھر حرم کے کبوتر کو حکم ہوا کہ اس پتے کو اٹھا کر حرم میں پھینک دو۔ اس نے ایسا ہی کیا اور چیونٹی حرم میں پہنچ گئی۔ مسبب الاسباب تو وہی ہے جو ہر ایک کو اسباب کی سیڑھی مہیا کرتا ہے جس کے ذریعہ ہر شخص اپنی منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔

کچھوا بچھو کو اپنی پشت پر بٹھائے دوسرے کنارے کی طرف لے جا رہا تھا۔

حضرت ذوالنونؒ کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ دیکھنا چاہیے کہ یہ بچھو کہاں جا رہا ہے؟ یہ بھی تہبند باندھ کر دریا میں اتر گئے۔

فرماتے ہیں کہ دریا میں اتر کر بھی میں ان دونوں کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ دریا کے دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ جونہی کچھوا دوسرے کنارے پہنچا، بچھو اس کی پشت سے نیچے اتر گیا اور خشکی پر چڑھ کر دوڑنے لگا۔ میں بھی دریا سے نکل کر اس کے پیچھے ہو لیا کہ آخر یہ کرتا کیا ہے؟ میں نے دیکھا کہ ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں جوانی سے بھرپور ایک نوجوان نہایت گہری نیند سو رہا ہے۔ اب میں نے سوچا کہ یہ بچھو اس نوخیز جوان کو کاٹے گا اور اسے ہمیشہ کی نیند سلا دے گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک نہایت زہریلا سانپ آتے دکھائی دیا جو اپنا پھن اٹھا کر لڑکے کی طرف آ رہا تھا۔ ابھی وہ سانپ اس نوجوان کے پاس پہنچا ہی تھا کہ بچھو آگے بڑھ کر اس سانپ کے سر پر بیٹھ گیا اور اپنے زہر کے ڈنگ اسے مارنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سانپ اس بچھو کے ڈنگوں کی وجہ سے ڈھیر ہو گیا۔ جونہی سانپ مرا بچھو فوری طور پر واپس کنارے کی طرف لوٹا۔ وہاں کچھوا اس کا منتظر تھا۔ بچھو اس کچھوے کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس پار جا پہنچا۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں میں یہ عجیب ماجرا دیکھ کر یہ شعر پڑھنے لگا۔

یا راقداً والجلیل یحفظہ
من کل سوء یکون فی الظلم
کیف تنام العین عن ملک
تاتیہ منک فوائد النعم

یہ اشعار میں نے اس نوجوان کے سرہانے کھڑے ہوئے کر پڑھے۔ وہ میری آواز سن کر جاگ اٹھا۔ میں نے اسے بچھو اور سانپ کا وہ تمام قصہ سنایا اور ایک پھن والے سانپ کو اس کے قریب مرے پڑے دکھایا۔

بعض کتابوں میں ہے کہ حضرت ذوالنونؒ نے سمجھا کہ یہ نوجوان کوئی بڑا بزرگ اور ولی اللہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے لیکن جونہی میں اس کے

قریب ہوا اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ جب اس نوجوان نے وہ سارا واقعہ سنا تو اس پر اس قدر اثر ہوا کہ اس نے اپنی لہو ولعب کی زندگی کو یک قلم ترک کر دیا اور عیاشانہ زندگی سے توبہ کر کے تمام عمر سیاحت اور یاد خدا میں گزار دی۔ کسی نے سچ کہا ہے

کار ساز ما بسازد کار ما
فکر ما درکار ما آزار ما

جب وہ بدعمل اور عیش و عشرت میں غلطاں بندوں کی اس طرح غائبانہ حفاظت فرماتا ہے تو اپنے نیک اور مقرب بندوں کی کیسے حفاظت فرماتا ہوگا۔ شیخ سعدیؒ نے سچ کہا ہے۔

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

◆

قرآن حکیم کے اثرات

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جب انسانوں کے کلام اچھے ہوں یا برے انسانی دل و دماغ اپنی اثر انگیزی دکھاتے ہیں تو اللہ کے کلام سے دلوں پر اثر کیوں نہ ہو گا۔؟ مسلمان تو مسلمان تھے اس کلام کا تو کافروں کے دلوں پر بھی اثر ہوا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عتبہ بن ربیعہ جو مکہ کا ایک سردار تھا، سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ عتبہ قریش میں ایک بہت بڑی حیثیت کا مالک تھا۔ اس کا تعلق بنو امیہ سے تھا اور سحر، کہانت اور شعر گوئی میں یکتائے روزگار تھا۔

عتبہ نے کافی دیر تک آپ سے گفتگو کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ واقعی ہم میں حسب و نسب کے اعتبار سے لائق و فائق ہیں، لیکن آپ نے اپنے مشن کے پرچار سے قوم میں تشتت و انتشار کی تخم ریزی کر دی ہے۔ آپ ہمارے باپ دادا کو احمق، نادان اور جاہل سمجھتے اور بتاتے ہیں، لہٰذا میں اس بارہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' سرکار دو عالم ﷺ سراپا شفقت رحمت تھے۔ آپ نے نہایت شفقت کے جذبات سے فرمایا:

''ابو الولید! کہیے میں سنتا ہوں۔''

عتبہ نے کہا:

''بھتیجے! اگر تم مال دولت کے خواہاں ہو تو ہم سب تمہارے لیے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ ہم میں سے کوئی بھی مال میں سے تمہارا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اور اگر تم عہدہ یا سرداری چاہتے ہو ہم سب تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں، اور اگر حکومت و ریاست کے خواہاں ہو تو ہم تمہیں اپنا حاکم یا بادشاہ بنا لیتے ہیں، اور اگر تم کسی حسین و جمیل عورت سے شادی کے طلبگار ہو تو جس عورت سے یا جتنی عورتوں

سے تم چاہو ہم شادی کر دیتے ہیں، اور اگر تمہیں کسی آسیب وغیرہ کی شکایت ہو تو ہم تمہارا علاج کرانے کے لیے تیار ہیں۔"

جب عتبہ یہ سب کچھ کہہ چکا تو سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

"اب جو میں کہتا ہوں وہ ہوش کے کانوں سے سنو۔"

فرمایا:

> "مجھے تمہارا مال و دولت نہیں چاہیے اور نہ میں تمہاری حکومت اور سرداری کا خواہاں ہوں، میں تو اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور تمہاری طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اگر تم میری دعوت کو قبول کرو تو تمہارے لیے سعادت کونین کا باعث ہوگی، اور اگر میری دعوت کو قبول نہ کرو تو میں صبر و تحمل سے کام لوں گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ شانہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے یہ باتیں کہہ کر آپ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں۔
>
> بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: یہ کلام خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیات صاف اور واضح ہیں۔ ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں اتارا گیا۔ (حم السجدہ: ۱۔۳۸)

یہ ۳۸ آیات جب آپ ﷺ نے تلاوت فرمائیں تو ادھر سرورِ کائنات ﷺ شاداں و فرحاں مصروفِ تلاوت تھے اور ادھر عتبہ بن ربیعہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے دم بخود اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتا جا رہا تھا۔ وہ غور سے قرآن سنتا رہا اور حیرت سے اس پیکر روحانیت کو دیکھتا رہا، جیسے نہ دولت کا لالچ، نہ کسی منصب کی طلب۔ فرماں روائی جیسی نعمت بھی اس کے سامنے پرِکاہ کی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ عتبہ ندامت میں غرق تھا کہ ایسے قدسی صفات شخص کو آسیب زدہ قرار دیا جائے۔ یہ تو اپنے کلام میں نہایت قیمتی حقائق بیان کر رہا ہے۔

عتبہ خود ایک بہت بڑا شاعر تھا اور شعر کے اسرار و رموز اور نشیب و فراز سے آشنا تھا، لہٰذا وہ سمجھا کہ یہ آیات جو محمد ﷺ تلاوت فرما رہے ہیں، فصاحت و بلاغت میں اعجاز کا نمونہ ہیں۔

عتبہ اٹھا اور سیدھا اپنے ان ساتھیوں کے پاس آیا جنہوں نے اسے اپنا نمائندہ بنا کر محمد ﷺ کے پاس بھیجا تھا۔ قرآن اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اثر کر چکا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال اب پہلے سے مختلف تھے۔ اسے واپس آتا دیکھ کر وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''بخدا! ابوالولید تمہارے پاس وہ چہرہ لے کر نہیں آ رہا جو چہرہ لے کر وہ گیا تھا۔'' عتبہ کے قلب پر اس کلام کے اچھے خاصے اثرات تھے۔ چنانچہ انہوں نے پوچھا: کیا خبر ہے؟''

عتبہ نے کہا:

> ''میں نے محمد (ﷺ) سے ایک ایسا کلام سنا ہے جو اس سے قبل میں نے کبھی کسی سے نہیں سنا۔ بخدا! نہ وہ شعر ہے اور نہ جادو، اور نہ وہ کہانت ہے۔ قریش کے لوگو! میری بات مانو: محمد (ﷺ) کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ بخدا! میں نے اس کا جو قول سنا ہے اس سے کوئی زبردست واقعہ ہو کر رہے گا۔''

چنانچہ عتبہ کی بات سچی نکلی اور اس سے وہ واقعہ رونما ہو گیا جس نے دنیا کی تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا۔

بجائے اس بات کے کہ قریش ملہ اپنے اس دانشور کی بات پر غور و فکر کرتے اور اپنی زندگی کے دھارے کو بدلتے، انہوں نے وہی جواب دیا جو وہ اکثر رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے جواب میں دیتے تھے۔ عتبہ کی یہ بات سن کر قریش کے رؤساء نے کہا:

> ''ابوالولید! بخدا! تم پر بھی محمد (ﷺ) کے کلام کا اثر ہو گیا ہے۔''

(البدایہ والنہایہ: جلد ۳ ص ۶۳، زرقانی: جلد ۱ ص ۲۵۷، عیون الاثر: جلد ۱ ۱۹۶)

ایک اور روایت میں ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے جب تلاوت شروع کی تو عتبہ ہمہ تن ہو کر سنتا رہا۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے۔

﴿فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود﴾ (۱۳:۱۴)

''پس اگر وہ روگردانی کریں تو آپ فرما دیں کہ میں تمہیں ایک

ایسی کڑک (عذاب) سے خبردار کر رہا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک جیسی ہوگی۔"

پہلے تو عتبہ بیٹھ کر آپ کے منہ سے یہ قرآنی آیات سن رہا تھا لیکن جب آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو عتبہ تھرا کر کھڑا ہوگیا اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے منہ پر رکھ دیا کہ وہ آپ کو اللہ اور اپنی قرابت کا واسطہ دیتا ہوں کہ ایسا نہ کریں۔ اسے یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں وہ کڑک آن نہ پڑے۔"

یہ تو ایک کافر پر قرآن حکیم کے اثرات تھے۔ اللہ کے اس کلام کے اثرات ہر زمانہ میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ کافروں پر بھی ہوتے رہے۔ خود سرکار دو عالم ﷺ پر بھی اس کے اثرات مختلف مواقع پر ہوئے جو صحابہ کرامؓ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کی داڑھی کے سفید بال دیکھ کر پوچھا:

"یارسول اللہ! آپ تو بہت جلدی بوڑھے ہوگئے۔"

آپ نے اپنے بڑھاپے کی وجہ دن رات کی مشقت بیان نہیں فرمائی بلکہ فرمایا:

"مجھے تو سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۂ القارعہ، اذا الشمس کورت اور سال سائل نے بوڑھا کر دیا۔"

(قیام اللیل مروزی: ص ۵۸)

یہ وہ سورتیں ہیں جن میں قیامت کے ہولناک واقعات بیان ہوئے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سرکار دو عالم ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ علم و فضل میں اپنی مثال آپ۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا:

"عبداللہ! مجھے قرآن سناؤ۔"

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے عرض کی: "یارسول اللہ! قرآن تو آپ پر نازل ہوا، اور میں آپ کو قرآن سناؤں۔"

"میں نے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے سورۃ النساء کی تلاوت شروع کر دی۔ جب اس آیت پر پہنچا:

﴿فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید﴾

> ”یعنی اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ حاضر کریں گے۔“

سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

> ”اب بس کرو۔“

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

> ”میں نے آپ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرات آپ کی ریش مبارک پر گر رہے تھے۔
>
> (بخاری: جلد۲ص ۶۵۹)

ماضی میں تو قرآن حکیم کی اثر انگیزی کے بے شمار واقعات ہیں جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ عہد صحابہ میں بھی اور بعد کے زمانوں میں بھی۔ ماضی قریب میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے بارہ میں لکھا ہے۔

> ”حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت شان چونکہ آپ کی رگ رگ میں پیوست تھی، اس لیے قرآن مجید کی تلاوت کے وقت آپ پر اکثر اس حالت کا غلبہ ہوتا، اور اگر اغیار سے مجلس خالی ہوتی تو اس کا اظہار بھی ہو جاتا تھا۔ آخر شب میں جب کہ خالی مکان کے اندر آپ اپنے آقا کے حضور میں دست بستہ کھڑے ہوتے اور نوافل میں قرأت قرآن مجید شروع فرماتے تو عموماً آپ پر گریہ طاری ہوتا، اور پڑھتے پڑھتے رک رک جاتے تھے۔ سسکیاں آپ کا حلق تھام لیتیں اور بکاء پر مجبور کرنے والی حالت آپ کو ساکت و صامت بنا دیا کرتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہتے اور رخسارہ و لحیہ (ڈاڑھی) پر گذرتے ہوئے موتیوں کی طرح مصلی پر گرا کرتے تھے۔ آپ آیات کلام اللہ سے صرف تجلیات و معرفت ہی کے حاصل کرنے پر اکتفا نہ فرماتے تھے بلکہ اس کے ساتھ آپ کے اعضاء جسم پر ایک خاص اثر اور وہ حالت پیدا ہوا کرتی تھی جو

مضمون آیت کے مناسب ہوتی تھی۔ تلاوت میں آپ جب ایسی آیت پر پہنچے جہاں ذکر رحمت اور وعدۂ مغفرت ہے۔ تو رجاؤ مسرت سے انبساط پیدا ہوتا، اور جس وقت وہ آیت پڑھتے جہاں غضب و وعید عذاب مذکور ہے تو آپ کا بدن کانپنے لگتا اور رعشہ پڑ جاتا تھا۔ حق تعالیٰ شانہ کی کبریائی اور بے نیازی کا مضمون پڑھتے تو گردن جھک جاتی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جلال خداوندی کے مشاہدے سے نیست ونابود ہوئے جاتے ہیں، اور تخویف و ترہیب کے مضمون پر گزرتے تو ہیبت کے سبب رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ خوف کے مارے دبے جاتے اور گویا زمین میں گڑے جاتے ہیں۔ آپ کے تاثر کی یہ طبعی حالت بعض وقت متعدی ہوتی اور اقتداء کرنے والے نمازیوں پر بھی طاری ہو جاتی تھی۔ مولوی عبدالرحمٰن خورجوی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں گنگوہ حاضر ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور تراویح میں کلام اللہ حضرتؒ ہی سنایا کرتے تھے۔ ایک شب آپ نے تراویح شروع کیں۔ میں بھی جماعت میں شریک تھا۔ قرآن مجید پڑھتے پڑھتے آپ اس رکوع پر پہنچے جس میں خوف وخشیہ دلایا گیا تھا۔ جماعت میں حالانکہ نصف سے کم عربی زبان کے سمجھنے والے تھے اور باقی سب ناواقف، مگر آپ کے اس رکوع کی قرأت پر خوف کا اثر سب پر پڑ رہا تھا۔ کوئی روتا تھا اور کسی کے بدن پر لرزہ، کوئی بے قرار اور کوئی تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس رکوع کے بعد جب آپ نے دوسرا رکوع شروع کیا تو اس میں رحمت خداوندی کا بیان تھا۔ اس وقت دفعتاً تمام جماعت پر سرور طاری ہو گیا اور پہلی حالت یک لخت منقلب ہو گئی۔ فرحت وانبساط کے ساتھ یہاں تک کہ بعض مقتدی ہنسی ضبط نہ کر سکے اور قہقہہ جاری ہو گیا۔" (تذکرۃ الرشید: جلد۲ص ۱۹۸)

اس ساری تمہید کا اصل مقصد مفتی عزیز الرحمٰن قدس سرہ کی تلاوت کا حال بتانا تھا کہ مفتی صاحبؒ ایک نہایت سیدھے سادے خدا ترس شخص تھے۔ وہ مکتب و خانقاہ کی مخلوق تھے۔ نہایت متوکل اور صابر شخص تھے۔ کبھی کسی امیر کے دروازہ پر جبین نیاز نہ جھکائی۔

دامن توکل کی یہ خوبی ہے کہ اس میں
پیوند تو ہو سکتے ہیں دھبے نہیں ہوتے

ان کے بارہ میں ان کے ایک شاگرد نے لکھا ہے:

"وہ قرآن کے حافظ تھے۔ میں نے سنا ہے کہ مغرب کے بعد اوابین والی نماز میں آٹھ پارے روزانہ پڑھنے کے ملتزم تھے۔ اپنی مسجد میں امامت خود کرتے تھے۔ ان کی قرأت پر ایک سیدھے سادے ہندوستان کے قصباتی مسلمان کے لب و لہجہ کا رنگ غالب تھا۔ اگرچہ اصولِ تجوید کے ہر قاعدے کی پوری رعایت کی جاتی تھی بلکہ شاید تجویدی اصولوں کے مطابق قرأت ان کی عادت ہوگئی تھی، لیکن مصنوعی قرأت سے دور کا سروکار بھی ان کی قرأت نہیں رکھتی تھی، کبھی کبھی کسی کسی وقت کی نماز پڑھ لینے کی سعادت اس کور بخت کو بھی اللہ کے اس ولی کے پیچھے میسر آ جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا شبیر احمد مرحوم پر صوفیانہ مشاغل کا غلبہ تھا۔ مفتی صاحبؒ کی مسجد کے حجرے میں وہ چلہ کش تھے۔ فقیر بھی تراویح کے وقت حاضر ہو جاتا اور چند ٹوٹے پھوٹے سننے والے مسلمانوں کے ساتھ یہ بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ ایسا کیوں کرتا تھا، نہ قرأت ہی میں کان کو کوئی خاص لذت ملتی تھی نہ کچھ اور تھا، لیکن دل یہی کہتا تھا کہ شاید زندگی میں پھر ایسے سیدھے سادے لہجے میں قرآن سننے کا موقع نہ ملے گا۔ اور دل کا یہ فیصلہ صحیح تھا۔ نمازیوں میں مولانا شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک رہتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دفعہ جو واقعہ پیش آیا۔ اب بھی جب اسے سوچتا ہوں تو رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل کانپنے لگتا ہے۔ مفتی صاحب قبلہؒ حسب دستور وہی اپنی نرم نرم سبک رو آواز میں قرآن پڑھتے چلے جاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں قرآنی آیت "وبرزوا للہ الواحد القہار" (اور کھل کر لوگ سامنے آگئے اللہ کے جو اکیلا اور سب پر غالب ہے) پر پہنچے، نہیں کہہ سکتا کہ مفتی صاحبؒ خود کس حال میں تھے۔ کان میں قرآن کے یہ الفاظ پہنچے اور کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کائنات کا سارا حجاب سامنے سے اچانک ہٹ گیا اور انسانیت کھل کر اپنے وجود کے آخری سرچشمے کے سامنے کھڑی ہے۔ گویا جو کچھ قرآن میں کہا گیا تھا، محسوس ہوا کہ وہی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اپنے آپ کو اسی حال میں پا رہا تھا، شاید خیال یہی تھا کہ غالباً میرا یہ ذاتی حال ہے، مگر پتہ چلا کہ میرے اغل بغل جو نمازی کھڑے ہوئے تھے، ان پر بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت طاری تھی، مولانا شبیر احمد صاحبؒ کی بے ساختہ چیخ نکل پڑی۔ یاد آرہا ہے کہ چیخ کر غالباً وہ تو گر پڑے۔ دوسرے نمازی بھی لرزہ براندام تھے۔ چیخ و پکار کا ہنگامہ ان میں بھی برپا تھا، لیکن مفتی صاحب کوہ وقار بنے ہوئے امام کی جگہ اسی طرح کھڑے تھے۔ جدید کیفیت ان پر جو تھی وہ صرف یہی تھی کہ خلاف دستور بار بار اس آیت کو مسلسل دہراتے چلے جاتے تھے۔ جیسے جیسے دہراتے نمازیوں کی حالت غیر ہوتی چلی جاتی۔ آخر صف درہم برہم ہوگئی۔ کوئی ادھر گرا ہوا تھا، کوئی ادھر پڑا ہوا تھا۔ آہ آہ کی آواز مولانا شبیر احمد کی زبان سے نکل رہی تھی۔ صف پر ایک طرف وہ بھی پڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد لوگ اپنے آپ میں واپس ہوئے۔ تازہ وضو کر کے پھر نئے سرے سے صف میں شریک ہوئے۔ جہاں تک خیال آتا ہے مفتی صاحب دار و گیر، چیخ و پکار، صیحہ و نعرہ کے ان تمام ہنگاموں میں اپنی جگہ

کھڑے ہوئے اس آیت کریمہ کی تلاوت میں مشغول رہے۔
جب دوبارہ صف بندی ہوئی تب پھر آگے بڑھے۔"

(احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، مولانا مناظر احسن گیلانی، ص ۱۰۰)

اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ نہ ایسے امام اور نہ ہی ایسے مقتدی۔ آج کل تو ایک دو گھونٹ اگر کسی کو میسر ہوں تو اسی سے بہک جاتے ہیں، لیکن وہ تو "ساقی تیری خیر" کہتے ہوئے پوری صراحی غٹا غٹ پی جاتے تھے لیکن کیا مجال کہ ان کی نگاہیں بھٹکیں اور قدم ڈگمگائیں۔ آج کل کتنے لوگ ہیں جو ذرا سی "حرارت" ملنے پر دانۂ اسپند کی طرح توے پر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ظرف کے اتھلے پن اور پانی کے گدلے پن کی نشانی ہوتی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے

بھیڑ میں دنیا کی جانے وہ کہاں گم ہو گئے
کچھ فرشتے بھی رہا کرتے تھے انسانوں کے ساتھ

* * *

ایک بادشاہ درویشوں کے دروازہ پر

سلطان شمس الدین ایلتمش (م ۶۳۳ھ) اسلامی ہند کا پہلا خود مختار فرماں روا تھا جو دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اور تقریباً ۲۵ سال تک اس نے نہایت شان و شوکت سے برصغیر پاک و ہند پر حکومت کی۔ اس کے دربار کی رونق محمود اور سنجر کے درباروں کی یاد تازہ کرتی تھی۔ بعض لوگ اسے ''عالمگیر'' کہتے ہیں، لیکن صحیح لفظ ''التمش'' ہے جس کے معنی ''حکومت قائم کرنے والا'' یا ''عالمگیر'' ہے۔ (تاریخ جہاں کشا: جلد۲ ص ۶۱) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایلتمش اس کا خاندانی نام تھا یا تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اختیار کیا۔

ایلتمش ابھی نو یا دس برس کا تھا کہ اس کے ظاہری جمال اور باطنی خوبیوں کیوجہ سے اس کے بھائی اس سے حسد کرنے لگے۔ حاسد بھائیوں نے اس کو بخارا کے بازار میں لے جا کر فروخت کر دیا جہاں صدر جہاں کے ایک عزیز نے اسے خرید لیا۔ یہ خاندان اپنی بزرگی اور طہارت کی وجہ سے مشہور تھا۔ یہاں ایلتمش کی تعلیم و تربیت بالکل اپنی اولاد کی طرح کی گئی۔ اس خاندان میں رہتے ہوئے ایک معمولی سے واقعہ نے ایلتمش کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ ہوا یہ کہ ایک روز صاحب خانہ نے بازار سے انگور خریدنے کے لیے بھیجا۔ ایلتمش بچہ تو تھا ہی، کہیں راستہ میں پیسے کھو دیے اور بازار میں کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ایک درویش اس طرف سے گزرا۔ ایلتمش سے رونے کی وجہ پوچھی اور حال معلوم ہونے پر اپنے پاس سے انگور خرید کر دیے۔ چلتے وقت کہا: ''دیکھو! جب تم صاحب دولت و سلطنت ہو جاؤ تو فقیروں اور درویشوں کا احترام کرنا اور ان کے حقوق کی پاسبانی اپنا فرض جاننا۔'' ایلتمش نے وعدہ کیا اور اپنے گھر آ گیا۔

کہنے کو تو یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن ایلتمش کو مدت العمر فقراء اور درویشوں سے جو بے پناہ محبت رہی اس کی بنیاد دراصل اسی روز رکھی گئی تھی۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے یہ واقعہ اکثر اپنے دربار میں عمائدین سلطنت کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ

ہر دولت و سلطنت کہ یافتم از نظر آن درویش یافتم

جو کچھ دولت اور سلطنت مجھے ملی ہے یہ اسی درویش کی نظر کا فیض ہے۔ (طبقات ناصری: ص ۱۶۷)

بخارا میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد التمش بغداد آیا یہاں بھی اس کا آقا درویشوں سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس کے گھر میں درویشوں کی مجلس ہوتی تھی اور التمش تمام رات ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر رہتا۔ (فتوح السلاطین: ص ۱۱۹)

التمش جس زمانہ میں بغداد میں تھا، اس زمانہ میں بغداد ایک زبردست روحانی مرکز تھا جگہ جگہ خانقاہیں قائم تھیں جن سے فیضان الٰہی کے چشمے ابل رہے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ التمش اس ماحول میں رہتے ہوئے اس سے متاثر نہ ہوتا۔ وہ ایک روز کچھ پیسے لے کر شیخ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ مؤدب بیٹھ کر بٹوے سے کچھ پیسے نکال کر شیخ شہاب الدین کی خدمت میں پیش کیے۔ حضرت نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا:

من از چہرۂ ایں شخص انوار سلطنت لامع می بینم

میں اس شخص کے چہرہ پر انوار سلطنت درخشاں دیکھ رہا ہوں۔

سنہ ۱۲۱۰ء میں التمش دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ مذہب کی جو عظمت اور محبت ابتدائی زمانہ میں التمش کے دل میں قائم ہوگئی تھی وہ تخت نشینی کے بعد بھی اس کے قلب و جگر کو گرماتی رہی اور سیاسی زندگی کی مصروفیتیں اس کے روحانی مشاغل میں حارج نہیں ہوئیں۔ چنانچہ خزینۃ الاصفیاء میں لکھا ہے کہ

اگرچہ بظاہر تعلق بہ بادشاہی داشت لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود

اگرچہ ظاہر میں اس کا تعلق بادشاہی سے تھا لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے وہ فقیر اور فقیر دوست تھا۔ (خزینۃ الاصفیاء: جلد ۱، ص ۲۷۶)

التمش جس زمانہ میں دہلی کے تخت پر بیٹھا اس زمانہ میں صدہا علماء اور مشائخ وسط ایشیاء کے حالات سے بد دل ہو کر ہندوستان آ رہے تھے۔ سلطان نے ان بزرگوں کا پرجوش خیر مقدم کیا، اور انہیں شاہی مہمان رکھا۔ سلطان کو جب کسی بزرگ کی آمد کی اطلاع ملتی تھی تو میلوں تک استقبال کے لیے نکل جاتا تھا۔ جب شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی

بغداد سے دہلی تشریف لائے تو سلطان ان کے استقبال کے لیے دور تک گیا اور ''جوں ہی شیخ کو دیکھا گھوڑے سے اتر کر ان کی طرف دوڑا۔''

سید محمد گیسو درازؒ کی روایت ہے کہ

> ''ہر جمعہ کی رات کو بوڑھی عورتوں کے گھروں اور فقیروں کے پاس جاتا تھا۔ ایک کروہ سیم، چار پانچ تنکے، چند سیر مٹھائی ان کے سامنے رکھتا تھا، اور ان کے پیروں پر گرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تمہارا غلام ہوں اور تم میری مائیں ہو۔''

ایک مرتبہ دہلی میں شدید قحط پڑا۔ بارش نہ ہونے کے باعث غلہ کی قیمت بڑھ گئی۔ لوگ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ التمش پر اس کا بے حد اثر ہوا۔ ایک درباری کو حکم دیا کہ

> ''اس شہر کے اہل اللہ اور درویشوں کے پاس جا کر میرا سلام اور ہدیۂ نیاز پہنچا اور ان کی خدمت میں عرض کر کہ ظلم کا اور فتنہ کا دفع کرنا بادشاہوں کا کام ہے میں اس کام میں کوتاہی نہیں کرتا۔ حق تعالیٰ کی طرف توجہ باطن اور خلق کی بہتری کے لیے دعا کرنا آپ کا حق ہے۔ اللہ کی طرف توجہ کیجیے اور دعا استسقاء فرمایئے تا کہ آپ کی دعاؤں کی برکت اور توجہ سے حق تعالیٰ شانہ کرم فرمائے اور باران رحمت نازل فرمائے۔''

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ تھے، ملتان میں ان دنوں قباچہ کی حکومت تھی لیکن شیخ بہاء الدین زکریاؒ اس کے مخالف یعنی التمش سے ہمدردی رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد التمش ملتان پر قابض ہو گیا۔ چنانچہ شیخ بہاء الدین ملتانی نے نہ صرف سلطان التمش سے ذاتی تعلقات قائم کیے بلکہ شیخ الاسلام کا عہدہ بھی قبول کر لیا۔ (سیر العارفین: ص ۱۶۹)

التمش کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اس عقیدت کے پیش نظر سلطان کو خواجہ صاحب کے مریدوں میں شمار کیا

ہے۔ جب قطب صاحب دہلی تشریف لائے تو سلطان نے بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا اور ان سے گذارش کی کہ شاہی محل کے قریب ہی قیام فرمائیں لیکن قطب صاحبؒ نے یہ درخواست قبول نہ کی تو سلطان نے ہفتہ میں دو بار ان کی قیام گاہ پر حاضر ہونا اپنا معمول بنالیا۔

ایک بار خواجہ معین الدین اجمیریؒ دہلی تشریف لائے تو انہوں نے بعض وجوہات کی بنا پر قطب صاحبؒ کو اپنے ہمراہ اجمیر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ سلطان التمش کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ خود ہزاروں عقیدت مندوں کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کے پیچھے پیچھے میلوں تک گیا۔ خواجہ میر خورد کا بیان ہے کہ

> ”پس شیخ قطب الدین اپنے شیخ کے ہمراہ اجمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ اس بات سے تمام شہر دہلی میں ایک شور برپا ہو گیا۔ تمام اہالیان شہر مع سلطان شمس الدین ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ جہاں شیخ قطب الدین قدم رکھتے تھے لوگ اس زمین کی خاک تبرک کے طور پر اٹھا کر رکھ لیتے تھے۔“ (ہر جا شیخ قطب الدین قدم ی گذاشت خلائق خاک آں زمین بہ تبرک برمی داشت)
>
> (سیر الاولیاء: ص ۵۳)

خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے جب عوام اور سلطان دونوں کو یکساں رنجیدہ پایا تو قطب صاحبؒ کو دہلی ہی میں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔ التمش نے فرط مسرت میں خواجہ صاحبؒ کے قدم چوم لیے اور قطب صاحبؒ دہلی واپس چلے آئے۔

سلطان التمش ایک مرتبہ رات کو قطب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ قطب صاحبؒ نے گھبرا کر پوچھا: ”تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے؟“ جواب دیا: ”خدا کے فضل و کرم سے مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کل جب قیامت برپا ہوگی تو مجھے کس گروہ میں شمار کریں گے۔“ امیر خسروؒ کہتا ہے

ے

در حجرۂ فقر بادشاہے
در عالم دل جہاں پناہے
شاہنشہ بے سریر و بے تاج
شاہانش بہ خاک پائے محتاج

یہ ہیں وہ بادشاہ اور سلاطین جو آج کل کے جمہوری صدوروں سے جو اپنے کو عوام کے نمائندے کہتے ہیں لیکن عوام سے تعلق ان کا صرف ووٹ لینے تک ہوتا ہے، اس کے بعد عوام کی ان تک رسائی تو بڑی بات ہے، عوام کو وہ اپنا منہ دکھانا بھی اپنے لیے باعث ہتک سمجھتے ہیں۔ جس راستے سے گذرتے ہیں میلوں ٹریفک بند ہو جاتی ہے۔ آج کل یہ صدور اس زمانے کے بادشاہوں کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

◆

﴿دریا کا پاٹ بھی انہیں نہ بچا سکا﴾

مدائن کا شہر دو حصوں پر منقسم تھا۔ آدھا دجلہ کے اس طرف اور آدھا دوسری طرف۔ دجلہ کے اس طرف کے حصہ کو بہر شیر کہتے ہیں جس کو مسلمانوں نے نہایت آسانی سے فتح کرلیا۔ اب مدائن اور اسلامی فوج کے درمیان صرف دریائے دجلہ تھا جس کی تند و تیز موجیں مسلمانوں کو روکے ہوئے تھیں۔ سیدنا سعدؓ دجلہ کے کنارے ان موجوں کو دیکھ رہے تھے اور دریا کو پار کرنے کے بارہ میں غور و فکر کر رہے تھے۔ کچھ اور فوجی افسر بھی ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ اب مدائن کا بارونق شہر بغیر کسی رکاوٹ کے ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ مدائن جہاں سے ان کے وفد کے ارکان کو ذلیل کر کے نکالا گیا تھا اور مٹی کا بورا ان پر لادا گیا تھا۔ اب آدھی رات کے وقت مسلمان فوجی جرنیل حیرت و استعجاب کی تصویر بن کر اس شہر کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ ان کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت ہے یا خواب۔ ابھی وہ شہر کے در و دیوار ہی دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک آواز گونجی۔ یہ آواز ضرار بن خطاب کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہے تھے:

مسلمانو! اللہ اکبر، وہ دیکھو سامنے کسریٰ کا سفید محل ہے جسے قصر ابیض (White House) کہتے ہیں۔ وہی محل جس پر قبضے کی سرکار دو عالم ﷺ نے بشارت دی تھی۔

یہ عمارت ایسی بلند تھی کہ اتنی بلند عمارت مسلمانوں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ ایک شاندار عمارت، عظمت و شوکت کا جلال آفرین مرقع، اس کی سفیدی کو رات کی گھنی تاریکی نے اور بھی نکھار دیا تھا، اس کی دل کشی اور رعنائی نے فوجیوں کے سانسوں کو روک دیا تھا۔ اب دریا کو پار کر کے ان کے دل میں ایوان کسریٰ میں داخل ہونے کا شوق انگڑائیاں لینے لگا۔ مسلمانوں کا یہ جوش و خروش دیکھ کر ان کا سپہ سالار غور و فکر کے اتھاہ

سمندر سے اُبھرا اور اس دجلہ کو پار کر کے ایوان کسریٰ میں داخل ہونے کا عزم بے باکانہ اس کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔

کسریٰ کے اس قصر ابیض کو دیکھ کر مسلمانوں کا متحیر اور مبہوت ہو جانا کوئی حیرانی کی بات نہ تھی۔ یہ محل تھا ہی اس قابل کہ اپنے دیکھنے والوں کو مبہوت کر دے۔ چنانچہ یہ اس زمانے عجائبات عالم میں شمار ہوتا تھا۔ یہ محل نوشیروان نے ۵۵۰ء میں بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر میں رومی، یونانی اور ایرانی فن تعمیر کی تمام نزاکتیں صرف کر دی گئیں تھیں۔ اس کے سامنے کا حصہ ایک سو پچاس میٹر سے زیادہ چوڑا تھا اور بلندی چالیس میٹر تھی۔ پانچوں دلانوں پر بڑے بڑے گنبد اس کی عظمت و جلال کو تاج پہنا رہے تھے۔ ان گنبدوں میں کتنے خزانے بھرے پڑے تھے یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ صدر دالان جس کا گنبد سب سے اونچا تھا، کسریٰ کا ایوان تھا، جس کی مثال تمام دنیا میں نہیں ملتی تھی۔ جو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ تماشائیں بڑے بڑے بادشاہوں کی ٹکٹکی بندھ جاتی۔ دنیا اسے عجوبہ سمجھ کر اس کی پرستش کرتی رہی۔ اس وقت اسے بنے ہوئے قریباً سو سال ہو گئے تھے، لیکن معلوم ایسا ہوتا کہ کاریگر ابھی بنا کر فارغ ہوئے ہیں۔

ادھر مسلمانوں کے دلوں میں اس قصر ابیض پر قبضہ کرنے کے خیالات انگڑائیاں لے رہے تھے اور وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ وہ اس سفید ایوان میں جلد از جلد قبضہ کرنے کی سوچ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں اور کئی خیالات اور جذبات مچل رہے تھے، لیکن دوسری طرف یزدگرد کسریٰ ایران اپنے ایوان میں پراگندہ خاطر بیٹھا تھا اور طرح طرح کے وسوسے اور خیالات اس کے دل و دماغ میں چبھ رہے تھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ دریائے دجلہ کا یہ چوڑا پاٹ اور اس کی تند و تیز موجیں ایک قدرتی فصیل کا کام کر رہی ہیں۔ اس کی کف آگین موجیں اور اس کا گہرا پانی عربوں کو روکے رکھے گا اور انہیں اسے عبور کرنے کی جرأت و ہمت نہیں ہوگی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس خیال کی خود تردید کر دیتا اور اپنے آپ سے کہتا کہ جب بڑے بڑے خونخوار ہاتھی اور شیر، میری لاکھوں کی تعداد میں فوج ان کا راستہ نہیں روک سکی تو اس دریا کی کیا حیثیت ہے۔ وہ مسلمانوں کو جنات اور دیو سمجھنے لگا تھا جن کی راہ میں کوئی قوت مزاحم نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی

طاقت ان کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اب اس کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ بھاگ کر اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان بچائے۔ چنانچہ اس نے شاہی خدام کو حکم دیا کہ قیمتی سامان، خزانہ، حرم شاہی اور شہزادے شہزادیوں کو لے کر حلوان چلے جائیں۔ لوگوں نے جب بادشاہ کا یہ حال دیکھا تو وہ بھی حوصلہ ہار گئے اور وہ بھی اپنے اور اپنے اہل وعیال کی فکر کرنے لگے۔ چنانچہ ایرانیوں کی قوت مدافعت بالکل جواب دے گئی اور اب دریائے دجلہ کے سوا کوئی انہیں مجاہدین اسلام کے حملہ سے نہیں بچا سکتا تھا۔

دریائے دجلہ اب دو لشکروں کے درمیان بہہ رہا تھا۔ ایک طرف وہ لشکر جس کی تمام قوتیں مضمحل ہو چکی تھیں اور ان کا اپنا کوئی ارادہ نہیں رہا تھا۔ اور دوسری طرف وہ لشکر تھا جس کی معنوی روح بلندی کے نقطۂ کمال پر تھی، جس کے دل میں ایمان کی روشنی تھی، ایمان کی طاقت تھی۔ وہ دریا کو اور اس کی خشمگیں موجوں کو کچھ نہیں سمجھتا تھا بلکہ دریا اس کے لیے پایاب تھا۔ اسے نہ پلوں کی ضرورت تھی اور نہ دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتیوں کی حاجت۔

اسلامی فوج کے سامنے اب سب سے بڑا مسئلہ دجلہ کو عبور کرنے کا تھا۔ سپہ سالار لشکر ہر وقت اسی خیال میں غرق تھے۔ اتنے میں انہیں اطلاع ملی کہ یزدگرد نے اپنا خزانہ حلوان منتقل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ اس وقت انہوں نے اپنے جرنیلوں کو اور سپاہیوں کو اکٹھا کر کے ایک تقریر کی۔ فرمایا:

> ''میرے ساتھیو! دشمن نے اس دریا کو اپنی سپر بنایا ہے۔ تم اس میں سے گزر کر اس کی طرف نہیں جا سکتے لیکن وہ جب چاہے کشتیوں میں بیٹھ کر تمہاری طرف آ سکتا ہے اور تم پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ تمہاری پشت پر کوئی خطر نہیں جس سے خوف کھایا جائے لیکن قبل اس کے کہ دنیا تمہیں گھیر لے، تم قدم بڑھا کر دشمن پر حملہ کر دو۔ میں عزم کر چکا ہوں کہ دریا عبور کر کے ان تک ضرور پہنچوں گا۔''

سپہ سالار سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر سب نے یک زبان ہو کر کہا: ''اپنے ارادہ کو روبہ عمل لائیے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، لیکن سوال یہ

پیدا ہوتا تھا کہ دریا کو عبور کیسے کیا جائے؟ اگر وہ کشتیوں پر بھی دریا عبور کریں تو ایرانی لشکر دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑا خشمگین نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ انہیں دریا سے باہر کیسے نکلنے دے گا؟ سیدنا سعدؓ نے ایک بات صلائے عام کے طور پر کہی کہ "کون ہے جو پہلے اس کنارے پر جا کر دشمن کو روکے تاکہ وہ لشکر کو دریا پار کرنے سے باز نہ رکھ سکیں۔ سیدنا سعدؓ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر قوت و شجاعت کے پتلے حضرت عاصم بن عمروؓ نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے پیش کیا۔ ان کے ساتھ چھ سو جانباز اور تیار ہو گئے۔ سیدنا سعدؓ نے عاصمؓ کو ان کا افسر بنا دیا۔ جب یہ لوگ دریائے دجلہ کے کنارہ پر پہنچے تو عاصمؓ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

"دوسرے کنارے پر پہنچنے کے لیے دریا میں سب سے پہلے میرے ساتھ کون اترے گا؟ ساٹھ سوار آگے بڑھے۔ انہوں نے دوسروں سے کہا: "تم اس پانی سے ڈر گئے؟" پھر یہ آیت پڑھی

﴿وما كان لنفس ان تموت الا باذن الله كتابا مؤجلا﴾

(۳ ۱۴۵)

"اور کوئی شخص مر نہیں سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو۔ اس نے لکھ رکھا ہے وقت مقررہ پر۔"

یہ کہہ کر سیدنا عاصم بن عمروؓ نے دریا میں گھوڑا ڈال دیا اور ان کے پیچھے ان کے ساتھی بھی دریا میں اتر گئے۔ قعقاع بن عمروؓ نے دیکھا کہ مجاہدین اسلام کی یہ ٹکڑی آگے بڑھ رہی ہے اور دریائے دجلہ کے دوسرے کنارے پر ایرانی ان سے مقابلہ کی تیاری کر رہے ہیں تو انہوں نے اپنے چھ سو ساتھیوں کو حکم دیا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ انہوں نے بھی اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے۔ ایرانی فوجیں یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئیں۔ ان میں سے کچھ تو انہیں تکنے لگے اور کچھ نے کہا کہ "یہ انسان نہیں دیو اور جن ہیں۔"

تھوڑی دیر تو ایرانی انہیں حیرت سے تکتے رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عاصمؓ اور ان کے ساتھی دریا کے وسط میں پہنچ گئے ہیں تو مقابلہ کے لیے چند سوار دریا میں

اتار دیے۔ جب یہ لوگ عاصمؓ کے قریب پہنچے تو سیدنا عاصمؓ نے ساتھیوں سے کہا: "تیر چلاؤ اور ان کی آنکھیں پھوڑ دو۔" اب جب مسلمان فوجیوں نے ایک ساتھ تیر چلائے اور وہ ایرانی گھوڑوں اور ان کے سواروں کی آنکھوں میں ترازو ہونے لگے تو وہ گھبرا کر پلٹے، اور مسلم مجاہدین تھے کہ ہنستے کھیلتے دریا کی مرگ آفریں موجوں کا سینہ چیرتے چلے جا رہے تھے اور دجلہ کا ساحل سہم کر ان جگرداروں کو تکنے لگا۔ کیسے صاحب عزم اور صاحب ایمان تھے یہ لوگ، دریا میں چلے تو اس شان کے ساتھ کہ صفوں کی ترتیب میں فرق نہ آیا۔ یمین و یسار برابر تھے اور دشمن کا خیال یا موت کا خوف ان میں سے کسی کو چھو کر بھی نہ گیا تھا۔

عاصمؓ جب اپنے ساتھیوں سمیت دوسرے کنارے پر پہنچے تو ایرانی انہیں دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عاصمؓ کے پیچھے قعقاعؓ بھی اپنے چھ سو کے دستے کو لے کر کنارے پر پہنچ گئے۔ اس وقت مشرقی کنارے پر ایک بھی سپاہی نہ تھا۔ سیدنا سعدؓ نے جب دیکھا کہ مدائن والے کنارے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ہے تو انہوں نے باقی سواروں کو بھی دریا عبور کرنے کا حکم دے دیا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ ساٹھ ہزار اسلامی شہ سوار دجلہ میں پھیلے ہوئے اس طرح بے تکلف باتیں کرتے جاتے تھے گویا باغ کی روشوں پر تفریح کے لیے چہل قدمی کر رہے ہیں، کوئی دریا میں ڈوبا اور نہ ہی کسی کی کوئی شے ضائع ہوئی۔ البتہ ایک شخص غرقدہ نامی گھوڑے سے پانی میں گر پڑے، لیکن ان کے ساتھ قعقاعؓ نے فوراً انہیں نکال لیا۔ ایک سوار کا لکڑی کا پیالہ دریا میں گر گیا اس پر اس کے ایک ساتھی نے مذاق کے طور پر ان سے کہا کہ "تقدیر نے اس کو اڑا دیا۔" اس نے کہا: "بخدا! میں ایسے حال میں ہوں کہ لشکر بھر میں صرف میرا پیالہ کبھی سلب نہیں کیا جائے گا۔" چنانچہ اس شخص کے اخلاص اور صدق کی وجہ سے یوں ہوا کہ جب لشکر دریا پار کر چکا تو دریا کی موج نے اس پیالہ کو کنارہ پر پہنچا دیا۔ ایک شخص نے اٹھایا اور مالک نے پہچان لیا۔

دجلہ کی ایسی طغیانی کی حالت میں ساٹھ ہزار سواروں کا اطمینان و سکون کے ساتھ باہم گفتگو کرتے ہوئے اسے طے کر لینا اور کسی کی جان و مال کا نقصان نہ ہونا ایک

بڑی عجیب وغریب بات اور اسلام کی کھلی کرامت اور اس کے آسمانی دین ہونے کی ایک بین شہادت تھی، لیکن اس سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی یہ بات تھی کہ دریا کے زور شور میں تیرتے ہوئے جو گھوڑا تھک جاتا اس کے آرام کرنے کے لیے اسی جگہ پانی میں ایک ٹیلہ ظاہر ہو جاتا تھا جس پر کھڑے ہو کر گھوڑا سستا لیتا اور اپنی تھکن اتار لیتا تھا۔ قریب قریب تمام گھوڑوں کو ایسا ہی اتفاق ہوا، اس عجیب وغریب آسمانی تائید کو نافع بن اسود نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے جن کا ترجمہ یہ ہے:

> ''ہم نے مدائن پر گھوڑوں کو جھکا دیا کیونکہ مدائن کا دریا ان کے واسطے میدان کی طرح خوش نما تھا، تفریح کی جگہ تھی۔ پھر ہم نے کسریٰ کے خزانوں کو نکال لیا جب کہ ان لوگوں نے پشت پھیری اور کسریٰ مغموم ہو کر ہم سے بھاگا۔''

جس روز مسلمان مدائن میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے تو سیدنا سلمان فارسیؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ بے حد خوش تھے کہ ایمان کی روشنی آج ان کے ملک میں پہنچ رہی ہے۔

مسلمانوں کا لشکر دریا سے نکلا تو گھوڑوں نے ہنہنا کر اپنے جسم سے پانی جھاڑا۔ پورا شہر تھا۔ بادشاہ اپنا خزانہ اور قیمتی ساز وسامان لے کر حلوان بھاگ گیا تھا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ ایوان کسریٰ میں داخل ہوئے اور وہاں کے عجائبات اور نوادرات کو دیکھ کر ان آیات کی تلاوت فرمائی:

> ﴿کم ترکوا من جنت وعیون، وزروع ومقام کریم، ونعمة کانوا فیها فاکهین، کذلک، واورثناها قوما آخرین، فما بکت علیهم السماء والارض، وما کانوا منظرین﴾
>
> (۴۴:۲۵_۲۹)

> ''وہ بہت سے باغات، چشمے، کھیت، پاکیزہ مقام اور نعمتیں چھوڑ گئے ہیں جن میں عیش وآرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اس طرح ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا وارث بنایا، پس نہ اس پر آسمان

رویا اور نہ زمین، اور نہ ہی انہیں ڈھیل دی گئی۔

اس روز جمعہ تھا۔ کسریٰ کے ایوان عام میں مدائن کی سرزمین پر پہلی مرتبہ نماز جمعہ کے لیے اللہ کی تکبیر بلند ہوئی اور ایوان سفید کے در و دیوار نے گواہی دی۔

﴿اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا رسول الله﴾

مدائن کی فتح کے وقت یزدگرد جس بے سروسامانی اور پریشانی میں دارالسلطنت چھوڑ کر بھاگا تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، مگر اس عجلت و پریشانی میں بھی وہ اپنے ساتھ جو سامان لے گیا تھا، اس سے اس کی ذہنیت اور معیار تمدن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لکھا ہے کہ

> ''یزدگرد اپنے ہمراہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار باز دار اور بہت سے دوسرے لوگ لیتا گیا۔ اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی۔''

(ایران بعہد ساسانیاں: ص ۵۸۰)

اور مسلمانوں کو جو مال غنیمت ملا وہ بھی اربوں دینار تھے۔

……❁……

تین قسم کے قاضی

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کو ضیاء الدین برنی نے ''خیر الاعصار'' بتایا ہے۔ ان کا عہد نہ صرف تاریخ ہند میں بلکہ تاریخ عالم اسلام میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس وقت وہ تخت دہلی پر بیٹھا تھا دنیائے اسلام پر مصائب کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ ٹڈّی تاتار طوفان بلا خیز کی طرح امنڈتا چلا آ رہا تھا۔ مسلمان صفیں آج کل کی طرح یکے بعد دیگرے نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹائی جا رہی تھیں۔ ہلاکو کی خون آشام فوجیں اسلامی دنیا کے سیاسی مرکز کو تباہ و برباد کر چکی تھیں، اور بغداد کے کھنڈروں سے سعدیؒ کے یہ جاں سوز مرثیے گونج رہے تھے

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں
اے محمد ﷺ گر قیامت سر بروں آری ز خاک
سر بروں آر و قیامت درمیان خلق بیں

اس زمانہ میں بلبن ہی ایک ایسا مسلمان بادشاہ تھا جس نے نہ صرف اپنی سلطنت کو ان طاغوتی طاقتوں کی دست برد سے محفوظ رکھا بلکہ وسط ایشیا کے ہزاروں برگشتہ قسمت انسانوں کو اپنے دامن میں پناہ دی۔ اس کے زمانہ میں دہلی اسلامی دنیا کی امیدوں کا مرکز بن گئی۔

سلطان غیاث الدین بلبن نماز کا بڑا پابند تھا اور نماز جماعت سے ادا کرتا تھا۔ ہر وقت باوضو رہتا تھا۔ رات کا کافی حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتا، بلکہ تاریخ فیروز شاہی وغیرہ میں اس کے بیٹے بغرا خان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

''کسی عالم یا صوفی کو اس قدر صیام و قیام کی طاقت نہیں تھی جتنی کہ سلطان بلبن کو۔''

اپنے عہد کے قاضیوں کے بارہ میں بلبن کا ایک تجزیہ سرور الصدور میں نقل کیا گیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔

> ''میرے تین قاضی ہیں۔ ایک قاضی ایسا ہے جو مجھ سے نہیں ڈرتا اور خدا سے ڈرتا ہے۔ دوسرا قاضی خدا سے نہیں ڈرتا اور مجھ سے ڈرتا ہے۔ اور تیسرا قاضی ایسا ہے کہ نہ مجھ سے ڈرتا ہے اور نہ خدا سے۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ فخر ناقلہ مجھ سے ڈرتا ہے لیکن خدا سے نہیں ڈرتا۔ قاضی شکر خدا سے ڈرتا ہے لیکن مجھ سے نہیں ڈرتا۔ عالم منہاج نہ مجھ سے ڈرتا ہے اور نہ خدا سے۔''

* * *

بیل کا آواز دینا

ابن اثیر جزریؒ نے اپنی کتاب "الکامل" میں لکھا ہے کہ جب سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ ایرانیوں سے جہاد کی خاطر قادسیہ پہنچے تو انہوں نے عاصم بن عمروؓ کو کسی کام سے میسان کے مقام پر بھیجا۔ یہ ایرانی علاقہ میں ایک چھوٹا سا مقام تھا۔ سیدنا عاصمؓ جب یہاں پہنچے تو رسد کا تمام ذخیرہ ختم ہو گیا اور ان کے ساتھیوں کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ رہا۔ انہوں نے اردگرد کے علاقے میں تلاش کیا کہ شاید کچھ کھانے کو مل جائے لیکن کافی جستجو اور تلاش کے بعد انہیں کوئی گائے، بیل اور بکری وغیرہ نہ ملی جس کو وہ ذبح کر کے کھا سکیں۔ اچانک انہیں بانس کے ایک چھپر کے پاس ایک شخص کھڑا دکھائی دیا۔ انہوں نے اس شخص سے جا کر پوچھا کہ "یہاں گردونواح کوئی گائے، بیل اور بکری مل جائیں گی؟"

اس شخص نے کہا: "مجھے معلوم نہیں۔" سیدنا عاصمؓ اسکے جواب سے مطمئن ہو کر ابھی واپس نہیں لوٹے تھے کہ اس چھپر کے اندر سے آواز آئی۔

"یہ دشمن خدا جھوٹ بولتا ہے، ہم یہاں موجود ہیں۔"

سیدنا عاصمؓ کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ آواز کس کی ہے اور کہاں سے آ رہی ہے۔ وہ چھپر میں یہ جاننے کے لیے کہ یہ آواز کس کی ہے۔ داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں کئی بیل اور گائیں کھڑی ہیں، مگر وہاں کوئی آدمی نہیں تھا، اور یہ آواز ایک بیل کی تھی۔ سیدنا عاصمؓ وہاں سے یہ تمام گائے بیل لے آئے اور انہوں نے لشکر اسلام میں تقسیم کر دیا۔

یہ واقعہ کسی شخص نے حجاج بن یوسف ثقفی کو سنایا تو اسے اس پر یقین نہ آیا اس وقت جنگ قادسیہ کے شرکاء میں سے کچھ لوگ زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے۔ اس نے ان حضرات کے پاس پیغام بھیج کر اس کی تصدیق کرنا چاہی تو بہت سے حضرات نے گواہی دی کہ اس واقعہ کے وقت ہم وہاں موجود تھے۔ حجاج نے ان سے پوچھا اس زمانہ میں اس واقعہ کے بارے میں لوگوں کا کیا تاثر تھا؟ ان لوگوں نے بڑا اچھا جواب دیا کہ:

"اس زمانہ میں اس واقعہ کو اس بات کی دلیل سمجھا جاتا تھا کہ اللہ ہم

سے راضی ہے اور وہ ہمیں دشمن پر ضرور فتح عطا فرمائے گا۔"

حجاج نے ان کا یہ جواب سن کر کہا:

"یہ بات اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جب لوگوں کی اکثریت متقی و پرہیزگار ہو۔"

حاضرین نے کہا:

"دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ دنیا اور متاعِ دنیا سے اس قدر بے نیاز قوم ہم نے اس کے بعد نہیں دیکھی۔" (کامل ابن اثیر: جلد ۲ ص ۱۷۵)

یہ کوئی ایسے اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ خیر القرون کا زمانہ تھا۔ تقویٰ و پرہیزگاری ہر شخص کا شعار تھی۔ اگر اس زمانہ میں ایک خط سے دریائے نیل جاری ہو سکتا ہے اور حضور ﷺ کے زمانہ میں ایک گوہ (ضب) آپ کی ختم نبوت پر گواہی دے سکتی اور ایک بھیڑیا باتیں کر سکتا ہے اور آپ کی نبوت پر گواہی دے سکتا تو جنگ قادسیہ میں ایک بیل بول کر اپنے ہونے کی شہادت کیوں نہیں دے سکتا؟ اور یہ واقعہ تو قریباً تاریخ کی ہر کتاب میں منقول ہے کہ سیدنا معاویہؓ کے زمانہ میں گورنر افریقہ سیدنا عقبہ بن نافعؓ کی ایک آواز پر کہ:

"اے سانپو! اور درندو! ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ ہم اس جنگل کو اپنا ٹھکانہ بنانا چاہتے ہیں اور اس کے بعد جس جانور کو اس جنگل میں دیکھ لیں گے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس ایک آواز پر ایک روز میں پورا جنگل خالی ہو گیا اور ہر قوم کے ہزاروں شخص مسلمان ہو گئے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن اثیر: جلد ۳ ص ۳۳۰، معجم البلدان: جلد ۷ ص ۱۹۳، البدایہ والنہایہ: جلد ۸ ص ۳۵، ہسٹری آف دی سیر سینز: ص ۷۹)

شیخ سعدیؒ نے بالکل صحیح کہا ہے

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

سربراہِ مملکت کی ذمہ داریاں

مسلمان اسکندریہ میں بزورِ شمشیر داخل ہوئے۔ انہوں نے اس شہر کی فصیلوں پر زبردست حملہ کر کے اس کے دروازے کھول دیئے اور رومیوں نے اعترافِ شکست کے طور پر صحرا اور سمندر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمان فوج جب شہر میں داخل ہوئی تو اس کے کوچہ و بازار دیکھ کر عرب حیران رہ گئے۔ شہر کی فصیلیں اور عالی شان عمارتیں ان کے لیے حیرت کا باعث بن گئیں۔ عمارتوں، فصیلوں، قلعوں اور برجیوں کی مضبوطی اور ندرتِ تعمیر نے انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور ان کی عقلیں مسحور ہو گئیں۔ مسلمان تہذیب و تمدن کے ان مظاہر کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان عالی شان اور بلند و بالا عمارتوں کے نیچے زمین دوز عمارتیں بھی ہیں تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ زمین دوز عمارتیں چار چار پانچ پانچ منزلہ تھیں اور ہر منزل میں لاتعداد ستون اور بے شمار پتھر تھے جنہیں پانی جمع کرنے کے لیے حوضوں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دریائے نیل میں جب طغیانی آتی تو ان نالیوں کے راستے جو ان عمارتوں کو شیریں نہر سے ملاتی تھیں، پانی جمع ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد لوگ سال بھر اسی پانی کو پیتے رہتے۔

اسکندریہ کو فتح کرنے کے بعد سیدنا عمرؓ کو سیدنا عمرو بن العاصؓ نے خط کے ذریعہ اس کی فتح کی جو اطلاع دی اس میں بھی اس شہر کے حسنِ تعمیر اور جلال و جمال کو بیان کیا۔ لکھا:

> ”میں نے ایک شہر فتح کیا ہے جس کی تعریف سے زبان و قلم دونوں عاجز و درماندہ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یہاں چار ہزار عمارتیں اور اتنے ہی حمام پائے۔ اس شہر میں چالیس ہزار یہودی آباد ہیں جن پر جزیہ عائد کر دیا گیا ہے اور چار سو شاہی رقص گاہیں ہیں۔“

سیدنا معاویہ بن خدیجؓ فتح کی یہ خوشخبری لے کر دن رات سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے مدینہ طیبہ پہنچے۔ مسجد کے باہر اونٹنی کھڑی کی اور مسجد کے دروازے کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ وہ یہاں اس لیے بیٹھے کہ انہیں خیال گذرا کہ یہ آرام کا وقت ہے ہو سکتا ہے کہ امیر المومنین اس وقت آرام فرما رہے ہوں۔ اتفاق سے سیدنا عمرؓ کے گھر سے ایک لونڈی ادھر آ نکلی اور معاویہؓ کے جسم پر یہ سفر کا لباس اور چہرے پر تھکان کے آثار دیکھ کر سمجھ گئی کہ یہ مصر سے آئے ہیں۔ وہ تیزی سے کاشانۂ خلافت میں داخل ہوئی اور فوراً واپس آ کر بولی کہ امیر المومنین آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ سیدنا معاویہؓ اس کے پیچھے پیچھے ایوانِ خلافت میں داخل ہوئے۔ سیدنا عمرؓ نے پوچھا: ''کیا خبر لائے ہو؟'' عرض کی: امیر المومنین! مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے اسکندریہ فتح کرا دیا۔'' سیدنا عمرؓ بہت خوش ہوئے اور انہیں مسجد میں لا کر لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا اور فرمایا: ''اپنے ساتھیوں کو تفصیل سناؤ۔'' جب معاویہؓ تفصیل سنا چکے تو آپ معاویہؓ کو ساتھ لے کر گھر تشریف لائے اور انہیں اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔

جب کھانے سے فراغت ہوگئی تو سیدنا عمرؓ نے پوچھا: ''معاویہ! تم سیدھے میرے پاس کیوں نہیں آئے۔؟'' مسجد میں کیوں چلے گئے؟'' معاویہؓ نے عرض کیا: ''میں سمجھ رہا تھا کہ آپ اس وقت قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا:

> ''معاویہ! تم نے غلط سمجھا، اگر میں دن کو سوؤں تو رعیت کا نقصان ہے اور اگر رات کو سوؤں تو میرا اپنا نقصان ہے۔ ان دونوں صورتوں میں معاویہ! نیند کیسے آ سکتی ہے؟''

◆

دو ہزار گھر کی قیمت دو ہزار اچھے پڑوسی کی

پڑوسی کا اچھا ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑا انعام ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں برے پڑوسی سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اگر پڑوسی برا ہو تو زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے۔ پڑوسی اچھا ہو تو وہ دکھ درد کا ساتھی ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ تو بھائیوں سے بھی بہتر ثابت ہوتا ہے کیونکہ بھائی تو دکھ درد میں دیر سے پہنچیں گے لیکن پڑوسی قریب ہونے کے ناطے جلدی غمگساری کرتا ہے۔

ابو حمزہ محمد بن میمون سکری (م ۱۶۸ھ) مشہور محدث ہیں۔ نہایت شیریں کلام اور نرم گفتار تھے۔ ان کے پڑوسی ان سے نہایت خوش تھے کیونکہ اپنے پڑوسیوں کی دیکھ بھال اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ بلکہ اگر ان کے پڑوس میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی جس قدر رقم علاج معالجہ پر صرف ہوتی یہ اتنی ہی رقم اللہ کے راستہ میں صدقہ کر دیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے محفوظ رکھا ہے، اور اس کے شکریہ میں یہ رقم صدقہ کی گئی ہے۔ ان کی اس شیریں کلامی اور نرم گفتگو کی وجہ سے لوگ انہیں سکری کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ ابو حمزہؒ کے ایک پڑوسی نے ایک مرتبہ اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ کیا۔ خریدار نے آ کر اس سے قیمت پوچھی۔ پڑوسی نے کہا:

"دو ہزار تو گھر کی قیمت اور دو ہزار ابو حمزہؒ کے پڑوس کی۔"

یہ ابو حمزہؒ کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ نہ صرف ابو حمزہ کے لیے بلکہ ہر اچھے شخص کے لیے جس کا پڑوسی اس کی اس قدر تحسین و تعریف کرے۔ ابو حمزہؒ کو جب اپنے پڑوسی کے ان الفاظ کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنی طرف سے چار ہزار کی رقم پڑوسی کے پاس بھیج دی اور فرمایا:

"یہ رقم رکھ لو اور گھر مت فروخت کرو۔" (تاریخ بغداد: جلد ۳ ص ۲۶۸)

﴿ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں﴾

سلطان محمد بن تغلق کا برصغیر پاک و ہند کے عظیم المرتبت سلاطین میں شمار ہوتا ہے اور بقول برنی جمشیدی و کیخسروی تو اس کی سرشت میں تھی۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں اگر ارسطو، نظام الملک طوسی یا احمد حسن زندہ ہوتے تو اس کی صلاحیت جہاں بانی کو دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے۔ (تاریخ فیروز شاہی: ص ۴۵۷)

علم و فضل، شجاعت و شہامت، فہم و ذکاوت، سلیقۂ جہانداری اور انصاف پروری و عدل گستری، داد و دہش، بلند ہمتی و عالی حوصلگی غرض کہ جس اعتبار سے بھی دیکھئے سلطان ایک ممتاز شخصیت نظر آتا تھا۔ دینی لحاظ سے بھی اس کی ایک انفرادی شان تھی۔ وہ الحاد اور بے دینی کے کوچوں سے بھی گذرا تھا اور شکوک و شبہات کے کانٹے بھی اس کے دل میں چبھے تھے۔ لیکن آخر کار اسلام میں اس کے عقائد کی بنیادیں مضبوطی سے قائم ہو گئی تھیں۔ اس نے دین اور سیاست کے بنیادی مسائل پر کافی بالغ نظری سے غور کیا تھا۔ لیکن ان تمام محاسن و فضائل کے باوجود وہ ناکام رہا۔ اس ناکامی کی ذمہ داری کچھ تو عام حالات کے ناسازگار ہونے پر تھی اور کچھ اس کی عاجلانہ فطرت اور منتقمانہ طبیعت پر۔ مبدء، فیاض نے حکیمانہ بصیرت کے خزانے تو اس پر کھول دیئے تھے لیکن طبیبانہ تحمل اور مزاج شناسی سے اس کو یک قلم محروم کر دیا تھا، اور اس کی بعض غلط صفات نے اس کی تمام اچھائیوں پر پانی پھیر دیا۔ چنانچہ لوگ اس کے احکام کی بجا آوری میں تساہل برتنے لگے۔ سلطان نے اس تساہل کو باغیانہ جذبات پر محمول کیا اور غصہ سے بھڑک اٹھا، اور لوگوں کو مختلف سزائیں دینے میں مصروف ہو گیا۔ حالات نے اس کے مزاج کو خراب کیا اور اس کے مزاج نے حالات کو بگاڑا، اور عمل اور رد عمل کے چکر میں وہ اس بری طرح پھنسا کہ پھر کبھی اس سے باہر نہ نکل سکا۔ اس کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کے عہد حکومت کے حالات ایسے متعصب مورخوں کے ہاتھوں لکھے گئے جو اس کے مذہبی

افکار و رجحانات سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کے محاسن معائب میں اور مناقب مثالب میں بدل گئے اور مظالم کا شہرہ اس بلند آہنگی سے کیا گیا کہ اس کا نام سنتے ہی نظروں کے سامنے ایک ایسی تصویر پھرنے لگتی ہے جس کے چہرہ کے گرد آگ اور خون کا ہالہ رقص کرتا ہے۔

محمد بن تغلق کے زمانہ میں ایک بزرگ شیخ قطب الدین منور تھے جو شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے پوتے اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ تھے۔ ہانسی میں ان کی خانقاہ مرجع خلائق۔ محمد بن تغلق نے ایک مرتبہ دو گاؤں کا فرمان قاضی کمال الدین صدر جہاں کی معرفت ان کی خدمت میں بھیجا تھا لیکن انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(سیر الاولیاء، ص ۲۵۰)

جب سلطان ہانسی کی طرف گیا، شیخ حسن برہنہ کو بھیجا کہ شیخ کو دربار میں لے کر آئیں۔ شیخ قطب الدین منورؒ نے ان سے پوچھا کہ اس معاملہ میں مجھے اختیار دیا گیا ہے یا نہیں؟ حسن برہنہ نے کہا کہ حکم شاہی ہے کہ آپ کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ شیخ نے فرمایا: ''الحمد للہ کہ میں اپنے اختیار سے بادشاہ کے پاس نہیں جا رہا۔'' اہل خانہ کو خدا کے سپرد کیا اور کندھے پر مصلیٰ ڈال کر اور ہاتھ میں لاٹھی لے کر پیادہ پا روانہ ہو گئے۔ جب اپنے دادا اور والد کے مزارات کے پاس سے گزرے تو فرمانے لگے: ''میں آپ کے بتائے ہوئے گوشہ اور اپنے گھر سے خود اپنی مرضی سے نہیں نکلا ہوں بلکہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے آدمی مجھے کشاں کشاں لیے جاتے ہیں۔ مجھے سوائے اس کے کسی بات کا افسوس نہیں کہ چند بندگانِ خدا کو بے خرچ اور بغیر کسی بھروسہ کے چھوڑے جاتا ہوں۔ روضہ سے باہر آئے تو اس شخص نے کچھ مال پیش کیا۔ آپ نے قبول کر کے فرمایا: ''میرے گھر والوں کے پاس کوئی خرچ نہیں لہٰذا یہ ان کو پہنچا دو۔'' جب شاہی خیمے کے قریب پہنچے تو سلطان انہیں اپنے سامنے طلب کر کے خود دہلی روانہ ہو گیا۔ دہلی میں شیخ نے فیروز سے ملاقات کی اور کہا کہ ہم درویش لوگ ہیں، بادشاہوں کی مجلس میں جانے کے آداب سے ناآشنا ہیں۔ تم جو بتاؤ وہ کیا جائے۔ فیروز نے مشورہ دیا کہ بادشاہ کی خدمت میں تواضع اور نرمی سے پیش آئیں۔ شیخ اپنے صاحبزادے نورالدین کے ساتھ

دربار میں پہنچے۔ نورالدین پر درباری کروفر کا ایسا اثر ہوا کہ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ شیخ نے اس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

"بابا نور الدین! العظمة والکبریاء للّٰہ"

نورالدین نے جونہی اپنے والد کی آواز سنی تو فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اندر ایک عجیب وغریب قوت محسوس کی۔ میرے دل سے دربار کی ساری ہیبت زائل ہوگئی اور تمام حاضرین دربار مجھے ایسے محسوس ہونے لگے جیسے بھیڑ بکریوں کا کوئی ریوڑ ہو۔

جب بادشاہ محمد بن تغلق سے ملاقات ہوئی اور اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آپ نے اس طرح سے ہاتھ دبایا کہ وہ آپ کی روحانی عظمت کا قائل ہوگیا۔ سلطان نے شکایت کی کہ ہانسی میں وہ اس سے ملاقات کے لیے کیوں نہیں آئے؟ شیخ نے فرمایا:

> "درویش اس قدر وقعت نہیں رکھتا کہ بادشاہوں کی ملاقات کو جائے لیکن ایک گوشہ میں بادشاہ اور مسلمانوں کے لیے دعا گوئی میں مصروف رہتا ہے، اسے حاضری سے معذور رکھنا چاہیے۔"

سلطان کا دل ان کلمات کو سن کر ان کی طرف سے صاف ہوگیا، اور اس نے فیروز اور ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ تنکہ دے کر ان کی خدمت میں بھیجا۔ بڑے اصرار کے بعد شیخ نے دو ہزار تنکہ قبول کیے اور فرمایا:

> "سبحان اللہ! درویش کو صرف دو سیر کھچڑی اور ایک دانگ گھی کفایت کرتا ہے۔ وہ ہزاروں لے کر کیا کرے گا۔" (سیر الاولیاء، ص ۲۵۵)

……❁……

سحری کی چند رکعتیں نفع بخش ہیں

جنید بغدادیؒ کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ان کے بارہ میں ابو محمد حریری کہتے ہیں کہ وفات کے وقت میں ان کے پاس موجود تھا۔ یہ جمعہ کا روز تھا اور آپ قرآن حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا:

''ابو القاسم! کچھ اپنی جان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیجیے۔''

حضرت جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) نے جواب دیا:

''ابو محمد! کیا اس وقت کوئی ایسا شخص نظر آتا ہے جو عبادت کا مجھ سے
زیادہ مستحق ہو۔ وہ دیکھو میرا نامۂ اعمال لپٹ رہا ہے۔''

وفات سے قبل جنید بغدادیؒ نے وصیت فرمائی کہ میری طرف علم کی جتنی باتیں بھی منسوب ہیں یا لوگوں نے ان کو لکھ لیا ہے، ان سب کو ضائع کر دیا جائے۔ جب لوگوں نے ان کو ضائع کرنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے جواب میں فرمایا:

''جب لوگوں کے پاس سرکار دو عالم ﷺ کا علم موجود ہے تو میری
یہ خواہش ہے کہ حق تعالیٰ شانہ سے میری ملاقات اس حالت میں
ہو کہ میں نے اپنی طرف منسوب کوئی شی نہ چھوڑی ہو۔''

کیسے عجیب لوگ تھے اور آخرت کا کتنا ڈر ان کے دلوں میں تھا۔ آج ہم بداعمالی کی انتہاء پر پہنچے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی آخرت کا جواب اور اس کی جواب طلبی سے ہم یکسر غافل ہیں۔ بلکہ ہمارے عقیدہ میں جہنم کا تصور ہی نہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہی سمجھ بیٹھے ہیں کہ جو کچھ جی چاہے کرلیں جنت کے ٹھیکیدار ہم ہی ہیں۔ لیکن صحابہ کرامؓ اور بزرگانِ دین ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ ہر وقت خوف آخرت اور اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف ان پر طاری رہتا تھا، اور انہی لوگوں کے بارہ میں کہا گیا ہے۔

''ولمن خاف مقام ربہ جنّتان''

جعفر خلدیؒ نے حضرت جنید بغدادی کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا:

''اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟''

حضرت جنید بغدادی قدس سرہ نے جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے۔ فرمایا:

﴿طاحت تلک الاشارات، و غابت تلک العبارات، وفنیت تلک العلوم، ونفدت تلک الرسوم، ومانفعنا الا رکعات کنا نرکعها فی الاسحار﴾

یعنی وہ اشارے ختم ہو گئے، اور عبارتیں غائب ہو گئیں، اور وہ علوم فنا ہو گئے، اور وہ نقوش مٹ گئے اور ہمیں نہیں نفع پہنچایا مگر ان چند رکعتوں نے جو ہم سحری کے وقت پڑھ لیا کرتے تھے۔

(تاریخ بغداد، خطیب بغدادی: جلد ۷ ص ۲۴۸)

یہ علم کی موشگافیاں اور لن ترانیاں کسی کام آنے کی نہیں اگر کیسۂ عمل خالی ہو۔ اقبالؒ نے سچ کہا:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ کام نہیں بنتا بے آہِ سحرگاہی

◆

مردِ مومن کسی سے نہیں ڈرتا

قادسیہ کی جنگ مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان سب سے آخری بڑی جنگ تھی جس کے فاتح سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ اس جنگ کو ختم ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہو چکے تھے لیکن سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ ابھی تک وہیں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے کیونکہ فاروقی حکم تھا کہ میری اجازت کے بغیر آگے نہیں بڑھنا۔ لیکن آپ نے ایرانی جرنیلوں کے بارہ میں پوری معلومات فراہم کی ہوئی تھیں کہ قادسیہ میں شکست کھانے کے بعد وہ کہاں کہاں ہیں۔ قادسیہ میں شکست کھانے کے بعد ایران کے نائب سپہ سالار نے تو مدائن میں پناہ لی اور دوسرے جرنیل بابل چلے گئے اور کئی دوسرے شہروں میں منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔

دوسری طرف یزدگرد نے مدائن (ایرانی دارالسلطنت) میں قادسیہ کی شکست کی الم ناک خبر سن لی تھی اور اس افسوس ناک خبر کے غم کی شدت اسے نڈھال کیے ہوئے تھی بلکہ پریشانی نے اس کے دماغ کو مفلوج کر دیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے، اور اب کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں کی قوت کا اندازہ یزدگرد اور اس کے وزیر دفاع رستم نے قادسیہ کے میدان میں دیکھ لیا تھا۔ اور اب وہ دیکھ رہا تھا کہ مسلمان وادی عراق میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکے ہیں اور اب ان کا ہدف مدائن ہے۔

اب امیر المومنین کا حکم آ گیا کہ دشمن کو دباتے دباتے ایران کے پایۂ تخت مدائن پر قابض ہو جاؤ۔" اس حکم کی تعمیل میں سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ نے زہرہ بن حویہؓ کی سرکردگی میں ایک ہراول دستہ روانہ کیا۔ زہرہ ساباط کی طرف بڑھے۔ وہاں کے باشندوں نے جزیہ پر صلح کر لی۔ اب سیدنا سعدؓ نے زہرہ بن حویہؓ کو مدائن جانے والے لشکر کا امیر بنا کر روانہ کر دیا۔ دوسری طرف سے ہاشم بن عتبہؓ بھی مدائن کے ارادہ سے نکلے۔ بہر شیر

کے قریب ساباط میں ان کا سامنا پوران دخت بنت کسریٰ کے شاہی رسالے سے ہوا جس کے سپاہی روزانہ یہ قسم کھاتے تھے کہ جیتے جی ایران کی حکومت کو زوال پذیر نہیں ہونے دیں گے۔ اس رسالے کے ساتھ ایک شیر ببر بھی تھا جو کسریٰ سے بہت مانوس تھا۔ اس شیر کو مسلمانوں پر چھوڑا گیا۔ بھوکا شیر گولی کی طرح پنجرے سے نکلا، ڈکارتا اور دھاڑتا ہوا مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ قبل اس کے کہ اسلامی لشکر میں سے کوئی اور آگے بڑھتا، ہاشم بن عتبہ امیر لشکر خود آگے نکل آئے۔ ایرانی کھڑے دیکھ رہے تھے کہ مسلمان کتنا بے وقوف ہے۔ موت کی طرف سے کتنا بے پرواہ۔ بات تو ٹھیک تھی۔ کہ انسان اور درندے کی قوت کا کیا مقابلہ؟ اور پھر درندہ بھی شیر ببر خونخوار، لیکن جنہوں نے چند ماہ قبل قادسیہ کے میدان میں ابیض اور اجرب جیسے ہاتھیوں کا منہ پھیر دیا تھا، ان کی نگاہ میں اس شیر کی کیا حیثیت تھی؟ ہاشم کو شیر پر جھپٹتے دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا کہ مرد مومن واقعی کسی سے نہیں ڈرتا۔
ہاشم اور شیر گویا   ؎

نیا حریف تھا میدانِ کارزار نیا

ہاشم اپنی موت سے کھیل رہے تھے اور ایرانی دم سادھے ان کے انجام کے منتظر تھے۔ تھوڑی دیر میں سب نے دیکھا کہ شیر یوں اچھلا جیسا کہ کوئی آتش فشاں کا ٹکڑا اڑتا ہے۔

اس کی اڑان موت کی کمند تھی اور اس کی دھاڑ قیامت کی دھمک۔ سب کی نظریں شیر خونخوار پر جمی ہوئی تھیں۔ آڑا چوڑا ہیبت ناک دھڑ، مہیب اور ڈراؤنا سر، انگاروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، پھڑکتے نتھنے، تڑپتے جبڑے، نوکیلے دانت، کٹیلے ناخن، اور وہ ہاشم بن عتبہؓ کے سر پر گرنے ہی کو تھا۔ سب کی آنکھوں نے دیکھا کہ چشم جھپکتے میں اللہ کے سپاہی کے ہاتھوں میں کوندا سا لپکا اور ابھی موت کا سایہ مجاہد اسلام کے سر پر پڑنے بھی نہ پایا تھا کہ فضا ہی سے شیر غراں دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر پڑا۔ دونوں فوجیں حیرت سے کھڑی اس منظر کو تک رہی تھیں۔ ایرانی یہ منظر دیکھ کر بھاگ اٹھے۔

سیدنا سعدؓ بہرشیر پہنچے تو اسلامی لشکر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہاشم کی تلوار آنکھوں سے لگائی جا رہی تھی۔ چچا (سیدنا سعدؓ) نے بھتیجے (سیدنا ہاشمؓ) کی شیر افگنی کو

جان سنا تو اس جواں مردی پر بھتیجے کو بے اختیار گلے لگالیا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور مدائن کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی:

﴿اولم تکونوا اقسمتم من قبل مالکم من زوال﴾

”کیا تم نے پہلے قسم نہیں اٹھائی تھی کہ تمہارے لیے زوال نہیں ہے۔“

بہرشیر فتح ہوگیا اور یہ فتح مدائن کی فتح کا دیباچہ تھی۔ مدائن وہ حصہ جو دریائے دجلہ کی دوسری طرف تھا بہرشیر کہلاتا تھا۔ یہ شہر ۶۳۷ء کو فتح ہوا۔

* * *

چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

حضرت خواجہ شمس الدین ترکؒ (م ۷۱۹ھ) پانی پات کے ایک بزرگ ہیں۔ انہوں نے اپنی روحانی تربیت حضرت علاء الدین صابرؒ کلیر شریف سے پائی۔ ان کے مرشد نے انہیں پانی پت میں جا کر قیام کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے روحانی طور پر اس مقام کا بار اٹھانے کی صلاحیت اپنے اندر نہ پائی، اس لیے حضرت علاء الدین صابر کلیریؒ سے اجازت لے کر مزید مجاہدہ اور ریاضت کی خاطر محنت مزدوری کرنے لگے۔ اور اس کا طریقہ ان کے ذہن میں یہ آیا کہ دہلی آ کر سلطان غیاث الدین بلبن کی فوج میں سواروں کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ جب شاہی فوج ایک قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ ہوئی تو وہ بھی اس فوج میں شامل ہو گئے۔ قلعہ کی تسخیر میں بڑی دیر لگی۔ اسی دوران میں ایک سخت آندھی آئی اور بارش ہوئی جس سے شاہی لشکر کے تمام خیمے گر پڑے بارش تیزی سے جاری رہی۔ سخت سردی پڑنے لگی اور کسی جگہ آگ باقی نہ رہی۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا سقہ اس کے وضو کا پانی گرم کرنے کے لیے آگ کی تلاش میں نکلا۔ اس نے دفعتاً دور سے دیکھا کہ ایک خیمہ میں چراغ روشن ہے۔ یہ خیمہ حضرت خواجہ شمس الدین ترکؒ کا تھا۔ سقہ دوڑا گیا۔ جب خیمہ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ایک درویش کلام مجید کی تلاوت کر رہا ہے۔ ان کے خوف سے سقہ آگ مانگ نہ سکا لیکن انہوں نے سر اٹھایا اور فرمایا: ''بھائی آؤ اور جتنی آگ چاہتے ہو لے جاؤ۔ وہ سامنے آیا اور ایک لکڑی آگ سے جلائی اور لوٹا لے کر لوٹ گیا۔ سقہ اس خیمہ کو دیکھ کر پریشان تھا کہ اتنی تیز ہوا میں جب تمام چراغ بجھ گئے ہیں، خیمے ہوا اور بارش کی وجہ سے گر گئے ہیں، یہ مرد درویش ساری دنیا سے بے خبر چراغ جلا کر اپنے صحیح و سالم خیمہ میں تلاوت کلام مجید میں مصروف ہے۔

رات اس نے اسی پریشانی میں گزاری۔ صبح کے وقت سقہ اپنی مشک لے کر اس خیمہ کی طرف آیا دیکھا کہ وہ رات والے بزرگ خیمہ میں موجود نہیں ہیں، لیکن قریب ہی

ایک تالاب میں ان کو وضو کرتے دیکھا۔ وہ ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا۔ جب وہ بزرگ وضو کر کے چلے گئے تو سقہ نے اسی جگہ سے مشک میں پانی بھرا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ہر جگہ پانی جما ہوا اور ٹھنڈا ٹھار تھا، لیکن جس جگہ اس بزرگ نے وضو کیا وہاں کا پانی اس قدر گرم تھا گویا کہ کسی نے اس کو ابھی گرم کیا ہے۔ یہ دیکھ کر سقہ کو اور زیادہ پریشانی ہوئی۔

سقہ نے اس کی خبر سلطان غیاث الدین کو دی جو اسی لشکر میں موجود تھے۔ خبر ملتے ہی سلطان کو اس بزرگ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ رات کو چپکے سے پا پیادہ ان کی قیام گاہ پر اس وقت پہنچا جب وہ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ سلطان چپ چاپ دست بستہ کھڑا رہا۔ جب وہ تلاوت سے فارغ ہوئے تو ان کی نظر سلطان پر پڑی۔ یہ بزرگ سلطان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ سلطان نے اظہار ادب کر کے عرض کیا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے خدا دوست میرے عہد میں موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود افسوس ہے کہ ابھی تک قلعہ فتح کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ حضرت خواجہ شمس الدینؒ نے ہر چند اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ مجبوراً دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: اسی وقت قلعہ پر حملہ کیا جائے ان شاء اللہ فتح ہو گی۔ سلطان نے ایسا ہی کیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔ دوسرے روز سلطان نے غایت مسرت میں برہنہ پا خواجہ شمس الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا، لیکن خواجہ صاحبؒ کو اپنے نور باطن سے اس کا ارادہ معلوم ہوا تو کمبل اوڑھ کر لشکر سے نکل گئے اور ان کا کہیں بھی لشکر میں پتہ نہ چلا۔

(سیر الاقطاب: ص ۱۷۸ بحوالہ بزم معرفت کی سچی کہانیاں: جلد ۱ ص ۶۷)

……

﴿ایک آرزو اب بھی دل میں باقی ہے﴾

خلیفہ منصور سلطنت عباسیہ کا ایک مشہور خلیفہ تھا۔ نہایت وسیع و عریض سلطنت کا بادشاہ۔ ہر طرح کا عیش و آرام حاصل تھا۔ دنیا کی ہر شئی میسر تھی۔ جو خواہش کرتا کارکنان سلطنت اسی وقت اس کی تعمیل کرتے۔ امام سیوطیؒ نے اس کے بارہ میں اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ کہ ایک روز کسی نے اس سے پوچھا:

”امیر المومنین! کیا دنیا کی خواہشات میں سے کوئی خواہش ایسی ہے جو آپ کو حاصل نہ ہوئی ہو؟“

منصور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگا: ”ہاں، ایک آرزو اب بھی میرے دل میں اٹھکیلیاں لے رہی ہے، اور وہ یہ آرزو ہے کہ میں کسی حجرے میں بیٹھا ہوں اور میرے چاروں طرف حدیث کے طلباء ہوں اور میں ان سے احادیث بیان کر رہا ہوں اور وہ مجھ سے سن سن کر احادیث قلم بند کر رہے ہوں۔ اور پھر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ابھی آپ نے کون سے راوی کا نام لیا تھا تو جواب میں کہوں کہ:“

﴿حدثنا فلان، قال حدثنا فلان، قال حدثنا فلان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم﴾

یہ ایک خلیفہ اور سلطنت اسلامیہ کے سب سے زیادہ با اقتدار اور با اختیار حکمران کی خواہش تھی۔ اور یہ ایسی بھی نہ تھی جسے خلیفہ کے چشم و ابرو پر نگاہ رکھنے والے پوری نہ کر سکتے ہوں۔ چنانچہ اگلے ہی روز منصور کے مصاحبین، عمائدین سلطنت، مختلف وزراء قلم دوات اور کاغذ کے تختے لے کر خلیفہ کے پاس پہنچ گئے اور درخواست کی آپ احادیث بیان کریں اور ہم ان کو لکھیں گے۔

خلیفہ منصور کوئی جاہل نہ تھا۔ اور احادیث کی ایک کثیر تعداد مع سندات کے جانتا تھا۔ وہ اگر لکھوانا چاہتا تو سینکڑوں لکھوا سکتا تھا۔ وہ باقاعدہ علم حدیث پڑھ کر خلیفہ ہوا

تھا۔ اس زمانہ میں قرآن و حدیث سے جاہل شخص خلیفہ نہیں بن سکتا تھا۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے بارہ میں کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر وہ خلیفہ نہ ہوتا تو ایک بہت بڑا محدث اور فقیہ ہوتا۔

خلیفہ منصور نے جب ان لوگوں کو اپنے سامنے کاغذ اور قلم دوات لیے بیٹھے دیکھا تو مسکرا کر کہا:

> ''تم کہاں اور علم حدیث کے طلباء کہاں، علم حدیث کے طالب علم تو وہ ہوتے ہیں جن کے کپڑے علمی انہماک کے باعث میلے ہو گئے ہوں، جن کے پاؤں پیدل چلتے چلتے پھٹ گئے ہوں اور جن کے بال عدیم الفرصتی کی وجہ سے بڑھ گئے ہوں اور جنھوں نے سفر کر کر کے چاروں افق چھان مارے ہوں۔''

……

تعلیم قابل فروخت نہیں

انگریزوں کے منحوس قدم برصغیر پاک و ہند پر آنے سے قبل لوگوں میں ایثار و قربانی، باہمی محبت و الفت اور لوگون کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت بھری ہوئی تھی۔ لیکن ان مغربی تاجروں کے آنے کے ساتھ ہی اخلاقی اور روحانی انحطاط شروع ہو گیا یہاں تک کہ اولاد کی محبت والدین کے ساتھ، والدین کی شفقت اولاد کے ساتھ، خوردی کی تعظیم بزرگ کے لیے اور بزرگ کی تواضع و شفقت چھوٹے کے لیے، عورتوں کی عفت مآبی، ازدواجی وفاداری، امانت داری، نوجوانوں کی اخلاقی استقامت، دوستوں کے لیے ایثار و قربانی اور ہمدردی ایک ایک کر کے سب ختم ہونی شروع ہو گئیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ایک شریف اور بااصول انسان کا ضمیر، اس کی عزت و آبرو مذہبی عقیدہ کی طرح ایک ناقابل فروخت چیز سمجھی جاتی تھی۔ جس کا دنیا میں سودا نہیں ہو سکتا تھا اور جو بڑی سے بڑی قیمت پر فروخت نہیں کیا جاتا تھا۔ سن ۱۸۵۷ء کے آگے پیچھے مسلمان شرفاء کی بہت سی نظیریں اور مثالیں ملیں گی کہ انہوں نے اپنا خون گوارا کیا لیکن ضمیر کا خون کرنا پسند نہیں کیا، اس لیے گولی کھائی، تختۂ دار پر چڑھے لیکن جھوٹ بولنا منظور نہ کیا، کیونکہ جان بخشی کے لیے ضروری تھا کہ وہ جھوٹ بول کر اپنی صفائی پیش کریں اور جنگ آزادی میں شرکت سے انکار کریں جو ان کے نزدیک خلاف ضمیر بات تھی۔ پھر یہ دور بھی قوم نے دیکھا اور دیکھ رہی ہے کہ چند ٹکوں کے لیے اور اپنی جھوٹی چند روزہ شہرت کے لیے لوگوں نے ضمیر کا ہول سیل (Whole Sale) میں سودا کیا اور لوٹے کھلوائے۔ ضمیر کے علاوہ علم و دانش اور دماغی قوت و ذہانت بھی ایسی مقدس اور قیمتی شی اس زمانہ میں سمجھی جاتی تھی جس کو ہر کس و ناکس کے ہاتھ اونے پونے فروخت نہیں کیا جاتا تھا، جو لوگ اس بارہ میں بلند مقام پر تھے وہ تو کسی قیمت پر بھی ان کو فروخت کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اس کو اللہ تعالیٰ کا بیش قیمت عطیہ اور امانت سمجھتے تھے، اور کسی غلط نظام کا آلۂ کار بننا تو بہت بڑی خیانت اور دین فروشی سمجھتے تھے۔

اسی ذہنیت اور سیرت کے ایک بزرگ مولانا عبدالرحیم صاحب رام پوری (م ۱۲۴۳ھ) تھے روہیل کھنڈ کے انگریز حاکم مسٹر ہاکنس نے انکو بریلی کالج کی تدریس کے لیے اڑھائی سو روپیہ مشاہرہ کی (جو اس زمانہ میں آج کل کے پچاس ہزار روپیہ سے بھی زیادہ کی حیثیت رکھتا تھا) پیشکش کی اور وعدہ کیا کہ تھوڑی مدت میں اس تنخواہ میں معتد بہ اضافہ ہو جائے گا۔ انہوں نے عذر کیا کہ ریاست سے ان کو دس روپے ماہوار ملتے ہیں، وہ بند ہو جائیں گے۔ مسٹر ہاکنس نے کہا کہ میں تو اس وظیفہ سے پچیس گنا زیادہ پیش کرتا ہوں، اس کے مقابلہ میں اس حقیر رقم کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اس کے بعد یہ عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے، اس کے بیر میٹھے اور مجھے مرغوب ہیں۔ بریلی میں وہ بیر کھانے کو نہیں ملیں گے۔ انگریز حاکم اب بھی ان کے دل کی بات کو نہ پا سکا۔ اس نے کہا: ”رام پور سے بیر آنے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ آپ بریلی میں بیٹھے ہوئے بھی اپنے گھر کے بیر کھا سکتے ہیں۔“ مولاناؒ نے فرمایا: ”ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رام پور میں درس لیتے ہیں، ان کا درس بند ہو جائے گا اور میں ان کی خدمت سے محروم رہ جاؤں گا۔“

انگریز کی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانی۔ اس نے کہا کہ میں ان لڑکوں کے وظائف مقرر کرتا ہوں۔ وہ بریلی میں آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اپنی تکمیل کریں۔ آخر اس مسلمان عالم نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے، لیکن تعلیم پر اجرت لینے کے متعلق میں قیامت کے روز اپنے رب کو کیا جواب دوں گا؟

ہندوستان کے فاتح نے اب اپنی شکست تسلیم کر لی اور مولانا عبدالرحیمؒ نے نواب احمد علی خان والیٔ رام پور کے دس روپے ماہوار پر اپنی زندگی گزار دی۔

(ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین: ص ۲۶۷)

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کا بھی کتابوں میں درج ہے۔ کہ آپ کو مطبع سے دس روپے تنخواہ ملتی تھی، اس دوران ریاست بھوپال سے قاضی القضاۃ کے عہدہ کی پیش کش ہوئی اور مشاہرہ تین سو روپے ماہوار بتایا گیا یعنی موجودہ تنخواہ سے تیس گناہ زیادہ۔ کوئی اور ہوتا تو فوراً رخت سفر باندھ لیتا کیونکہ یہ تین سو روپے ایک بہت بڑی خطیر رقم تھی۔ لیکن مولانا نانوتویؒ نے ان کے اس پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اس وقت

مجھے دس روپے تنخواہ ملتی ہے۔ پانچ روپے میرا خرچ ہے اور پانچ روپوں کو سنبھالنا میرے لیے نہایت مشکل ہے۔ جب تین سو روپے تنخواہ ملے گی تو خرچ تو ہوں گے صرف پانچ روپے اور دو سو پچانوے روپے بچیں گے، ان کو کہاں سنبھال کر رکھوں گا۔ دوسرے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں یہاں زیادہ اچھے طریقہ سے دین کی خدمت کر رہا ہوں۔

اس اخلاقی بلندی اور کردار کا مقابلہ اس زمانہ کی دانش فروشی سے کیجیے۔ اس زمانہ کے اہل دانش و علم نے اپنے علم، لیاقت اور ذہانت کو نیلام پر چڑھا رکھا ہے۔ جو زیادہ بولی دے گا اس کے ہاتھ فروخت کر دیں گے۔ اگر کوئی اسلامی ادارہ یا مدرسہ سو روپے دے رہا ہے اور کسی عیسائی ادارے یا حکومتی کالج نے ایک سو پانچ لگائے تو اس اسلامی ادارہ کو چھوڑ کر اس عیسائی کالج میں چلے گئے۔ آج کسی انشاء پرداز کو اس میں ذرا تکلف نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی قلم سے ایک مجاہد اعظم کی سیرت لکھے اور پھر اسی قلم سے کسی قوم فروش کی منقبت لکھے۔ بلکہ آج تو ہمارے انشاء پردازوں کے قلم جن کو وہ مجاہدین لکھتے تھے آج ان کو صرف اور صرف حکام وقت کو خوش کرنے کے لیے دہشت گرد لکھتے ہیں۔

مغرب کی مادی و معاشی دور اقتدار و تہذیب میں انسانی زندگی کا قابل تقلید نمونہ اور مثالی تصور نہایت پست ہو گیا۔ صرف اچھا کھانا، اچھا پہننا، سوسائٹی میں معزز و ممتاز بننا اور ہم چشموں میں جاہ و اعزاز حاصل کرنا ایک آئیڈیل بن گیا ہے۔ پیغمبروں کی سیرت نظروں سے یک قلم اوجھل ہو گئی اور وہ شخصیتیں ذہن پر چھا گئیں اور نمونہ و مثال اور زندگی کی کامیابیوں کا منتہیٰ بن کر آنکھوں اور تصور کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئیں جو اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے سخت ناقص، اعمال و کردار کے لحاظ سے بے حد پست، علمی کمالات اور حقیقی صفات سے محروم، اخلاقی سطح کے لحاظ سے مبتذل اور عامی، گھٹیا درجہ کے انسان یا معاشی جانور اور روپیہ پیدا کرنے کی بے شعور و بے درد مشین ہیں۔ تن آسانی اور راحت پسندی اتنی غالب آ گئی اور تفریحی مشاغل نے زندگی کی اتنی بڑی جگہ گھیر لی کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، دینی فرائض کی ادائیگی اور روحانی ضروریات کی طرف توجہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اسلامی تہذیب اور ان کے نمائندوں اور موجودہ ترقی یافتہ اور مہذب کہلانے والے طبقہ کے درمیان نظر ڈالیں تو آپ کو یہ ایک قوم اور ملک کے افراد نظر نہیں آئیں گے بلکہ ان دونوں کے درمیان برسوں نہیں بلکہ صدیوں کی مسافت معلوم ہو گی۔

﴿انہیں کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی﴾

غور وفکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تمام اسلام کی روح تقویٰ ہے اور اسلام نے جو مختلف قسم کی عبادات کا حکم دیا ہے اس کی غرض وغایت بھی تقویٰ ہی ہے۔ تقویٰ کیا ہے؟ علامہ زبیدیؒ نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ ابن سیدہ نے کہا ہے کہ تقویٰ اصل میں وقویٰ تھا۔ یہ فُعلیٰ کے وزن پر اسم (حاصل بالمصدر) ہے اور ''وقیت'' سے بنا ہے۔ واؤ کو تا سے بدل دیا تو یہ تقویٰ ہو گیا۔ اسی ''تقاۃ'' اصل میں ''وقاۃ'' ہے، اور وقاو بقیہ کا معنی ہے کسی چیز کو اذیت سے محفوظ رکھنا اور اس کی حمایت اور حفاظت کرنا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے

﴿ما لھم من اللہ من واق﴾ (رعد:۳۴)

''انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں۔'' (تاج العروس: جلد۱۰ص۳۹۶)

امام راغب کے نزدیک تقویٰ کا معنی ہے کسی ڈرانے والی چیز سے نفس کو بچانا اور اس کی حفاظت کرنا۔ اور اس کا شرعی مطلب ہے: گناہ کی آلودگی سے نفس کی حفاظت کرنا اور یہ ممنوعہ کاموں کے ترک سے حاصل ہوتا ہے۔ اور کامل تقویٰ تب حاصل ہوتا ہے جب بعض مباحات کو بھی ترک کر دیا جائے جیسا کہ حدیث نبویؐ میں ہے کہ حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص مشتبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا۔ (بخاری: جلد۱ص۱۳)

علامہ سید شریف نے تقویٰ کی بہت سی تعریفات کی ہیں،

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے نفس کو عدم اطاعت کے عذاب سے بچانا تقویٰ ہے، اللہ تعالیٰ کی معصیت کے عذاب سے نفس کو بچانا تقویٰ۔ اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے خود کو محفوظ کرنا تقویٰ ہے۔ آداب شریعت کی حفاظت کرنا تقویٰ ہے۔ ہر وہ کام جو تم کو اللہ سے دور کر دے اس سے خود کو باز رکھنا تقویٰ ہے۔ حظوظ نفسانیہ کو ترک کرنا اور ممنوعات

سے دور رہنا تقویٰ ہے۔ ماسوٰی کو ترک کرنا تقویٰ ہے اور نبی اکرم ﷺ کی قولاً اور فعلاً اقتداء کرنا تقویٰ ہے۔ (کتاب التعریفات: ص ۳۹)

حافظ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ انسان کے جسم کی صحت اور سلامتی تین چیزوں پر موقوف ہے:

اول: یہ کہ ایسی غذا استعمال کی جائے جو جسم کی قوتوں کی حفاظت کرے۔

دوم: یہ کہ جن مواد فاسدہ اور اخلاط ردیہ سے صحت خراب ہوتی ہے اس سے تنقیہ کیا جائے۔

سوم: یہ کہ جو چیزیں مضر صحت ہیں اور جن کے استعمال سے ضرر و نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ان چیزوں سے قطعاً پرہیز کیا جائے۔

جو حال جسم کا ہے وہی حال قلب کا ہے۔ قلب کی زندگی کے لیے ایمان و یقین اور اعمال صالحہ کی غذا لازمی ہے، اسی سے قلب کی قوتوں کی محافظت ہوتی ہے اور توبہ نصوح کے ذریعہ مواد فاسدہ اور اخلاط ردیہ کا تنقیہ ہوتا ہے۔ اور صحت قلب کے لیے جن چیزوں سے پرہیز ضروری ہے اور جو امور صحت قلب کے منافی ہیں، ان سے قطعی پرہیز لازمی ہے۔

تقویٰ ایک ایسا اسم ہے جو ان ہر سہ امور کو مشتمل ہے۔ ان تین امور میں جو کچھ بھی کمی ہوگی اسی مقدار سے تقویٰ کی کمی ہوگی۔

اب سمجھ لیں کہ گناہ ان ہر سہ امور کے خلاف اور منافی و متضاد ہے۔ گناہ سے ردی مواد اور اخلاط ردیہ جمع ہو جاتے ہیں جو صحت قلب کے لیے کلیتاً منافی ہیں اور قلب کو توبہ نصوح کے ذریعہ تنقیہ و استفراغ سے قطعاً روک دیتے ہیں۔ تم کسی ایسے مریض کو دیکھو جس کے اندر مواد فاسدہ اور اخلاط ردیہ پوری طرح مجتمع ہو گئے ہیں اور مریض ان اخلاط اور مواد کا تنقیہ نہیں کرتا تو بتائیں کہ اس کی صحت اور زندگی کیوں کر باقی رہے گی۔

کسی شاعر نے کیا اچھا کہا

جسمک بالحمیة حصنه　　مخافة من الم طاری

تو اپنے جسم کو پرہیز کے ذریعہ محفوظ رکھ اس ڈر سے کہ تجھ پر کوئی
مرض حملہ کر دے

وکان اولی بک ان تحتمی　　من المعاصی خشیة الباری

> تیرے لیے بہتر یہ تھا کہ تو باری تعالیٰ کے خوف سے معاصی سے اجتناب رہے۔

جس شخص نے اوامر الٰہیہ کی تعمیل و اتباع اور نواہی و محرمات کے اجتناب کے ذریعہ اپنی قوت کی محافظت کر لی اور توبہ نصوح کے ذریعہ اخلاط ردیہ اور مواد فاسدہ کا تنقیہ کر لیا تو سمجھ لو کہ وہ ہر طرح سے محفوظ ہو گیا۔ ہر خیر و بھلائی بلا طلب اس کے لیے موجود ہے اور ہر شر و فساد سے بغیر فرار ہی محفوظ ہے۔ واللہ المستعان۔

تقویٰ کی آسان اور صحیح تعریف سیدنا ابی بن کعبؓ نے سیدنا عمرؓ کے سوال پر فرمائی۔ سیدنا عمرؓ نے ایک مرتبہ سیدنا ابی بن کعبؓ سے پوچھا: ''تقویٰ کیا ہے؟'' سیدنا ابیؓ نے فرمایا: ''امیر المومنینؓ! آپ کبھی ایسے راستہ سے گزرے ہیں جس کے دو طرف کانٹے ہوں؟'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''ہاں، مجھے کئی بار ایسے راستوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔'' سیدنا ابی بن کعبؓ نے فرمایا: ''پھر آپ نے ایسے مواقع پر کیا کیا ہے؟'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا: ''میں اپنے دامن کو سمیٹ کر اور نہایت احتیاط سے چلا مبادا مجھے کوئی کانٹا نہ لگ جائے۔'' سیدنا ابی بن کعب نے فرمایا: ''بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔'' فرمایا: یہ دنیا ایک خارستان ہے اور ہر طرف حرص و شہوات اور معاصی اور گناہوں کے کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس دنیا میں اس طرح زندگی گزارنا چاہیے کہ ان کانٹوں سے انسان کا دامن نہ الجھے۔ اگر آپ نے اس طرح زندگی گزاری تو آپ حقیقتاً متقی اور صاحب تقویٰ ہیں۔

یہ تو تقویٰ کے معنی تھے، لیکن ہمارے اکابر و اسلاف نے تقویٰ کے ان معنوں کو عملی جامہ پہنایا اور انھوں نے سیدنا عمرؓ کے اس قول پر صحیح معنوں میں عمل کیا کہ:

> ''بندہ تقویٰ کی حقیقت کو اس وقت تک نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ ان چیزوں کو استعمال کرنا بھی نہ چھوڑ دے جن کے استعمال سے ایک انسان کے دل میں کسی قسم کی کھٹک اور خلش پیدا ہوتی ہے۔''
>
> (بخاری: جلد ۱ ص ۶)

چنانچہ یہاں چند بزرگوں کے تقویٰ کے کچھ واقعات بیان کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام کو معلوم ہو کہ وہ اکابر کیسے متقی اور پرہیزگار تھے۔

……

امام محمد بن سیرینؒ کا تقویٰ

امام محمد بن سیرینؒ کبار تابعین میں سے تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ، علم تعبیر رویاء اور پتہ نہیں کتنے علوم کے امام تھے۔ تقویٰ و پرہیزگاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک مرتبہ نہایت مقروض ہوگئے اور قرضداروں نے قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے جیل بھجوا دیا اور کئی ماہ تک جیل کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ قید کا سبب بھی اور مقروض ہونے کی وجہ بھی کچھ عجیب و غریب ہے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے چالیس ہزار درہم کا تیل خریدا۔ تیل مشکیزوں میں پیک تھا۔ اتفاقاً ایک مشکیزہ سے مرا ہوا چوہا نکلا۔ آپ نہایت پریشان ہوئے۔ تیل تو کھانے کے کام آتا تھا اور مرے ہوئے چوہے کا ایک مشکیزہ سے نکلنا تیل کو ناپاک کر دیتا ہے۔ آج کل کوئی تاجر ہوتا تو کانوں کان کسی کو اس چوہے کی خبر نہ ہونے دیتا اور سارا تیل منافع پر فروخت کر دیتا۔ کسی کو کیا پتا کہ وہ تیل پاک ہے یا ناپاک۔ آج کل تو کتوں اور گدھوں کا گوشت فروخت کر دیا جاتا ہے، اور پولٹری میں مری ہوئی مرغیوں کو بھی اونے پونے ریسٹورنٹ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ کسی کو اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ کوئی حرام چیز بیچ رہا ہے یا خبیث و طاہر۔

امام محمد بن سیرینؒ بھی ایسا کر سکتے تھے یا زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ جس مشکیزہ سے وہ مرا ہوا چوہا نکلا تھا اس مشکیزہ کا تیل پھنکوا دیتے۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ ممکن ہے یہ معصرہ (یعنی تیل کے ٹینک یا ذخیرہ) میں مرا ہو۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کی خاطر اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری کی خاطر سارے کا سارا تیل نجس اور ناپاک قرار دے کر بہا دیا۔ اس سارے تیل کی قیمت خرید چالیس ہزار درہم تھی جو ایک بہت بڑی رقم تھی۔ چنانچہ اس تیل کی قیمت ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے مقروض ہوگئے اور پھر مدت تک جیل میں رہے۔ (سیر اعلام النبلاء: جلد۴ ص ۶۱۳)

امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ جیل کا داروغہ آپ کی منقبت اور بزرگی سے آشنا

تھا اور اس کو ان کے جیل میں آنے کا سبب بھی معلوم تھا، اس لیے اس نے اپنی طرف سے ان سے درخواست کی کہ آپ رات کو اپنے گھر چلے جایا کریں اور صبح کو واپس آ جایا کریں۔ امام محمد بن سیرینؒ نے فرمایا:

> ''خدا کی قسم! میں بادشاہ وقت سے خیانت کرنے پر تیرا معین و مددگار نہیں بن سکتا۔''

ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فروخت کے لیے غلہ خریدا اس میں آپ کو اسی ہزار درہم کا فائدہ ہوا، لیکن آپ کو شک گذرا کہ اس منافع میں سود کا شائبہ ہے، حالانکہ اس میں ربوا (سود) نہیں تھا، لیکن شبہ کی بنا پر ہی آپ نے وہ پوری رقم چھوڑ دی۔

آج ہیں اسلام کے نام لینے والے ایسے تاجر جو اس دیانت داری کے ساتھ تجارت کریں۔ اسی وجہ سے حدیث میں ایسا تاجر جو صادق بھی اور امین بھی ہو، اس کو قیامت کے روز انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین کی صحبت نصیب ہوگی۔

ایسا متقی اور پرہیزگار شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول اور مستجاب الدعوات ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ ان سے نماز جنازہ پڑھواتے ہیں۔ آج کل تو جنازہ پڑھانے کے لیے متقی اور صالح ہونا ضروری نہیں، لیکن سلف میں لوگ مرنے والوں کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے نیک اور متقی شخص کو تلاش کرتے تھے، ثابت البنانیؒ ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ نہایت نمازی اور پرہیزگار۔ بلکہ لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے نمازی تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جن دنوں حضرت خواجہ حسن بصریؒ جو اپنے زمانہ کے اولیاء کبار میں سے تھے، اور حدیث وفقہ میں بھی ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے مظالم کے باعث روپوش تھے، ان دنوں ان کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ثابتؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے انہیں ان کی صاحبزادی کے انتقال کی اطلاع دی تو میرا خیال تھا کہ آپ مجھے اس کی نماز جنازہ پڑھانے کی بابت فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے فرمایا: ''محمد بن سیرینؒ کے پاس جا کر ان سے نماز جنازہ پڑھانے کی میری طرف سے درخواست کریں۔'' (طبقات ابن سعد: جلد ۷ ص ۲۰۴)

سیدنا انس بن مالکؓ مشہور صحابی رسول ﷺ تھے بلکہ آپ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ یہ امام محمد بن سیرینؒ کے استاذ بھی تھے۔ انہوں نے مرض الموت میں یہ وصیت فرمائی کہ وفات کے بعد محمد بن سیرینؒ انہیں غسل دیں اور ان کی نماز جنازہ بھی وہی پڑھائیں۔

اتفاق ایسا ہوا کہ جس زمانہ میں سیدنا انسؓ کا انتقال ہوا اس زمانہ میں امام محمد بن سیرینؒ پس دیوار زنداں تھے۔ آپ نے حاکم شہر سے صرف سیدنا انسؓ کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ کے لیے اجازت لی۔ چنانچہ آپ غسل اور نمازہ جنازہ کے بعد اپنے اہل و عیال سے ملے بغیر سیدھے قید خانے واپس تشریف لے گئے۔ (وفیات الاعیان: جلد۳ص۱۸۲)

* * *

بشر حافیؒ کی ہمشیرہ کا تقویٰ

حضرت بشر حافیؒ (م ۲۲۷ھ) کبار اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ان کی تین بہنیں تھیں۔ مضغہ، مخہ اور زبیدہ۔ تینوں نہایت عابدہ، زاہدہ اور متقیہ تھیں۔ تواریخ کی کتابوں میں ان کے زہد و تقویٰ کی حیرت انگیز اور حیرت زا واقعات درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف مرد ہی زاہد و متقی نہ تھے بلکہ عورتیں بھی مردوں سے کم نہ تھیں۔ اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کو ملتا تو تقویٰ کی تلقین کرتا (اوصیکم بتقوی اللہ)، ماحول اتنا پاکیزہ تھا کہ برائی کو ایک تعجب خیز چیز سمجھا جاتا تھا۔ آج تو انگریزی تعلیم نے ماحول ایسا پیدا کر دیا ہے کہ اس میں نیکی منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ گذشتہ دنوں ایک پاکستانی فلم ایکٹریس نے ہندوستان کے ایک ہندو فلم ایکٹر سے بوس و کنار کا سین فلمایا۔ اخبارات میں اس کی تصویر شائع ہوئیں لیکن نہ اس فلم ایکٹریس کو حیا آئی اور نہ ہی اس کے والدین اپنی بیٹی کے فعل پر نادم ہوئے، اور اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے ایک وزیر بے تدبیر نے یہ بیان اخباروں کی زینت بنا دیا کہ جب ہم نے دنیا کے ساتھ چلنا ہے تو ایسے کام تو کرنا ہوں گے۔ اس کا نام آج کل کی اصطلاح میں روشن خیالی اور معتدل اسلام ہے جس میں یہ سب چیزیں جائز بلکہ ضروری ہیں۔ حکیم الامت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے اگر آج کوئی صحابیؓ اس دنیا میں آ جائے تو وہ ہماری خلاف اسلام حرکتوں کو دیکھ کر ہمیں کافر کہے اور ہم اس کے اسلام و پابند اعمال کو دیکھ کر اسے مجنون اور پاگل کہیں۔ ہمارے اسلام کو دیکھ کر ابوجہل بھی کف افسوس ملتا ہوگا کہ میں نے کیوں اسلام سے انکار کیا۔ اقبالؒ نے سچ کہا

زبان پہ آیۂ ایاک نستعین بھی رہتی
صنم کے سامنے لیکن تیری جبین بھی رہتی

اور یہ بھی کہا ہے

زباں نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس ماحول میں مرد و زن کی دل و نگاہ مسلمان تھیں اور نیکیوں میں مسابقت ہوتی تھی۔ مرد عورتوں سے آگے بڑھنا چاہتے تھے اور عورتیں مردوں سے۔ حضرت بشر حافیؒ بھی کبار اولیاء اللہ میں سے تھے لیکن ان کی یہ تینوں بہنیں بھی بھائی سے زہد و تقویٰ سے پیچھے رہنے والی نہیں تھیں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بشر حافیؒ کی ایک بہن حضرت مخہؒ میرے والد کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ ”حضرت! میرا کل سرمایہ دو دانق (اس زمانے کا روپیہ) ہے جس سے میں روئی خریدتی ہوں، اور اسے کات کر نصف درہم (یعنی تین دانق) میں فروخت کرتی ہوں۔ اور ایک سے دوسرے جمعہ تک (یعنی پورا ایک ہفتہ) اس ایک دانق کو اپنی ضروریات زندگی اور کھانے پینے میں صرف کرتی ہوں۔ یعنی ایک ہفتہ کا کل خرچ ان کا ایک دانق تھا اس سے ان کے زہد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مخہؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے کہا: ”اے امام! ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں رات کو روئی کات رہی تھی تو ابن طاہر جو بغداد کے محافظین کا نگران اعلیٰ تھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے گذرا۔ اس کے پاس قندیل تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے میرے گھر کے قریب کھڑا ہو گیا اور مفاد عامہ اور دیگر امور کے بارہ میں لوگوں سے گفتگو کرنے لگا۔ میں نے قندیل کو غنیمت جانتے ہوئے اس کی روشنی میں کچھ روئی کات لی۔ کچھ دیر کے بعد وہ لوگ چلے گئے اور روشنی غائب ہو گئی۔

بعد میں مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ سرکار کی اس روشنی میں روئی کاتنے کے بارہ میں مجھے حق تعالیٰ شانہ ضرور سوال کریں گے کیونکہ مجھے اس سرکاری قندیل کی روشنی سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اے احمدؒ! آپ مجھے اس فکر و پریشانی سے نجات دلائیں اور میرے لیے خلاصی کا کوئی ایسا راستہ نکالیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو بھی دینی اور دنیوی پریشانیوں اور فکروں سے نجات نصیب فرمائے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے اس عورت سے فرمایا کہ تم اپنا راس المال یعنی دو دانق

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دو۔ اس کے بعد تمہارے پاس راس المال نہیں رہے گا اور حق تعالیٰ شانہ اس کے عوض میں کوئی بہتر شی عطا فرما دیں گے۔

جواب تو سوال سے بھی زیادہ سخت تھا۔ وہ عورت اگر اپنا راس المال بھی اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیں تو اب اس کی ضروریات زندگی پوری کرنے کا باعث کیا ہوگا؟ یہ بات امام احمدؒ کے بیٹے عبداللہؒ کی سمجھ میں نہ آئی، لہٰذا اس نے اپنے والد سے عرض کیا: ''ابا جان! آپ اس عورت کو صرف اتنی روئی صدقہ کرنے کا حکم فرماتے جتنی اس نے اس سرکاری قندیل کی روشنی میں کاتی تھی تاکہ اس کا راس المال اس کے پاس بچا رہتا؟ امام احمدؒ نے فرمایا: ''اس کے سوال میں کسی تاویل کی گنجائش ہی نہ تھی یعنی اس کا سوال ہی اتنے شدید تقویٰ پر مبنی تھا کہ اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا جو میں نے اس کو دیا۔

پھر آپ نے پوچھا: ''یہ عورت کون تھی؟'' عبداللہ نے عرض کی: ''یہ حضرت بشر حافیؒ کی ہمشیرہ محترمہ تھیں۔ آپ نے فرمایا: ''انہیں یہ تقویٰ انہیں کے گھر سے نصیب ہوا ہے۔''

(طبقات الحنابلہ: جلد ۱ ص ۴۲۷)

امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے ہی فرماتے ہیں: کہ میں ایک روز اپنے والد امام احمدؒ کے پاس گھر میں بیٹھا تھا۔ کسی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابا نے مجھے فرمایا: دیکھو کون آیا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک عورت کو دروازے پہ کھڑا دیکھا۔ اس عورت نے مجھے کہا اپنے ابا سے کہو کہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ ابا نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ اندر آ کر ابا کے پاس بیٹھ گئی اور سلام کرنے کے بعد مسئلہ پوچھا۔ یہ مسئلہ بھی عجیب وغریب تھا اور کوئی زاہدہ اور انتہائی متقیہ عورت ہی یہ مسئلہ پوچھ سکتی ہے۔ اس عورت نے کہا:

> ''اے ابو عبداللہ! میں رات کے وقت چراغ کی روشنی میں اون کاتتی ہوں۔ بعض مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ چراغ بجھ جاتا ہے تو میں چاند کی چاندنی میں اون کات لیتی ہوں۔ آپ مجھے مسئلہ بتائیں کہ کیا یہ لازم ہے کہ اون فروخت کرتے وقت لوگوں کو چراغ اور چاند کی روشنی میں کاتی ہوئی اون کا فرق بتاؤں؟''

امام احمدؒ نے اس عورت کی یہ بات سن کر فرمایا کہ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ چراغ کی

روشنی میں کاتی ہوئی اون اور چاند کی چاندنی میں کاتی ہوئی اون میں فرق ہوتا ہے تو پھر تم پر لازم ہے کہ اون فروخت کرتے وقت اس فرق کو بیان کرو۔“

امام احمدؒ کے صاحبزادے عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ وہ عورت اپنے سوال کا جواب سن کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد امام احمدؒ نے فرمایا: ”بیٹا! میں نے کبھی کسی انسان کو اس عورت کی طرح سوال کرتے نہیں سنا یعنی اس عورت کا سوال جس احتیاط اور تقویٰ پر مبنی تھا اس قسم کا سوال میں نے کسی اور شخص کو کرتے نہیں سنا۔ تم اس عورت کے پیچھے جاؤ اور پتہ کرو کہ یہ کہاں جاتی ہے اور کس گھر میں داخل ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ابا کے کہنے پر اس عورت کے پیچھے گیا اور دیکھا کہ وہ عورت حضرت بشر حافیؒ کے گھر میں داخل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ حضرت حافیؒ کی ہمشیرہ تھی۔ واپس آ کر میں نے ابا کو بتایا تو انہوں نے فرمایا: ”یہ ناممکن ہے کہ بشر حافیؒ کی بہن کے علاوہ کوئی اور عورت اتنی متقیہ اور پرہیزگار ہو۔ (طبقات الحنابلہ: جلد ۱ ص ۴۲۸)

……

﴿حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کا تقویٰ﴾

اوپر دیئے گئے واقعات تو تابعین اور تبع تابعین کے زمانوں کے ہیں، لیکن ماضی قریب میں بھی کچھ بزرگ ایسے گذرے ہیں جن کا تقویٰ اور پرہیزگاری ایسی ہی تھی۔ ان اکابر میں ایک بزرگ حضرت مظفر حسین کاندھلویؒ بھی تھے۔ مولانا مرحوم کے بارہ میں یہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی سواری کا کرایہ کرتے تو مالک کو سب چیزیں دکھلا دیا کرتے تھے۔ پھر اگر بعد میں کوئی شخص خط بھی لاتا تو فرماتے کہ بھائی میں نے سارا اسباب مالک کو دکھلا دیا ہے اور یہ خط اس میں نہیں تھا، اس لیے تم خود مالک سے اجازت لے لو تو میں تمہارا یہ خط لے جاؤں گا۔

اسی طرح زمانہ طالب علمی ہی میں آپ اس قدر متقی اور پرہیزگار تھے کہ دہلی کے قیام طالب علمی میں بازار سے کھانے کا نظم تھا، لیکن حضرتؒ بغیر سالن کے روٹی کھایا کرتے تھے، اس لیے کہ دہلی کے سالنوں میں بازاری ہوں یا گھریلو اچور کا دستور بہت کثرت سے تھا اور آموں کی بیع قبل از وقت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوتی ہے، اس لیے حضرتؒ دہلی کے بازار کا سالن نہیں کھایا کرتے تھے۔

کتابوں میں یہ بھی ہے کہ آپ کا معدہ مشتبہ چیز کو قبول نہیں کرتا تھا۔ اگر کبھی آپ نے کوئی مشتبہ چیز کھالی تو فوراً قے ہو جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے حضرت مولاناؒ اعزاء اور اقارب کے ہاں جہاں کہیں تشریف لے جاتے، میزبانوں کو فکر ہو جاتی کہ کہیں حضرت کے کھانے کے بعد اپنی رسوائی نہ ہو۔ مشتبہ مال کھانے کے بعد قے ہو جانے کے آپ کے متعدد واقعات ہیں۔ تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ مولوی نور الحسن کاندھلویؒ کے ہاں تشریف لے گئے۔ انہوں نے کچھ رقم اپنے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم کو دی اور تاکید کی کہ خود جا کر ان کے لیے کھانے کا سامان لائیں تاکہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ کھانا تیار ہوا تو اس میں فیرینی بھی تھی جس کے کھاتے ہی مولانا کو قے ہوگئی۔ یہ دیکھ کر مولوی نور الحسن سخت پریشان ہوئے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ جو دودھ مولوی محمد ابراہیم صاحب لائے تھے وہ گر گیا تھا اور دوسرا دودھ باورچی حلوائی کے ہاں سے مانگ کر لے آیا تھا۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کا تقویٰ

حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری محشی صحیح بخاری کا قیام چونکہ ہمیشہ کلکتہ میں رہا اور کلکتہ کے گرد و نواح کے لوگ حضرت سے واقف و آشنا تھے اس وجہ سے مدرسہ مظاہر العلوم کے چندہ کے لیے حضرت نے کلکتہ کا سفر فرمایا، اور سفر سے واپسی پر سفر خرچ کا ایک ایک پیسے کا حساب درج تھا۔ اس حساب کو میں نے خود بھی نہایت بے غیرتی سے پڑھا کہ جن کے اکابر کی یہ احتیاط ہو ان کے اصاغر کی بے التفاتیاں انتہائی موجب قلق ہیں۔ اس حساب کے اخیر میں ایک نوٹ یہ بھی تھا کہ کلکتہ سے فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے کی غرض سے گیا تھا۔ اگرچہ وہاں چندہ اندازہ سے زیادہ ہوا لیکن میرے سفر کی غرض چندہ کی نیت سے جانے کی نہیں تھی، اس لیے اتنی مقدار سفر کلکتہ سے وضع کر لی جائے۔

(آپ بیتی نمبر ۵ ص ۱۸۷)

* * *

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کا تقویٰ

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہ جب حجاز میں ایک سال قیام کے بعد سن ۱۳۳۴ھ کے اواخر میں مظاہر اسلام واپس تشریف لائے تو حضرت شیخ الحدیث کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کا شروع ذی قعدہ میں انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت سہارنپوریؒ نے مدرسہ سے یہ تحریر فرما کر تنخواہ لینے سے انکار کر دیا کہ ”میں اپنے ضعف اور پیری کی وجہ سے کئی سال سے مدرسہ کا کام پورا نہیں کر سکتا، لیکن اب تک مولانا یحییٰ صاحب میری نیابت میں دورہ کے اسباق پڑھاتے تھے اور تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ وہ میرا ہی کام سمجھ کر کرتے تھے اور میں اور وہ دونوں مل کر ایک مدرس سے زیادہ کام کرتے تھے۔ اب چونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور مدرسہ کی تعلیم کا پورا کام نہیں کر سکتا اس لیے تنخواہ قبول کرنے سے معذور ہوں۔“

اس پر حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہ سے بڑی طویل خط و کتابت ہوئی۔ حضرت رائے پوریؒ نے لکھا کہ آپ کے وجود کی مدرسہ کو سخت ضرورت ہے۔ آپ کے وجود سے مدرسہ کا سارا نظام باحسن وجوہ قائم ہے، اس لیے آپ کو مدرسہ اب تعلیم کی تنخواہ نہیں بلکہ ناظم مدرسہ کی تنخواہ دے گا۔ حضرت کے مدرسہ میں تشریف نہ رکھنے سے مدرسہ کو سخت نقصان ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے بھی حضرت رائے پوریؒ کی تائید فرمائی اور اس پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے تنخواہ لینی قبول فرمائی۔ (آپ بیتی نمبر   ص ۳۵)

یہ اخلاص اور تقویٰ آج مدارس و مساجد میں کہاں ملتا ہے؟ آج تو مدرسین کام نہ بھی کریں تب بھی تنخواہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اور پڑھاتے وقت بھی توجہ سبق کی طرف

نہیں ہوتی بلکہ دوسرے گھریلو کاموں یا ذاتی امور کی طرف ہوتی ہے۔ حضرت مولانا محمد مظہرؒ جن کے نام پر مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ہے، وہ مدرسہ کے اوقات میں جب کوئی ذاتی ملاقات کے لیے آتا تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر حضرتؒ کی کتاب میں ایک پرچہ رکھا ہوتا تھا، اس پر تاریخوں اور منٹوں کا اندراج فرما لیتے، اور مہینے کے اختتام پر ان کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم ہوتا تو آدھ روز کی رخصت، اور اگر نصف یوم سے زائد ہوتا تو ایک روز کی رخصت مدرسہ میں لکھوا دیتے۔ البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے آتا تو اس کا اندراج وغیرہ نہیں فرماتے تھے۔ آج کون سا مدرسہ ہے جس میں مہتمم سمیت کسی استاذ کو ان باتوں کا خیال ہوتا ہے؟

* * *

حضرت مولانا محمد منیر نانوتویؒ کا تقویٰ

حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی قدس سرہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔ ایک مرتبہ وہ مدرسہ کے اڑھائی سو روپے لے کر مدرسہ کی سالانہ روداد طبع کرانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔ اتفاق سے وہاں آپ کے یہ روپے چوری ہو گئے۔ مولانا محمد منیر صاحبؒ نے اس چوری کی کسی کو اطلاع نہ دی اور واپس گھر آ کر اپنی کوئی زمین وغیرہ فروخت کی اور اڑھائی سو روپے لے کر دہلی واپس گئے اور روداد چھپوا کر لے آئے۔ اس زمانہ میں اڑھائی سو روپے خطیر رقم تھی، لیکن مولانا محمد منیر صاحبؒ کو اس کے لیے اپنی ایک جائداد فروخت کرنا پڑی، لیکن بتایا کسی کو نہیں۔ کچھ روز کے بعد اس کی اطلاع اہل مدرسہ کو ہو گئی۔ انہوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہ کو اس واقعہ کے بارہ میں لکھا اور حکم شرعی دریافت کیا۔ حضرت گنگوہیؒ نے جواب میں لکھا:

> "مولانا محمد منیر صاحب امین تھے، اور روپیہ بلا تعدی کے ضائع ہوا ہے اس لیے ان پر ضمان نہیں۔"

اس گفتگو کی رو سے اہل مدرسہ نے مولانا محمد منیر صاحبؒ سے درخواست کی جو اڑھائی سو کی رقم گم ہوئی آپ وہ مدرسے سے لیں کیونکہ بقول مولانا گنگوہیؒ شریعت کا حکم بھی یہی ہے، اور حضرت گنگوہیؒ کا فتویٰ بھی انہیں دکھلا دیا۔

حضرت مولانا محمد منیر صاحب نے فتویٰ دیکھ کر فرمایا

> "کیا میاں رشید احمد نے فقہ میرے ہی لیے پڑھی تھی، اور کیا یہ مسائل میرے ہی لیے ہیں۔ ذرا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھیں۔ اگر ان کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لیتے۔ جاؤ لے جاؤ اس فتویٰ کو۔ میں تو روپے کبھی نہیں لوں گا۔"

(ارواح ثلاثہ ص ۳۳۰ بحوالہ آپ بیتی)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا تقویٰ

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند اپنے زمانے کے کبار اولیائے کرام میں سے اور تقویٰ و پرہیزگاری کی روشن مثال تھے۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے حضرت نانوتویؒ کی جو سوانح لکھی ہے، اس میں بتایا ہے کہ مدرسہ میں چندوں اور زکوٰۃ وغیرہ سے جو مال آتا تھا، آپ اس کی نہایت احسن طریقہ سے حفاظت فرماتے اور جہاں شرعی طور پر اس کے خرچ کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ وہیں خرچ کرتے۔ اگر کبھی کسی ضرورت سے مدرسہ کے قلم دوات سے کوئی ذاتی خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانہ میں داخل کر دیتے۔ فرماتے یہ بیت المال کی دولت ہے ہم کو اس پر تصرف جائز نہیں ہے۔“

حضرت مولانا گیلانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

> ”حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مزاج میں حرارت بہت تھی، اور موسم گرما میں سرد مکان بہت مرغوب تھا۔ مدرسہ میں ایک سردخانہ تعمیر ہوا اور گرمی کی بہت شدت، مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم اول دارالعلوم دیوبند نے عرض کیا کہ سردخانہ تیار ہے، وہاں دوپہر کو آرام کیا کیجیے۔ فرمایا: ہم کون ہیں جو اس میں آرام کریں، یہ حق ہے طالب علموں کا۔ اور کبھی آپ نے سردخانہ میں جا کر استراحت نہ فرمائی اور گرمی کی تکالیف برداشت کیں۔“
>
> (سوانح قاسمی: جلد ۱ ص ۵۳۶)

ہمارے بزرگوں کا اکثر یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ مدرسہ کی اشیاء سے اپنا ذاتی فائدہ بالکل نہیں اٹھاتے تھے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہ کے بارہ میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ کے پاس ان کے عزیزوں

میں سے جو بڑے مرتبہ کے آدمیوں میں سے تھے، ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ حضرت سہارنپوریؒ اس وقت سبق پڑھا رہے تھے۔ اختتام سبق تک تو حضرت نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی لیکن سبق کے ختم ہونے کے بعد حضرت ان کے پاس تشریف لائے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ آپ وہیں تشریف رکھیں لیکن حضرت نے فرمایا کہ مدرسہ نے یہ قالین اسباق پڑھانے کے لیے دیا ہوا ہے، ذاتی استعمال کے لیے نہیں دیا، اس لیے اس قالین سے علیحدہ بیٹھ گئے۔ حضرت شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ میں نے مدرسہ کی اشیاء کو استعمال کرتے ہوئے حضرت کو نہیں دیکھا۔ مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ میں اکابر مدرسین وملازمین میں سے کبھی کسی کو جلسہ کے کھانے یا چائے یا پان کو کھاتے نہیں دیکھا۔ جملہ حضرات مدرسین اپنا اپنا کھانا کھاتے تھے، البتہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ خصوصی مہمانوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے لیکن حضرتؒ کے مکان سے دس بارہ آدمیوں کا کھانا آتا تھا جو متفرق مہمانوں کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا، اسی میں سے حضرت نوش فرماتے تھے۔ مدرسہ کی کوئی چیز آپ کو کھاتے نہیں دیکھا۔ (آپ بیتی نمبر ا ص ۳۶)

حضرت شیخ الحدیثؒ نے اپنے والد صاحب حضرت مولانا یحییٰؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ میرے والد صاحب کے زمانے میں مدرسہ کا مطبخ جاری نہیں ہوا تھا اور نہ ہی مدرسہ کے قریب کسی نانبائی کی کوئی دکان تھی۔ گھر والوں کے نہ ہونے کے زمانہ میں جامع مسجد کے قریب ایک طباخ (نانبائی) کی دکان تھی جس کا نام اسمٰعیل تھا۔ اس کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا۔ سردی کے زمانے میں وہاں سے آتے آتے خصوصاً شام کو وہ کھانا ٹھنڈا ہو جاتا تھا آپ سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں بلکہ باہر رکھوا دیا کرتے تھے۔ اس کی گرمی اور تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہو جاتا تھا لیکن آپ پھر بھی دو تین روپے ہر ماہ مدرسہ کے چندہ میں داخل کرا دیا کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے۔ اور تنخواہ تو میرے والد صاحبؒ نے اپنے مدرسہ کے سات سالہ قیام میں کبھی لی ہی نہیں۔

یہ سارے واقعات اب خواب وخیال معلوم ہوتے ہیں جب کہ یہ ماضی قریب سے تعلق رکھتے ہیں، اور مدرسہ کے مدرسین اور مہتمم حضرات میں چندہ کے بارہ میں وہ

احتیاط کہاں رہی ہے جو ہمارے اکابر اور بزرگوں میں تھی۔ اب مدارس میں کس قدر بے احتیاطی ہوتی ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن جو بے احتیاطیاں ہوتی ہیں ان کی قیامت کے روز ضرور پرسش ہوگی۔ اگر نہ ہوئی ہوتی تو ہمارے اکابر اتنی احتیاط نہ فرماتے۔ مہتممین اور ان کے صاحبزدگان یہ سوچ لیں ۔

ابھی سے سوچ سمجھ لو وگرنہ حشر کے دن
میرے سوال کا تم سے جواب ہو کہ نہ ہو

ہمارے بزرگ اور اکابر تو مجاہدات، تقویٰ و طہارت، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے اندر ہمہ تن مشغول تھے۔ ان کی زندگی صحابہ کرامؓ والی زندگی تھی۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات نہایت پختہ طور پر بیٹھ چکی تھی کہ دنیا کی زندگی خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو جائے بالآخر وہ ختم ہونے والی ہے۔ موت سے کسی کو جائے فرار نہیں۔ سمجھدار اور عقل مند آدمی کا کام یہ ہے کہ دائمی زندگی کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے کر لے۔ ان حضرات نے سرکار دو عالم ﷺ کے ارشادات کو دل میں جگہ دی اور ان پر عمل کر کے دکھایا اور آج ہمیں فخر ہے کہ وہ ہمارے اکابر تھے ۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اور انہی کے بارہ میں کہا گیا ہے:

خدا یاد آئے جن کو دیکھ کر وہ نور کے پتلے
نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظل رحمانی
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انہی کے اتقاء پہ ناز کرتی ہے مسلمانی
انہی کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انہی کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بے تعلق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی

اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

اسی تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ان میں تواضع کا عنصر غالب تھا۔ وہ کبھی بھی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا کہ شاہ غلام علی صاحبؒ میں عجز و انکسار اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک سید نے آپ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ ”حضرت! آپ مجھے اپنا خادم بنا لیں۔“ شاہ غلام علی گھبرا اٹھے اور فرمایا: ہا! ہا! یہ لفظ ہرگز زبان سے نہ نکالنا۔ تم فرزند علی ہو اور میں غلام علی ہوں۔“ (تذکرۃ الرشید: جلد ۲ ص ۲۶۲)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ جب گنگوہ سے رامپور جا رہے تھے تو حضرت گنگوہیؒ نے ان کی کھانے سے تواضع کرنے کی کوشش کی۔ مولانا مظفر حسینؒ نے فرمایا کہ دیر ہو جائے گی، جو گھر میں رکھا ہوا ہے وہی دے دو۔ حضرت گنگوہیؒ نے چند باسی روٹیوں پر ارد کی دال رکھ کر دی اور حضرت مولانا مظفر حسینؒ نے ان کو لپیٹ کر اپنی چادر میں باندھ لیا اور رامپور جا کر فرمایا: ”مولوی رشید احمد بہت اچھے آدمی ہیں۔“

انہی مولانا مظفر حسین صاحبؒ کے بارہ میں ایک اور واقعہ لکھا ہوا ہے کہ مولانا مرحوم نہایت سادہ طبیعت شخص تھے۔ بزرگ تھے، عالم تھے، درویش تھے، اور زمیندار بھی تھے۔ رہن سہن کا طریقہ ایسا تھا کہ کوئی ان کو عالم نہ سمجھتا تھا۔ ان کے ایک عزیز اور قرابت دار مولانا مملوک علی نانوتوی دہلی کے مدرسہ میں مدرس تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے استاذ تھے۔ دہلی سے نانوتہ جاتے ہوئے کاندھلہ راستہ میں واقع ہوتا ہے۔ حضرت مولانا مظفر حسینؒ نے ان سے شکایت کی جب کبھی آپ نانوتہ جاتے ہیں تو بغیر ملے چلے جاتے ہیں۔ مولانا مملوک علی نے کہا کہ اگر ٹھہرنے کا اصرار نہ کیا جائے تو میں آ جایا کروں گا۔

اس زمانہ میں سفر بہلی میں ہوا کرتا تھا۔ اس روز سے آپ کا یہ معمول ہو گیا کہ کاندھلہ پہنچ کر جنگل میں بہلی چھوڑ کر مولانا مظفر حسین صاحبؒ سے ملنے آتے پھر وہ ان کو بہلی تک پہنچاتے۔ ایک دفعہ جب وہاں پہنچے تو اول سوال یہ تھا کہ کھانا کھاؤ گے؟ یا کھا کر آئے ہو؟ اگر کھانا کھاؤ گے تو رکھا ہوا کھاؤ گے یا تازہ پکوا لیا جائے۔ مولوی صاحب نے

کہا کہ رکھا ہوا کھاؤں گا۔ بس ایک برتن میں کھچڑی کی کھرچن لا کر رکھ دی کہ رکھا ہوا تو یہ ہے۔ انہوں نے وہی کھالی۔

حکیم عبدالسلام ملیح آبادیؒ کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی خدمت میں جانے کا بہت شوق تھا۔ امیر شاہ خان سے فرمایا کرتے تھے کہ جب تو حضرت کی خدمت میں جائے تو مجھے اپنے ساتھ ضرور لے کر جانا، لیکن مجھ بدنصیب کے دل میں ایک خیال جم گیا تھا اور وہ یہ کہ حکیم صاحب بہت خوش بیان اور گویا آدمی تھے۔ امیر شاہ خان صاحب فرماتے ہیں کہ دوسری مرتبہ حکیم صاحب میرے ساتھ خود بخود ہو گئے۔ جب دیوبند پہنچے اس وقت مغرب کے بعد کا وقت تھا اور مولانا نانوتویؒ کا قیام حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کے مکان پر تھا۔ جب مکان قریباً پچاس قدم رہ گیا تو میں چند قدم آگے بڑھ کر مولانا کے پاس پہنچ گیا۔ مولانا نانوتویؒ کا لباس اس وقت یہ تھا۔ سر پر میلا اور پھٹا ہوا عمامہ تھا جس میں لیرے پڑے ہوئے تھے۔ اور چونکہ سردی کا زمانہ تھا اس لیے ایک دھوتر کی نیلی رنگی ہوئی مرزئی پہنے ہوئے تھے، جس میں بند لگے ہوئے تھے اور نیچے نہ کرتا تھا اور نہ انگرکھا تھا، اور ایک رزائی اوڑھے تھے جو نیلی رنگی تھی اور جس میں سوئی کی گوٹ لگی ہوئی تھی جو پھٹی ہوئی تھی اور کہیں تھی اور کہیں بالکل اڑی ہوئی تھی۔ میں نے سلام کر کے مصافحہ کیا اور حکیم صاحب کی آمد کی اطلاع کی۔ میں حکیم صاحب کا تعارف کرا ہی رہا تھا کہ اتنے میں حکیم صاحب بھی آ گئے۔ اس وقت مجلس کا یہ رنگ تھا کہ دروازہ کے سامنے مولوی ذوالفقار علی صاحب (والد حضرت شیخ الہندؒ) بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے برابر میں مظفر نگر کے ایک عالم بیٹھے ہوئے تھے، اور مولانا ایک طرف کو چارپائی سے کمر لگائے بیٹھے ہوئے تھے، اور ان کے برابر میں دیوبند کے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو لباس بھی عمدہ پہنے ہوئے تھے اور ڈاڑھی بھی شاندار تھی۔ جب حکیم صاحب پہنچے تو سب لوگ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حکیم صاحب مولاناؒ کے دھوکہ میں سب شاندار لوگوں سے مصافحہ کرتے رہے مگر مولانا کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ میں نے بتایا کہ مولانا یہ ہیں تو وہ مولانا سے مصافحہ کر کے وہیں بیٹھ گئے۔ (آپ بیتی نمبر ۵ ص ۲۲۵)

اس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسا عالم و

فاضل اور اتنا سادہ۔ یہ ساری سادگی اور تواضع تقویٰ اور زہد کی بنا پر تھا۔

مولانا احمد حسن امروہوی فرماتے ہیں کہ جب شاہ جہان پور کا مناظرہ ہوا تو مولانا بنفس نفیس چپکے سے تشریف لے گئے۔ جب مولانا محمود الحسن صاحبؒ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی مولانا کے بعد پیچھے پیچھے تشریف لے گئے۔ ور میں یعنی مولانا احمد حسن بھی بعد میں گیا تو شاہ جہان پور میں مولانا محمود الحسن صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا مولانا مل گئے؟ مولانا نے فرمایا کہ نہیں۔ مجھ کو تو بھی نہیں ملے میں نے کہا کہ اچھا چلو سرائے میں چل کر تلاش کریں۔ چنانچہ سرائے میں جا کر اس شخص سے معلوم کیا جو شخص نام لکھا کرتا تھا کہ یہاں کوئی شخص خورشید حسن بھی آئے ہیں؟ اس نے کہا کہ ہاں آئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے جو تلاش کیا تو ایک کوٹھڑی کے اندر مولانا تشریف رکھتے تھے۔ جب صبح ہوئی تو مولانا میدان مناظرہ میں تشریف لے چلے۔ راستہ میں ایک دریا پڑتا تھا۔ مولانا پیدل تھے۔ تو مولانا پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اتر پڑے جس سے پاجامہ بھیگ گیا۔ مولانا نے پار اتر کر لنگی باندھی اور پاجامہ اتار کر نچوڑ کر پیچھے لاٹھی پر گاؤں والوں کی طرح سے ڈال لیا اور تشریف لے چلے اور میدان مناظرہ میں پہنچ گئے۔ اور پھر جو مناظرہ ہوا تو حریف کو فرار کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

اتنا بڑا عالم اور اس قدر سادہ۔ آج کل تو تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا سادہ کوئی عالم ہو۔ ایک عالم کا بھی اس قدر سادہ ہونا محال ہے، لیکن ہمارے اکابر کی یہ خصوصیت تھی علم و عمل سے سرشار ہونے کے باوجود سادگی اور تواضع میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان کے ظاہر لباس کو دیکھ کر کوئی شخص ان کے علم کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ آج تو ظاہریت کا زمانہ ہے اندر سے ڈھول کا پول ظاہر میں لباس ایسا کہ علامۃ الدھر معلوم ہو۔ وہ بزرگ آئے تھے اور چلے گئے لیکن اپنے نقش زمانے کے رہگزار پر ایسے چھوڑ گئے کہ آج بھی ان کے نشان باقی ہیں۔

اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

……

﴿غیرت دینی﴾

جس قوم میں غیرت دینی ختم ہو جائے اصل میں وہ قوم مر جاتی ہے اگر چہ وہ زمین پر چلتی پھرتی نظر آئے۔ چند روز ہی ہوئے کہ اخبارات میں خبر آئی تھی کہ امریکہ میں کسی شخص نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف ایک کتاب لکھی ہے جو عیسائیوں نے ہاتھوں ہاتھ خریدی ہے اور اس کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ یہ دینی غیرت کا فقدان ہے کہ پوری امریکی قوم میں کوئی بھی غازی علم الدین شہید نہیں ہے۔ اس جنس زدہ معاشرہ میں انسانی غیرت تو ختم ہو ہی گئی تھی لیکن دینی غیرت بھی مر گئی ہے۔ جب انسانیت نہ رہے تو دین کیسے رہ سکتا ہے۔ انسانیت کا حال تو یہ ہے کہ برطانیہ سے شائع ہونے والے معروف اخبار "دی سن" (The Sun) میں ایک ایسی ماں کی جانب سے اشتہار شائع ہوا ہے جس کے اپنے بیٹے کے ساتھ گذشتہ سات سال سے نہ صرف جنسی تعلقات تھے بلکہ وہ اپنے بیٹے کے دو بیٹوں کو بھی جنم دے چکی ہے۔ اس نے اخبار میں I Want my son beack کے عنوان سے ایک اشتہار دیا ہے جس میں اس جنس زدہ ماں نے اپنے بیٹے سے فریاد کی ہے کہ وہ اسے پچپن (۵۵) سال کی عمر میں دو بچوں کی ماں بنا کر تنہا نہ چھوڑ دے کیونکہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے اور اس کی جدائی میں پریشان ہے۔ اخبار کے مطابق بیٹے نے ماں کے پاس واپس جانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا ہے کہ میں روز ایک نئی موت نہیں مر سکتا۔

برطانوی ماہر قانون مسٹر ہڈسن نے اس واقعہ کے بارہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خدا ہم پر رحم کرے۔ پتہ نہیں ہم اور کیا کچھ کریں گے۔ اس عورت کو مر جانا چاہیے تھا لیکن ڈھٹائی سے اخبارات میں اپیلیں شائع کروا رہی ہے۔ اب تو "ہم جنس پرستوں" کو قانونی تحفظ بھی مل گیا ہے، لیکن پھر بھی یہ عورت اپنے بیٹے کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔" (روزنامہ "دی سن" اشاعت مورخہ ۱۲ جولائی ۲۰۰۳ء)

کسی زمانہ میں مسلمان عورتوں میں حیا بھی تھی اور غیرت دینی بھی۔ چنانچہ سلطان عالمگیر کی بیگم جہاں زیب بانو کے دائیں پستان کی جڑ میں ایک پھنسی نمودار ہوئی۔ اس زمانہ کے ڈاکٹر مارٹن (Martin) نے اپنی ایک رشتہ دار عورت کو حیدرآباد بلایا اور چاہا کہ وہ بیگم عالمگیر کا علاج کرے۔ لیکن بیگم صاحبہ نے یہ شرط لگائی کہ

> "اگر وہ عورت شرابی نہیں ہے تو پھر وہ میرے بدن کو ہاتھ لگا سکتی ہے، ورنہ وہ اندر آنے کی کوشش نہ کرے۔"

جب اس عورت سے پوچھا گیا تو پتہ چلا کہ وہ چالیس سال سے شراب پی رہی ہے۔ اس پر ملکہ نے کہا:

> "ایسی فاسقہ فاجرہ عورت میرے بدن کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔"

بیگم صاحبہ نے موت کو قبول کر لیا کیونکہ وہ دو سال بیمار رہ کر انتقال کر گئیں لیکن ایک فاسقہ عورت سے علاج نہیں کرایا۔ (تاریخ الطب، عہد مغلیہ، ص ۸۶)

یہ ایک ملکہ کا حال ہے کہ جس میں اتنی دینی غیرت ہے لیکن آج کل تو روشن خیال اسلام کے تصور میں مراتھن دوڑیں مردوں اور عورتوں کی اکٹھی ہو رہی ہیں اور جو ان کو روکے اس پر دہشت گردی کی دفعات لگ جاتی ہیں۔ اقبال نے تو کافی عرصہ پہلے حکمت ارباب کہن کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا ؎

دختران او بزلف خود اسیر
شوخ چشم و خوش تن و خوردہ گیر
ساختہ پرداختہ دل باختہ
ابرواں مثل دو تیغ آختہ
ساعد سیمین شاں عیش نظر
سینۂ ماہی بموج اندر گہر

یہ مسلمان عورت کی تصویر کشی نہیں بلکہ ایک جنس زدہ معاشرہ کی عورت کی تصویر کشی ہے۔

❀

﴿میں امیر المومنین کی ضرورت جان گیا ہوں﴾

یہ الفاظ سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ کے ہیں جو انہوں نے سیدنا عمرؓ کا خط پڑھ کر فرمائے تھے۔ سن ۱۸ھ میں فلسطین کے ایک شہر عمواس میں طاعون پھیلا اور پھر اس کے جراثیم نے پورے شام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طاعون سے قریباً ۲۵ ہزار مسلمان لقمۂ اجل بن گئے جن میں بڑے بڑے جرنیل بھی تھے۔ سیدنا عمرؓ خود تدبیر و انتظام کے لیے مدینہ چھوڑ کر مقام ''سرغ'' پہنچے۔ سیدنا ابوعبیدہؓ اور دیگر سرداروں نے ان کا یہاں استقبال کیا اور آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ طاعون کی شدت بہت زیادہ ہوگئی ہے، لہٰذا آپ مہاجرین و انصار سے مشورہ کے بعد واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ مدینہ میں آپ نے وبا کے بارہ میں غور و فکر کرنا شروع کیا کہ مسلمانوں کو طاعون کی تباہ کاریوں سے کیسے بچایا جائے۔ امیر المومنین کو دوسرے لوگوں کے ساتھ سیدنا ابوعبیدہؓ کی بہت فکر تھی۔ آخر ''امین الامت'' تھے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ سیدنا عمرؓ کو سیدنا ابوعبیدہؓ کی زندگی اس لیے بھی عزیز تھی کہ وہ انہیں اپنے بعد خلیفہ نامزد کرنا چاہتے تھے، لہٰذا آپ نے ابو عبیدہؓ کو وبا کے گرداب سے نکالنے کے لیے خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

> ''مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے جس کے بارہ میں آپ سے زبانی بات کرنا چاہتا ہوں لہٰذا سخت تاکید کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ جونہی آپ کو میرا یہ خط موصول ہو فوراً میری طرف روانہ ہو جائیں۔''

سیدنا ابوعبیدہؓ مارشل آدمی تھے۔ آپ پوری زندگی اطاعت امیر کے پابند رہے لیکن اس خط کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ سیدنا عمرؓ صرف اس لیے مدینہ بلا رہے ہیں کہ مجھے اس طاعون زدہ علاقہ سے نکالا جا سکے۔ چنانچہ خط پڑھ کر انہوں نے ساتھیوں سے فرمایا کہ ''میں امیر المومنین کی ضرورت جان گیا ہوں، وہ ایک ایسے شخص کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو باقی رہنے والا نہیں۔'' یہ کہہ کر سیدنا عمرؓ کو یہ جواب لکھا

> "امیر المومنین! آپ نے مجھے جس ضرورت کے لیے بلایا ہے وہ مجھے پتہ چل گئی ہے۔ لیکن میں مسلمانوں کے ایسے لشکر کے درمیان بیٹھا ہوں جس کے لیے میں اپنے قلب میں اعراض کا کوئی جذبہ نہیں پاتا، لہذا میں ان لوگوں کو تنہا چھوڑ کر اس وقت تک نہیں آنا چاہتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارہ میں اپنی تقدیر کا حتمی فیصلہ نہیں فرما دیتا۔ اس وجہ سے اپنے اس تاکیدی حکم سے معاف فرمائیں اور مجھے اپنے لشکر ہی میں رہنے دیں۔"

جب سیدنا نے اپنے خط کا یہ جواب پڑھا تو آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے سیدنا عمرؓ کو جو آب دیدہ دیکھا تو پوچھا: "کیا ابو عبیدہؓ کی وفات ہو گئی؟" فرمایا: "ہوئی تو نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہونے والی ہے۔"

(سیر اعلام النبلاء جلد ۱ ص ۱۸)

نماز کا وقت آیا تو سیدنا ابوعبیدہؓ نے سیدنا معاذ بن جبلؓ کو نماز پڑھانے کا حکم فرمایا۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر سیدنا ابوعبیدہؓ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ سیدنا معاذ بن جبلؓ نے تجہیز و تکفین کی اور حاضرین کے سامنے ایک پردرد، موثر اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے والی تقریر کے بعد فرمایا:

> "صاحبو! آج تم میں سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا ہے کہ بخدا! میں نے اس سے زیادہ صاف دل، بے غش و کینہ، سیر چشم، عاقبت اندیش، دانش مند، باحیا، اور خلق خدا کا خیر خواہ کبھی نہیں دیکھا۔ پس خدا سے اس کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرو۔" (اصابہ جلد ۳ ص ۱۱)

چنانچہ تمام لشکر نے نمناک آنکھوں کے ساتھ تدفین کا فریضہ انجام دیا۔ وفات کے وقت اٹھاون سال عمر تھی۔ اس قلیل مدت میں جتنے حیرت زا کارنامے سرانجام دیے دنیا آج تک انگشت بدنداں ہے۔

※

اے اللہ!

❁ میری فراست کو لوگوں کے بارہ میں زائل نہ فرما ❁

یہ الفاظ سیدنا عمرؓ نے فرمائے تھے۔ اسی وجہ سے انہیں مردم شناسی میں خاص دخل تھا جس کا ہزاروں مرتبہ تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ سیدنا سعید بن عامرؓ اسی مردم شناسی کی وجہ سے سیدنا عمرؓ کی جانب سے حمص کے گورنر مقرر ہوئے تھے، لیکن اہل حمص نے سیدنا عمرؓ سے ان کی متعدد شکایتیں کیں اور دربار خلافت میں ان کی معزولی کی درخواست کی۔ سیدنا عمرؓ کو ان درخواستوں پر بڑا تعجب ہوا کہ میں نے تو اپنی نگاہ مردم شناس سے ان کو بہت بہتر سمجھ کر گورنر مقرر کیا تھا، پھر اس کی معزولی کے مطالبات کیوں ہو رہے ہیں۔ اگر میری فراست زائل ہوگئی تو پھر سارے ہی ملکوں میں نااہل لوگوں کے گھس آنے کا اندیشہ ہے۔

چنانچہ سیدنا عمرؓ نے سعید بن عامرؓ کو دربار خلافت میں طلب کیا اور جن لوگوں نے ان کی شکایت کی تھیں اور ان کی معزولی کا مطالبہ کیا تھا ان کو بھی بلایا۔ آپ نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگوں کو اپنے اس گورنر سے کیا کیا شکایت ہیں؟ انہوں نے تین شکایتیں کیں:

(۱) ایک یہ کہ یہ دن میں بہت دیر سے گھر سے نکلتے ہیں یعنی دیر سے عدالت میں آتے ہیں۔

(۲) دوسری شکایت یہ کہ اگر کوئی رات کو ان کے پاس جائے تو اس وقت اس کی شکایت نہیں سنتے۔

(۳) ہر ماہ میں ایک روز چھٹی کرتے ہیں۔

سیدنا عمرؓ ان کی یہ تینوں شکایات سن کر حیران ہوئے اور گورنر سے کہا کہ ان تینوں سوالوں کا نمبروار جواب دو۔ گورنر صاحب نے فرمایا:

(۱) ان لوگوں نے شکایت کی ہے کہ میں دیر سے گھر سے نکلتا ہوں، یہ بالکل درست ہے وجہ یہ ہے کہ میری اہلیہ تنہا کام کرنے والی ہے۔ میں آٹا گوندھتا ہوں، روٹی پکاتا ہوں۔ جب روٹی تیار ہو جاتی ہے تو کھانے سے فارغ ہو کر وضو کر کے باہر چلا آتا ہوں۔

(۲) دوسری شکایت یہ کہ میں رات کو کام نہیں کرتا۔ یا کوئی جاتا ہے تو اس کی حاجت پوری نہیں ہوتی۔ اس کا جواب میں دیتا لیکن میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس کا جواب دوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے دن اور رات کو تقسیم کر رکھا ہے۔ دن مخلوق خدا کے لیے اور رات خدا کے لیے۔ میں نے رات ساری کی ساری اپنے مولیٰ کو دے رکھی ہے۔

(۳) تیسری شکایت کہ میں مہینہ میں ایک روز چھٹی کرتا ہوں، اس کا جواب یہ ہے کہ میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے۔ میں مہینہ میں اپنے کپڑے خود ہی دھوتا ہوں۔

گورنر کے یہ جوابات سن کر سیدنا عمرؓ نے بارگاہ الوہیت میں شکر ادا کیا کہ میری فراست غلط نہ ہوئی۔ ان سب شکایت کرنے والوں سے فرمایا: ''اپنے گورنر کی قدر کرو۔'' جب سب شکایت کرنے والے چلے گئے تو سیدنا عمرؓ نے گورنر سعیدؓ کے پاس ایک ہزار اشرفیاں (دینار) بھیجیں کہ ان کو اپنی ضروریات میں استعمال کر لیں۔ گورنر صاحب کی بیگم کو جب ان اشرفیوں کا پتہ چلا تو کہا: ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے بہت سی ضروریات کا انتظام فرما دیا۔ ایک خادم بھی اس سے خریدا جا سکتا ہے اور دوسری ضروریت بھی پوری کی جا سکتی ہیں۔'' گورنر سعیدؓ نے فرمایا: ''یہاں ہم سے بھی زیادہ محتاج اور ضرورت مند لوگ موجود ہیں۔ ان اشرفیوں کو ان لوگوں پر خرچ نہ کر دیں؟'' بیوی بھی نیک بخت اور فرمانبردار تھی، لہٰذا اس نے شوہر کی بات کو بخوشی قبول کیا۔ انہوں نے اس میں سے چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بنا کر مختلف یتیموں اور مسکینوں کو بھیج دیں اور رقم کا بہت سا حصہ اسی وقت تقسیم کر دیا، اور جو کچھ باقی بچا وہ اہلیہ کے حوالے کر دیا کہ تھوڑا تھوڑا خرچ کرتی رہے۔ بیوی نے کہا کہ اس بچی ہوئی رقم سے ایک غلام خرید لیں۔ گھر کے کام کاج میں آپ کو سہولت ہو جائے گی۔ فرمانے لگے: ''نہیں، عنقریب تجھ سے زیادہ ضرورت والے تیرے پاس آئیں گے۔''

بے مثال اطاعت

ایک رات سیدنا فاروق اعظمؓ حسب معمول لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے۔ اتفاقاً آپ کو کچھ تھکن سی محسوس ہوئی اور آپ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں آپ نے سنا کہ ایک بڑی بی اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ کل مدینہ میں بازار لگتا ہے، لہذا دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا دے۔" اس لڑکی نے اپنی والدہ سے کہا: "اماں! امیر المومنین کا حکم ہے کہ کوئی شخص کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ نہ کرے۔" بڑی بی نے جواب دیا: "امیر المومنین ہمیں کون سا دیکھ رہے ہیں۔ وہ تو اس وقت گھر میں سوئے ہوں گے۔" جب کہ امیر المومنین ان کی سب باتوں کو اپنے کانوں سے سن رہے تھے۔ اس لڑکی نے یہ جواب دیا: "مجھ سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ امیر المومنین کے سامنے تو اس کی اطاعت کروں اور ان کی غیر موجودگی میں نافرمانی کروں۔"

سیدنا فاروق اعظمؓ کو لڑکی کی اس بات پر بڑا تعجب ہوا۔ آپ اس نادار، دیانت دار اور زیرک و ذہین لڑکی کی باتوں سے بڑے متاثر ہوئے کہ خیموں میں رہنے والی ایک لڑکی باوجود ناداری اور قلاشی کے اس قدر دیانت دار اور قانون کی اطاعت کرنے والی ہے کیونکہ دودھ میں پانی ملانے سے دودھ زیادہ ہوگا اور پیسے زیادہ آئیں گے۔ فاروق اعظمؓ کو یہ علم نہیں تھا کہ بچی کو دودھ پانی ملانے کا حکم دینے والی عورت اس کی ماں ہے ورنہ آپ کی حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ آپ کو اس بات پر بھی تعجب ہوا کہ ایک بچی بڑی بی کو نیکی کی تلقین کر رہی ہے اور بڑی بی عمر رسیدہ اور سمجھدار ہو کر بھی نیکی کی طرف مائل نہیں ہے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ کاش اس لڑکی کو بیوی بنا لیا جائے کیونکہ یہ اولاد کی نہایت اچھے طریقے سے تربیت کر سکتی ہے۔ آپ نے اپنے غلام اسلمؓ سے فرمایا کہ اس خیمے کو ذہن میں رکھو۔ آپ نے صبح اسلم سے کہا کہ اس جگہ جا کر دیکھو

اور اس بات کی تحقیق کرو کہ یہ بات کن دو کے درمیان ہوئی، اور کیا یہ دونوں عورتیں شادی شدہ ہیں، اسلمؒ صبح گئے اور حقیقت حال کا پتہ چلایا۔ معلوم ہوا کہ لڑکی دوشیزہ اور غیر شادی شدہ ہے اور وہ خاتون جو دودھ میں پانی ملانے کی ترغیب دے رہی تھی، اس دوشیزہ کی والدہ ہے۔ ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں اور اس خاتون کا تعلق بنو ہلال سے ہے۔ سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے بیٹوں کو بلوا کر پوچھا: ''کیا تم میں سے کوئی شادی کرنا چاہتا ہے؟'' کیونکہ فلاں لڑکی سے بہتر اس وقت میرے ذہن میں کوئی اور لڑکی نہیں۔ دوسرے لڑکوں نے کہا کہ ہماری تو پہلے بیویاں موجود ہیں، لہٰذا ہم تو شادی نہیں کر سکتے، البتہ آپ کے صاحبزادے عاصمؓ نے کہا: ''ابا جان! میری چونکہ بیوی نہیں لہٰذا آپ میری شادی اس دوشیزہ سے کرا دیں۔'' آپ نے فرمایا: ''بیٹا، جاؤ اور اسے نکاح کا پیغام دو کیونکہ وہ اس لائق ہے کہ اس سے ایک ایسا بچہ پیدا ہو جو مشہور بھی ہو اور عرب کا سردار بننے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ چنانچہ سیدنا عاصمؓ وہاں گئے۔ اور اس دوشیزہ سے نکاح کر لیا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم: ص ۱۷، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ص ۹۵، صفۃ الصفوۃ: جلد ۲ ص ۱۱۴)

وہ لڑکی بنی ہلال میں سے تھی۔ خاوند کی نہایت وفا شعار اور اطاعت گذار بیوی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے ایک لڑکی عطا فرمائی جس کا نام ''ام عاصم'' رکھا گیا۔ وہ بچی نہایت ہونہار تھی۔ ماں باپ نے اپنی ساری ذہانت اور اپنی ساری خوبیاں اس میں سمو دیں۔ اپنی والدہ کی طرح ام عاصم تقویٰ و طہارت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ اسی ام عاصم سے سیدنا مروانؒ کے بیٹے عبدالعزیزؒ کی شادی ہوئی اور اسی سے عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا خلیفہ راشد پیدا ہوا۔

* * *

﴿پانچ چیزوں کو پانچ جگہ پایا﴾

حضرت شقیق بلخیؒ (م ۱۷۵ھ) اپنے زمانہ کے کبار اولیاء میں سے تھے۔ نہایت متوکل اور صوفی بزرگ تھے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے پانچ چیزوں کو تلاش کر کے پانچ جگہ پایا:

(۱) روزی کی برکت چاشت کی نماز میں ملی۔
(۲) قبر کی روشنی تہجد کی نماز میں ملی۔
(۳) منکر نکیر کے سوالوں کا جواب قرأت قرآن حکیم میں ملا۔
(۴) پل صراط کی سہولت سے پار کرنا روزہ اور صدقہ میں پایا۔
(۵) اور عرش کا سایہ خلوت میں پایا۔ (فضائل نماز: ص ۲۲، مولانا زکریا صاحبؒ)

* * *

فاضلین دیوبند پر سو سال میں اوسط اخراجات:

دارالعلوم دیوبند اسلامی دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے جس نے بڑے بڑے محدث، فقہاء، مفسر، سیاست دان، ادیب، علم فلسفہ اور منطق کے ماہرین پیدا کیے ہیں۔ جن میں چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ
(۲) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
(۳) امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ
(۴) شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
(۵) فقیہہ الامت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ
(۶) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ
(۷) ابوحنیفۂ وقت مفتی کفایت اللہؒ
(۸) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ
(۹) شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ
(۱۰) استاذ الکل مولانا رسول خان صاحبؒ
(۱۱) حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ
(۱۲) حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ
(۱۳) حضرت مفتی فیض اللہ صاحب چاٹگامیؒ
(۱۴) حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری
(۱۵) حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ
(۱۶) حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ
(۱۷) حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ
(۱۸) حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
(۱۹) حضرت مولانا بدر عالم صاحب مدنیؒ
(۲۰) حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
(۲۱) حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ
(۲۲) حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ
(۲۳) حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ
(۲۴) حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزارویؒ
(۲۵) حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ
(۲۶) حضرت مولانا میرک شاہ صاحب اندرابی
(۲۷) حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ
(۲۸) حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ

اس قسم کے سینکڑوں کیا ہزاروں نابغہ روزگار اور جہابذہ علم اس مدرسے سے نکلے جن کے علم و عمل نے ایک عالم کو متاثر کیا۔ لیکن ان پر دارالعلوم دیوبند کا کیا کچھ خرچ ہوا؟ اس کے بارہ میں مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے ایک کتابچہ میں جو "تاریخ دارالعلوم دیوبند" کے نام سے طبع ہوا ہے، لکھا ہے:

> "سو برس میں جن طلبہ نے دارالعلوم سے استفادہ کیا اور جن کے تعلیمی اخراجات دارالعلوم نے برداشت کیے، ان کی مجموعی تعداد ۶۵۷۴۷ ہے، اور جنہوں نے تعلیم مکمل کر کے سند حاصل کی ان کی تعداد ۷۴۱۷ ہے۔ اور تعمیرات کے مصارف کو چھوڑ کر سو برس میں دارالعلوم کا کل صرف ستانوے لاکھ چھیالیس ہزار پچاس روپے تیرہ آنہ نو پائی ہے۔ اب اگر اس صرف کو ۶۵۷۴۷ طلبہ پر تقسیم کیا جائے تو ایک طالب علم پر خرچ کی مقدار کل ۱۴۹ روپے ہوتی ہے۔ اور اگر اس پورے صرف کو ۷۴۱۷ فضلاء کرام پر تقسیم کیا جائے تو ایک مکمل عالم تیار کرنے پر خرچ کی مقدار کل ۱۳۱۴ روپے بنتی ہے۔"
>
> (تاریخ دارالعلوم دیوبند: ص ۹۰)

آج دنیا میں کوئی ایسا ادارہ دارالعلوم کے مقابلہ میں ہے جو اس کفایت شعاری اور حسن انتظام کے ساتھ خرچ کر کے اس قدر قابل علماء پیدا کر سکے۔ آج ہماری یونیورسٹیوں کے کروڑوں اربوں خرچ ہو رہے ہیں لیکن کوئی ان حضرات کی ٹکر کا آدمی پیدا نہیں کیا جا سکا۔ علامہ اقبالؒ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کے بارہ میں فرمایا کرتے تھے کہ اسلام کی گذشتہ پانچ صدیوں میں اس مرتبہ کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔

آج انہی مدرسوں پر پاکستان میں مختلف قسم کی پابندیاں لگائی جا رہی ہیں اور صدر بش کے بیان کے مطابق اسلامی علوم کو مالی امداد اور رجسٹریشن کے بہانوں سے تبدیل کیا جا رہا ہے ؂

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

* * *

جاہلیت جدیدہ

ایک تو وہ جاہلیت تھی جو سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت سے قبل تمام دنیا میں بالعموم اور عرب میں بالخصوص پھیلی ہوئی تھی، اور تاریخ میں اس عہد کو "جاہلیت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جاہلیت عمدہ کھانوں، عالی شان محلات، فرنشڈ کمروں اور زرق برق لباس کے نہ ہونے کا نام نہیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی جاہلیت ہو سکتی ہے۔ اگر انسانوں میں اخلاقی اقدار کا فقدان ہو، انسانیت اخلاق کی بلندی اور شرافت کا نام ہے۔ سر بفلک محلات، عمدہ بنگلوں، لمبی لمبی کاروں، مرغن غذاؤں، چست لباسوں کا نام تہذیب نہیں۔ جاہلیت جدیدہ کی ایک مثال یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں ۸۱ جنگیں لڑیں جن میں ۲۷ میں آپ ﷺ خود شریک ہوئے۔ ان تمام غزوات میں (یعنی ۸۱ غزوات میں) کل ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے جن میں ۲۵۹ مسلمان اور باقی ۷۵۹ غیر مسلم تھے، لیکن دور حاضر میں دو جنگوں میں جو لوگ مارے گئے ان کی تعداد ۴ کروڑ کے قریب ہے۔ پہلی جنگ صرف چار سال رہی۔ اس میں مندرجہ ذیل ملکوں کے جو آدمی مارے گئے اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱)	روس	۷ لاکھ
(۲)	جرمنی	۱۶ لاکھ
(۳)	فرانس	۱۳ لاکھ ستر ہزار
(۴)	اٹلی	۴ لاکھ ساٹھ ہزار
(۵)	آسٹریلیا	۸ لاکھ
(۶)	برطانیہ	۷ لاکھ
(۷)	ترکی	۲ لاکھ ۵۰ ہزار
(۸)	بلجیئم	ایک لاکھ دو ہزار

(۹)	بلغاریہ	ایک لاکھ
(۱۰)	رومانیہ	ایک لاکھ
(۱۱)	سربیا مانٹی نیگرو	ایک لاکھ
(۱۲)	امریکہ	پچاس ہزار

دوسری جنگ عظیم میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کچھ یوں ہے:

(۱)	روس	دو کروڑ ۱۰ لاکھ
(۲)	جرمنی	ساٹھ لاکھ سے سوا کروڑ تک
(۳)	پولینڈ	۹ لاکھ
(۴)	چین	تیس لاکھ
(۵)	جاپان	۲۷ لاکھ سے ۶۰ لاکھ تک
(۶)	آسٹریلیا	۷ لاکھ
(۷)	رومانیہ	۷ لاکھ
(۸)	فن لینڈ	ایک لاکھ ۸۳ ہزار ایک سو چھیاسٹھ
(۹)	چیکوسلاوکیہ	۲۰ ہزار
(۱۰)	زیکوسلاوکیہ	تیس لاکھ ۵۰ ہزار
(۱۱)	امریکہ	۲۰ لاکھ ستر ہزار
(۱۲)	برطانیہ (برٹش ایمپائر)	۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار
(۱۳)	فرانس	۱۰ لاکھ
(۱۴)	اٹلی	۱۱ لاکھ
(۱۵)	یوگوسلاویہ	۱۲ لاکھ پچاس ہزار
(۱۶)	ہنگری	۲ لاکھ
(۱۷)	ہالینڈ	۳ لاکھ ۵۷ ہزار
(۱۸)	بلجیم	۲۰ لاکھ
(۱۹)	فلپائن	۳۰ لاکھ

ان اعداد وشمار میں قیدیوں اور زخمیوں کی تعداد شامل نہیں اور نہ ہی ہندوستان اور کالونیوں کے لوگ شامل ہیں جنہوں نے اپنے اپنے ملکوں کی طرف سے محاذ جنگ پر اپنی جانیں قربان کیں۔ (اخبار کوثر ۵ ستمبر ۱۹۳۵ء)

اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ نے ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں دنیا میں ایک غیر خونی انقلاب برپا کر دیا جب کہ موجودہ جاہلیت کے دور میں چار کروڑ انسانوں کو قتل کر کے بھی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا بلکہ ایک بے مقصد جنگ ہوتی رہی جو کہ جاہلیت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

* * *

﴿قرآن حکیم کی دس سورتیں دس چیزوں سے بچاتی ہیں﴾

قرآن حکیم ویسے تو سراپا رحمت اور جسمانی اور روحانی بیماریوں کے لیے شفا کا باعث ہے لیکن اس کی ہر آیت اور ہر سورت کے الگ الگ خواص اور علیحدہ علیحدہ اثرات ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) نے قرآن حکیم کی دس سورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ یہ دس چیزوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں:

﴿عشرة اشياء تمنع عشرة اشياء: الفاتحة تمنع غضب الرب، يسين تمنع عطش القيامة، الدخان تمنع من احوال القيامة، الواقعة تمنع الفقر والفاقة، الملك تمنع عذاب القبر، الكوثر تمنع خصومة الخصماء، الكافرون تمنع الكفر عندالنزع، الاخلاص تمنع النفاق، الفلق تمنع حسد الحاسدين، والناس تمنع الوسواس. (الكنز المدفون، ص ۲۸)

دس سورتیں دس چیزوں سے بچاتی اور محفوظ رکھتی ہیں:

(۱) سورۃ الفاتحہ: اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچاتی ہے۔
(۲) سورۃ یسین: قیامت کے روز پیاس سے بچائے گی۔
(۳) سورۃ دخان: قیامت کے روز اس کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھے گی۔
(۴) سورۃ واقعہ: فقر و فاقہ سے بچاتی ہے۔
(۵) سورۃ الملک: عذاب قبر سے محفوظ رکھتی ہے۔
(۶) سورۃ الکوثر: دشمنوں کی دشمنی سے محفوظ و مصئون رکھتی ہے۔
(۷) سورۃ الکافرون: نزع یعنی جان کنی کے وقت کفر سے بچاتی ہے۔
(۸) سورۃ اخلاص: نفاق سے محفوظ رکھتی ہے۔
(۹) سورۃ الفلق: حاسدوں کے حسد سے بچاتی ہے۔
(۱۰) سورۃ الناس: انسانوں کو مختلف قسم کے وسوسوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

﴿ایک عجیب رات﴾

بعض راتیں کچھ عجیب ہوتی ہیں۔ امام سیوطیؒ نے اپنی تاریخ میں اسی طرح کی ایک عجیب رات کے بارہ میں لکھا ہے کہ دنیا میں ایک ایسی رات بھی گذری ہے جس میں ایک خلیفہ کا انتقال ہوا، دوسرا اس کی جگہ تخت نشین ہوا اور تیسرا خلیفہ پیدا ہوا یہ سب کچھ ایک ہی رات بلکہ ایک ہی خاندان میں ہوا۔

(۱) مرنے والا خلیفہ مہدی کا بیٹا ہادی ہے۔

(۲) تخت نشین ہونے والا ہادی کا بھائی ہارون الرشید تھا۔

(۳) اور پیدا ہونے والا خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا مامون الرشید تھا۔

(تاریخ الخلفاء۔ ص۲۸۳)

……

گنجِ شائگاں

سرکارِ دو عالم ﷺ کی چالیس احادیث یاد کرنا بڑا باعثِ اجر و ثواب ہے۔ چنانچہ مختلف محدثین نے ۴۰ احادیث جمع کی ہیں۔ مولانا جامیؒ نے بھی اسی خیال کے پیشِ نظر چالیس احادیث کا منظوم ترجمہ اربعین جامی کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ حضرت مولانا ظفر علی خانؒ نے انہی احادیث کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے۔ وہ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کے اخبار ''زمیندار'' میں شائع ہوا۔ وہ گنجِ شائگاں تبرکاً و تیمناً ہدیہ قارئین ہے۔

(۱) لایؤمن احدکم حتی لایحب لاخیہ مایحب لنفسہ

مسلمانوں اسی صورت میں تم ہو اہلِ ایمان سے
کہ جو الفت ہے اپنے نفس سے اپنے اخواں سے

(۲) من اعطیٰ للہ ومنع للہ واحب للہ وابغض للہ فقد استکمل ایمانہ

عطاء و منع و حب و بغض میں جو اللہ والے ہیں
وہی ایمان میں کامل اور سیدھی راہ والے ہیں

(۳) المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ

ترا قول اور فعل ایذا نہ دیتا ہو جو مسلم کو
تو اے مسلم! پہنچ جاتا ہے تو اسلام کی لم کو

(۴) خصلتان لا یجتمعان فی مؤمن البخل وسوء الخلق

سرشتِ اسلام کی ہے مانعِ بخل و بد خلاقی
نو آتش میں ہمیشہ سے چلی آتی ہے ناچاقی

(۵) یشیب ابن آدم وتشب فیہ خصلتان، الحرص وطول الامل

ہوا و حرص ہے وجہ تمہاری زندگانی کا
بڑھاپے پر اسی سے رنگ چڑھتا ہے جوانی کا

(۶) **من لم يشكر الناس لم يشكر الله**

وہ انساں جو نہیں منت پذیر انساں کے احساں کا
اور حق اس سے ہو سکتا نہیں ہے شکر یزداں کا

(۷) **من لا يرحم الناس لم يرحمه الله**

نہ آیا رحم جس کو بے کسوں اور ناتوانوں پر
لگائی مہر اس نے حق کی رحمت کے خزانوں پر

(۸) **الدنيا ملعونة وملعون مافيها الا ذكر الله تعالیٰ**

یہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے لعنت کے قابل ہے
مگر جس کو خدا یاد آئے وہ رحمت کے قابل ہے

(۹) **ذم على الطهارة يوسع عنيک الرزق**

اگر آلودہ داماں کو طہارت سے گزارش ہو
تو دن تنگی کے سب کٹ جائیں روزی میں کشائش ہو

(۱۰) **لا يلدغ المؤمن من جحر واحد مرتين**

گزند نیش عقرب کا مزہ عاقل نہیں چکھتا
اسی سوراخ پہ انگلی مسلماں پھر نہیں رکھتا

(۱۱) **الوعدة دين**

کسی سے وعدہ کرتے ہو تو لازم ہے وفا کرنا
کہ یہ اک قرض ہے اور قرض ہے اس کا ادا کرنا

(۱۲) **المجالس بالامانة**

کسی محفل میں شامل ہو تو اس نکتہ پہ عامل ہو
کہ راز اس کی امانت ہے جسے تم جس کے حامل ہو

(۱۳) **المستشار مؤتمن**

کسی کو مشورہ دے کر وہی کچھ راز دیں سمجھے
جو اپنے آپ کو اس کے مصالح کا امیں سمجھے

(١٤) **السماح رباح**

یقینی نفع ہے جس میں سخاوت وہ تجارت ہے
خدا کی راہ میں دینا نہیں جاتا اکارت ہے

(١٥) **الدین شین الدین**

نہ ڈالو اے مسلمانو! گلے میں قرض کا پھندا
مہاجن کی کرے کیوں بندگی اللہ کا بندہ

(١٦) **القناعة مال لا تنفد**

گھٹانے سے نہیں گھٹتا قناعت مال ہے ایسا
بے رونق اس سے گوہر کی چھپا یہ لال ہے زیبا

(١٧) **نوم الصبحة تمنع الرزق**

چڑھے دن تک پڑے لیتے ہیں خراٹے جو بستر پر
نہیں رہتا کوئی حق ان کی روزی کا مقدر پر

(١٨) **آفة السماح المنّ**

کسی پر گر کرو احسان نہ لو بھولے سے نام اس کا
سخاوت کا یہ ہے سود اور لینا ہے حرام اس کا

(١٩) **السعید من وعظ بغیرہ**

سعادت اس نے کی ہے ایزد متعال سے حاصل
ہوئی ہے جس کو عبرت دوسروں کے حال سے حاصل

(٢٠) **کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع**

زباں سے کان کی گر پردہ داری ہو نہیں سکتی
بڑی اس سے کوئی لغزش تمہاری ہو نہیں سکتی

(٢١) **کفی بالموت واعظاً**

اجل سے بڑھ کر واعظ کیا کریں گے تلخ آموزی
جو کرنی ہے تو کر لو موت ہی سے عبرت آموزی

(٢٢) **خیر الناس انفعهم للناس**

کوئی انساں اس انسان کے درجہ کو نہیں پہنچا
کہ اس کی ذات سے لوگوں کو نفع بہتریں پہنچا

(٢٣) **انّ اللّٰہ یحب السّہل الطلق**

خدا رکھتا ہے اس کو دوست جو ہنس مکھ اور خوش خو ہو
شگفتہ جس کی فطرت ہو کشادہ جس کا ابرو ہو

(٢٤) **تہادوا تحابوا**

محبت ہدیہ و سوغات دے کر بڑھ ہی جاتی ہے
جو سیلاب آئے ندی میں تو آخر چڑھ ہی جاتی ہے

(٢٥) **اطلبوا الخیر عند حسان الوجوہ**

ہے جس کی صورت اچھی اس سے کرتا ہے سوال اچھا
کہ حال ہے جس کا غالباً اس کا ہے قال اچھا

(٢٦) **زرغباً تزدد حباً**

ملاقاتوں میں لطف آتا ہے کچھ مدت کی دوری سے
گھٹاتے کیوں ہو اس کو رات اور دن کی حضوری سے

(٢٧) **طوبیٰ لمن شغله عیبُه عن عیوب النّاس**

مبارک وہ ہیں جو عیب اپنے رکھتے ہیں نگاہوں میں
نظر جن کی نہیں الجھی ہے غیروں کے گناہوں میں

(٢٨) **الغنی الیاس مما فی ایدی النّاس**

اگر کرتا ہے نکتہ بے نیازی کا تجھے ازبر
تو جو کچھ دوسروں کا ہے نہ رکھ ہرگز نظر اس پہ

(٢٩) **من حُسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه**

عیاں ہو جائے گا اسلام کی خوبی کا راز اس سے
کہ جو کچھ بے ضرورت ہو بجا ہے احتراز اس سے

(۳۰) **لیس الشدید بالصرعة انما الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب**

صفوں کو تم نے الٹا پہلوانوں کو پچھاڑا بھی
مگر غصہ میں دیو نفس کا لشکر اکھاڑا بھی؟

(۳۱) **لیس الغنی عن کثرة العرض انما الغنی غنی النفس**

غنی اس کو نہ سمجھو جس کے گھر میں نقرہ و زر ہو
غنی اس شخص کو کہتے ہیں جو دل کا تونگر ہو

(۳۲) **الحزم سُوءُ الظَن**

اگر ہو تو یہی محتاط ہونے کی نشانی ہو
کہ اپنے اوپر انساں کو ہمیشہ بدگمانی ہو

(۳۳) **العلم لا یحدُّ عنه صدٌّ**

ہر اک انسان کو حق ہے علم کی دولت سے ہو فائز
کسی کو روکنا اس سے نہیں اسلام میں جائز

(۳۴) **الکلمة الطیبة للسائل صدقه**

اگر خالی ہو جیب اور مرتبہ سائل کا پہچانو
تو میٹھی بات کو خیرات کا نعم البدل جانو

(۳۵) **کثرة الضحک تمیت القلب**

ہنسو لیکن نہ اتنا جس سے دل پژمردہ ہو جائے
طبیعت ہو متعفن اور مذاق افسردہ ہو جائے

(۳۶) **الجنة تحت اقدام الامهات**

زمیں پھیلی ہوئی جس طرح افلاک کے نیچے
یونہی جنت بھی ہے ماں کے قدم کی خاک کے نیچے

(۳۷) **البلاء موکل بالمنطق**

زباں اس کو نہ سمجھو ہے یہ اک آفت کا پرکالہ
نہ رکھو گے جو قابو میں تو کر دے گی تہ و بالا

(۳۸) النظرۃ سھم مسموم من سھام ابلیس

نظر کا تیر نامحرم پہ جب تم نے چلایا ہے
اُسے ابلیس نے زہر ہلاہل میں بجھایا ہے

(۳۹) لا یشبع المؤمن دون جارہ

نہیں ہے شائبہ تک اس میں اے مسلم تیری خو کا
کہ خود تو پیٹ بھر کے کھائے ہمسایہ رہے بھوکا

(۴۰) لُعن عبدالدینار ولعن عبدالدرھم

جہاں میں جس قدر ہیں درہم و دینار کے بندے
ہیں ان کے واسطے پھیلے ہوئے پھٹکار کے پھندے

……

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ہندو شعراء کا نذرانہ عقیدت

سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیات کی یہ خصوصیت ہے کہ نہ صرف اپنوں نے بلکہ غیروں نے بھی آپ کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ عیسائی بھی، سکھ بھی اور ہندو بھی سبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح خواں ہیں۔ ذیل میں چند ہندو شعرا کی نعتیں پیش کی جاتی ہیں جو انہوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہی ہیں۔

﴿مرحبا سید مکی مدنی العربی﴾

از افکار گوہر بار مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ، سابق مدار المہام ریاست حیدرآباد دکن

پرتو ذاتِ احد جلوۂ سرِّ عجمی   روشِ مہر حقیقت توچہ عالی نسبی
چہ کنم وصفِ تو اے ہاشمی و مطلبی   مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
از وجود تو شدہ جامۂ احرام عدم   چشمہائے تو نمودہ اثر لا و نعم
از خرام تو بود رونق گلزار ارم   من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی
دردِ عشق تو بدل باد مرا اے دلبر   باد سودائے از آں زلف معنبر برسر
باد تصویر تو در دیدہ مرا شام و سحر   چشم رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی
گرچہ گویند براقت زسر خاک گزشت   کس نداند مگر از دانش و ادراک گزشت

وہ چہ در چشم زدن صاحب دل کے گزشت   شبِ معراج عروج تو ز افلاک گزشت
بمقامے کہ رسیدی نرسد ہیچ نبی
جلوۂ حق چو شدی اے شہ والا درجات   گشت پیوستہ یکے آئینۂ ذات و صفات
حبذا برزخ کبریٰ سکون و حرکات   ماہمہ تشنہ لبانیم توئی آب حیات
رحم فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی
ساقی کوثر و تسنیم عطا کن یک جام   تا بمانم ز مے عشق تو سرمست مدام
حسرتِ لذتِ آزار شود نیک انجام   نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی
کیمیا ہست حیات تو بنی آدم را   زندگی ہست ثبات تو بنی آدم را
حق کجا داد صفات تو بنی آدم را   نسبتے نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی
شد ز اوصاف تو تحریر ازیں رو قلم   بے گل مدح تو چوں غنچہ فسردہ است دلم
اللہ اللہ کجائی و کجا آب و گلم   نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی
چشم بد دور ز رویت شدہ عالم پرنور   ہست مشتاق جمال تو چہ انسان و چہ حور
بر فلک عیسیٰ و موسیٰ بہ تمنا سر طور   ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبان عربی
پئے مطلب جان و دل عشاق توئی   خاک راہ تو شوم ہست تمنائے دلی
شاد ہر وقت کند ذکر تو بگوش قدسی   سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

……

محمد صلی اللہ علیہ وسلم عربی کے احسانات

از لالہ دھرم پال گپتا وفا، مدیر روزنامہ تیج، دہلی

چھڑا کے بت کی پرستش سکھائی تھی وحدت میرے خیال کی ترویج عام ہو جائے
سیاسیات سے مذہب ملا دیا تو نے کہ دین و دنیا کا سب انتظام ہو جائے
رفاہِ عام ہی تیرا تھا جب کہ نصب العین لقب نہ کیوں تیرا خیر الانام ہو جائے
وفا جہاں میں وہ عالی مقام ہوتا ہے
عطاء جسے مے عرفان ہو جائے

……

محبوب اپنا کر لیا پروردگار نے

از چودھری دتو رام کوثری، ساکن نانڈری ضلع حصار

جس دم دبایا مجھ کو گناہوں کے بار نے میں شافع جزا کو لگا پھر پکارنے
حضرت نے آ کے مجھ کو سبکدوش کر دیا رحمت بڑی کی شافع روز شمار نے
دیکھا بنا کے جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و نور محبوب اپنا کر لیا پروردگار نے
ہے نام دتو رام تخلص ہے کوثری
دیر و حرم کی سیر کی اس خاکسار نے

……

دنیا کو تم نے آ کر پُرنور کر دیا ہے

از شیام سندر، سندر، ایڈیٹر پارس۔ لاہور

دنیا کو تم نے آ کر پُرنور کر دیا ہے اور ظلمتوں کو یکسر کافور کر دیا ہے
پیغام حق سنا کر مسرور کر دیا ہے وحدت کی مے پلا کر مخمور کر دیا ہے
اک بار تو دیارِ یثرب کو دیکھ لیتا پابندیٔ جہاں نے مجبور کر دیا ہے
سندر سے کیا رقم ہو وہ شان ہے تمہاری
جس نے گداگروں کو فغفور کر دیا ہے

روشن دلم ز جلوۂ روئے محمد ﷺ است

از شکر اللہ۔ ساقی

روشن دلم ز جلوۂ روئے محمد ﷺ است   جانم فدائے نام نکوئے محمد ﷺ است
یادِ خدا است ہمدم روحِ لطیفِ من   دل در خیالِ مدحتِ خوئے محمد ﷺ است
ایں بوئے خوش کہ مشک ختن یافت در جہاں   بے شبہ از عطیۂ موئے محمد ﷺ است
در دیدہ ہم قبول تواں شد نمازِ من   گر روئے دل ز صدق بسوئے محمد ﷺ است

ساقی اگرچہ جملۂ ہند است بر تنم
خاکم مگر ز یثرب و کوئے محمد ﷺ است

……

آیاتِ قرآنی کے
شانِ نزول

اردو ترجمہ
اسباب النزول

مؤلف
ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیسابوری [illegible]

ترجمہ و تحقیق
مولانا خالد محمود صاحب

بیت العلوم
۲۰- نابھہ روڈ، چوک پرانی انارکلی، لاہور۔ فون [illegible]

آنحضرت ﷺ کے بیان فرمودہ

سبق آموز واقعات

احادیث صحیحہ سے منتخب کردہ دلچسپ قصوں کا حسین مجموعہ

اردو ترجمہ
القصص الصحیح فی السنۃ النبوی

مصنف
طلعت عفیفی محمد سالم

مترجم
ابن سرور محمد اویس

بیت العلوم
۲۰- نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور